علم وادب کا معیار

سوچ

سہ ماہی

مدیر: تسلیم احمد تصور
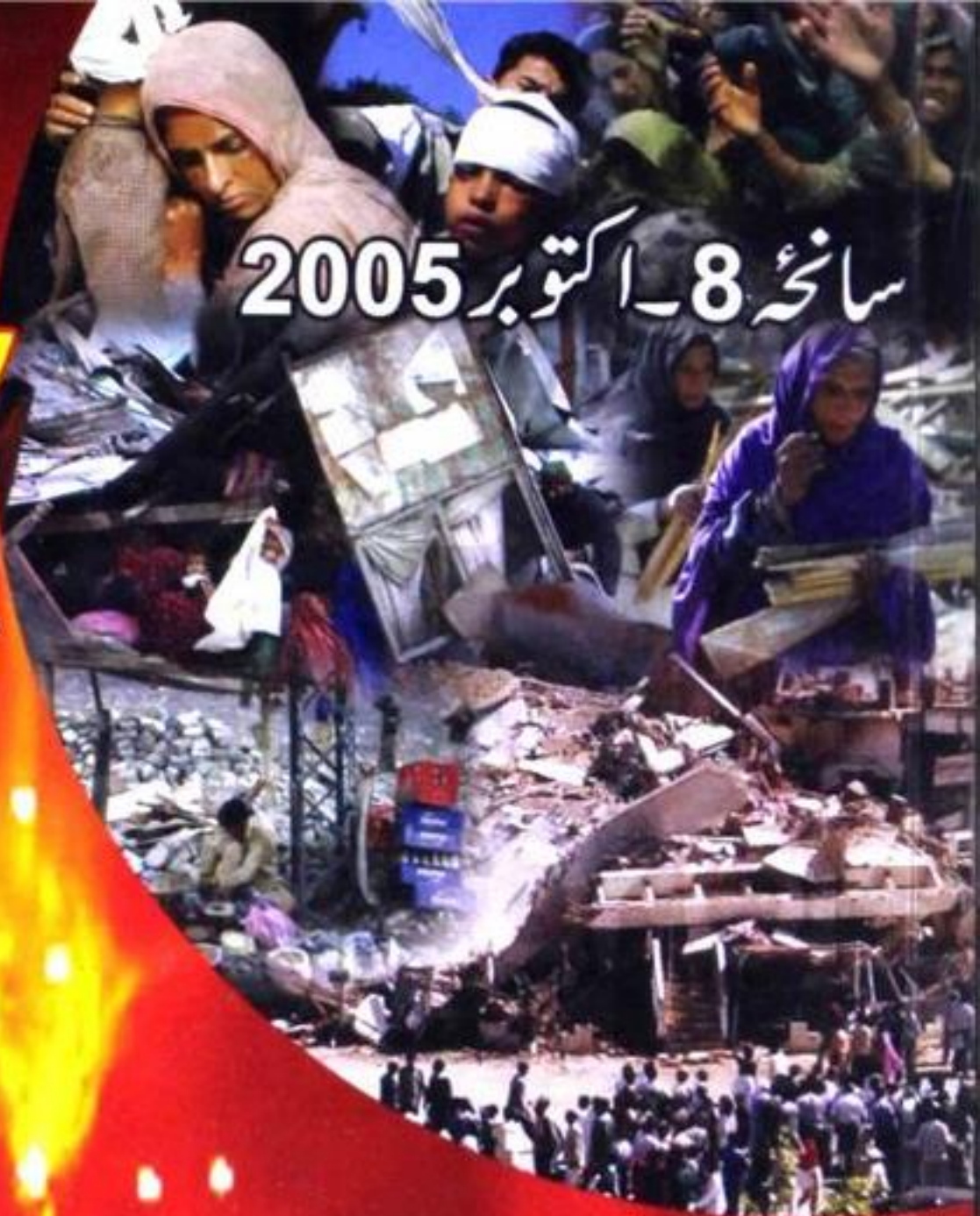
غالب اور میں —— محمد حنیف رامے

میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں؟

— رشید امجد

خالد اقبال یاسر کی طویل ترین نظم

فنِ خطاطی کی مختصر تاریخ — ظفر علی راجا کے قلم سے

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے ایک یادگار انٹرویو

غیر ملکی شعری ادب سے اسلم کولسری کا انتخاب
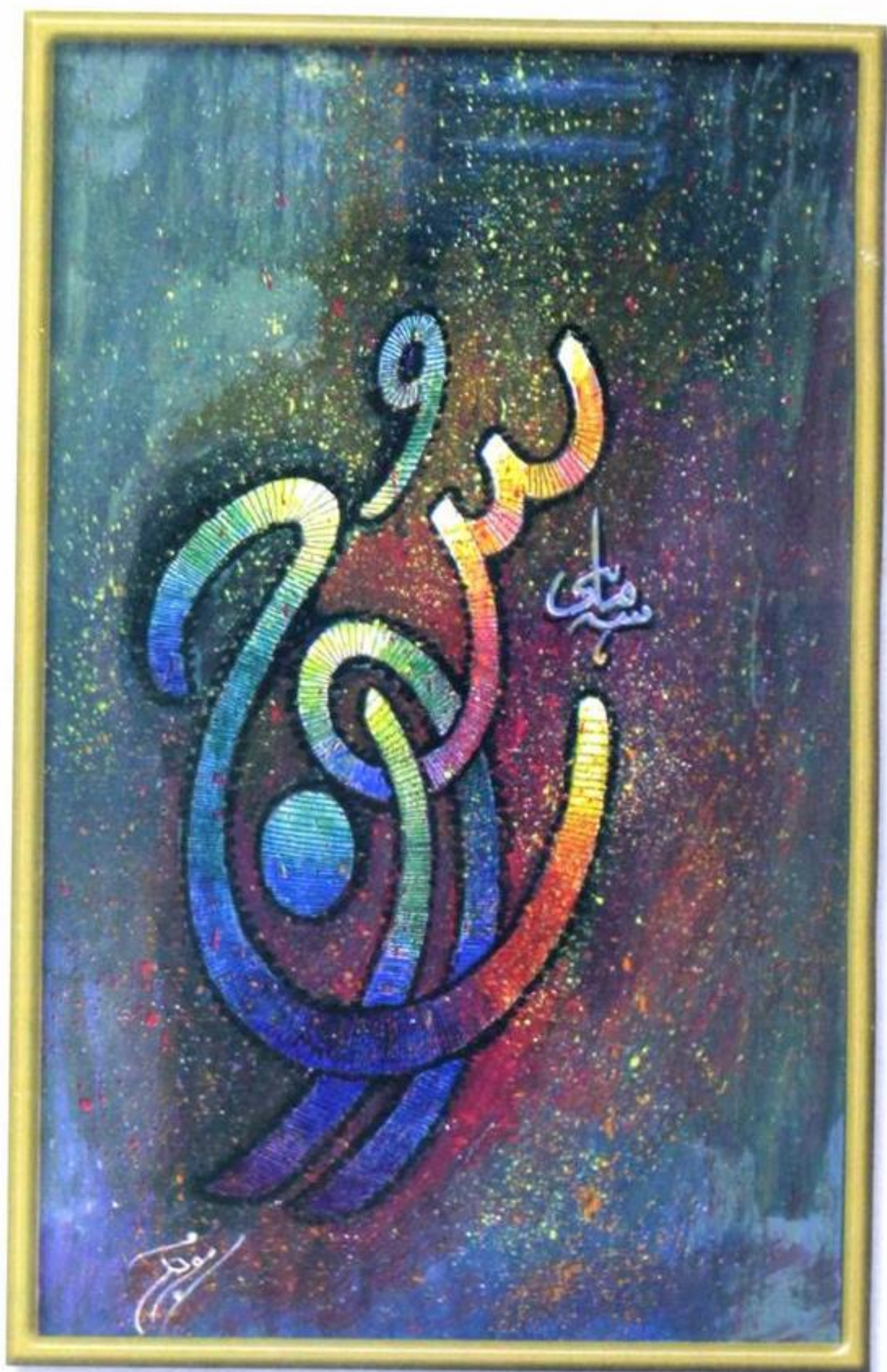
مصورانہ خطاطی میں منفرد اسلوب کے موجد معروف مصور بشیر موجد کا ایک فن پارہ

جنوری تا مارچ 2006ء
جلد 34 شمارہ 3

علم وادب کا معیار

سہ ماہی

Quarterly
SURAJ
Lahore

مدیر:
تسلیم احمد تصور

Designed by:
SUMMIT INTERNATIONAL

قیمت 200 روپے

خط و کتابت کیلئے:
6/A، نصیر الدین روڈ، اسلام پورہ، لاہور۔ فون: 7226970
E-mail: surajquarterly@yahoo.com
رابطے کیلئے:
میاں چیمبرز 3۔ ٹمپل روڈ، لاہور۔ فون: 6280305

فردوسِ گوش ہو گئی آوازِ اہلِ دل
زینت ہماری بزم کی اردو زباں سے ہے

دسواں عالمی

فروغ اردو ادب ایوارڈ ۲۰۰۵ء

بہ اعزاز

محترمہ ہاجرہ مسرور
(پاکستان)

جناب قاضی عبدالستار
(بھارت)

مجلس فروغِ اردو ادب دوحہ۔ دوبئ

P.O. BOX - 40689 - DOHA - QATAR

بیرونِ ملک خصوصی نمائندے:

برطانیہ: .... شکیل احمد چوہان

70 IIIford Lane, IIIford-Essex, IGI 2LA

Tel: +44(0)20 8478 3500, Fax +44(0)20 8252 1727

Email: info@adornadvertising.co.uk

ناروے: .... جمشید مسرور

Norges Forskningsrad/ The Research Council of Norway

Tel: (+47) 2203 7062, Switchboard: (+47) 2203 7000, Fax: (+47) 2203 7001

E-mailL jamshedmasroor@hotmail.com

کینیڈا: .... مصدق حسین اسد

5645 LAVOISIER SAINT LEONARD MONTERYAR

QUEBEC CANADA HIRIJ8

کویت: .... نوازش علی

Post Box # 51430, Postal Code: 53455, RIKKA, KUWAIT

E-mail: alisalmiya@hotmail.com

متحدہ عرب امارات: .... ضیاء اکرام

Maxwell General Trading (L.L.C), Post Box # 13578,

Ajman, U.A.E.

رابطہ دفتر:

غالب میموریل ٹرسٹ اور سہ ماہی ''سورج'' کے رابطہ دفتر کا پتہ نوٹ فرمایئے:

میاں چیمبرز، ۳-ٹمپل روڈ، لاہور۔ فون: ۶۲۸۰۳۰۵

خط و کتابت کے لیے:

۶-اے، نصیر الدین روڈ، اسلام پورہ لاہور۔ فون: ۷۲۲۶۹۷۰

ناشر تسلیم احمد پرنٹر طاہر حسین نے معراج پرنٹرز اردو بازار لاہور سے چھپوا کر 6/A نصیر الدین روڈ، اسلام پورہ، لاہور سے شائع کیا۔

کرنیں

سانحۂ ۸ - اکتوبر

تحقیق و تنقید

داستان طرازی

نوائے سروش

غزلیات

غیر ملکی شعری ادب

خصوصی پیشکش

ایوان غالب

کرن کرن اجالا

لون کسٹمرز.....

پہلی کرن

۸-اکتوبر کی صبح ــــــ ایک قیامت صغریٰ تھی جو پل بھر میں ہنستی کھیلتی بستیوں کو برباد کر گئی۔ انسانی بے بسی اور بے کسی کے ایسے ایسے دل خراش مناظر تھے کہ آنکھیں دھندلا کر رہ گئیں۔

اس صدمۂ جانکاہ سے بے حال قوم کے زخم زخم احساسات کو شاعروں نے الفاظ کا روپ دیا۔ ایسی ہی چند خوں رُلاتی نظموں کو زیرِ نظر شمارے کے ابتدائی اوراق میں جگہ دی گئی ہے۔

فنِ خطاطی کے موضوع پر معروف قلم کار ظفر علی راجا کا تحقیقی مقالہ بھی شاملِ اشاعت ہے۔ دیکھیے تو سہی تحقیق کے کون کون سے در وا ہوئے ہیں اور خطاطی کے کیسے کیسے فن پاروں سے صفحات کو مزین کیا گیا ہے۔

داستان طرازی کے عنوان سے آپ اس مرتبہ بھی افسانے کی دنیا کے نمایاں لکھنے والوں کو پڑھ سکیں گے۔ ہم نے ڈاکٹر رشید امجد سے پوچھا تھا کہ وہ افسانہ کیونکر لکھتے ہیں؟ جواب میں موصول ہونے والی اُن کی گرانقدر تحریر بھی نذرِ قارئین ہے۔ ایک اور سوال تھا۔ "کیا نثر لکھنا شاعری سے زیادہ مشکل کام ہے؟" شہزاد احمد کا جواب اور اُن کی تحریر کا عکس بھی اسی شمارے کا حصہ ہے۔

ممتاز شاعر خالد اقبال یاسر اور اسلم کولسری ہمارے عزیز دوست ہیں۔ اُن کی دھج ہی نرالی ہے۔ یاسر اپنی طویل ترین نظم لائے ہیں ایسی خوبصورت نظم کہ پڑھیے اور سر دُھنیے، جبکہ کولسری نے بدیسی زبان کی درجن بھر نظموں کو بڑے سلیقے سے اردو لباس دے دیا ہے۔ شاد آباد رہو میرے دوستو! ــــــ

اور ہاں ــــــ اب کے امجد اسلام امجد کا بھی ورودِ مسعود ہوا ہے۔ زہے نصیب! امجد کے مخصوص انداز کی یہ نمائندہ غزل ہماری ثقافتی روایت سے

پختگی بھی رکھتی ہے۔ اور اس میں جدید تر رجحانات بھی عکس ریز دکھائی دیتے ہیں ہم امجد اسلام امجد کو 'سورج' کے صفحات پر خوش آمدید کہتے ہیں۔ بیرون ملک سے معروف اہل قلم ڈاکٹر کیول دھیر، مقصود الٰہی شیخ، ترنم ریاض، سیفی سرونجی اور عازم گروندر سنگھ کوہلی کی خوبصورت تخلیقات بھی آپ کے ذوق مطالعہ کی نذر ہیں۔

اب ذکر ہو جائے —— اردو زبان و ادب کی دنیا کے ممتاز ترین نام پروفیسر گوپی چند نارنگ کا —— پروفیسر صاحب سے ہماری کبھی بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی۔ 'شعر و حکمت' میں ان کا انٹرویو نظر سے گزرا، پڑھا، ایسی اُجلی اُجلی، نکھری نکھری شخصیت یوں لگا، جیسے برسوں سے جان پہچان ہو، جی چاہا یہ یادگار انٹرویو آپ بھی پڑھیں۔ انٹرویو اگلے صفحات پر موجود ہے۔

ایوان غالب میں شہرہ آفاق مصور و دانشور محمد حنیف رامے رونق افروز ہیں۔ 'غالب اور میں' کے عنوان سے وہ اپنے فن کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اشعار غالب کی شرح بھی اپنے مخصوص انداز میں کرتے چلے گئے ہیں۔

اہل علم و ادب ابوالمعانی شاعر رومان اختر شیرانی کا صد سالہ جشن ولادت منا رہے ہیں' سورج' نے اس موقع پر ایک خصوصی اشاعت جناب اختر شیرانی کی نذر کرنے کا اعلان کیا تھا۔ اس حوالے سے غیر مطبوعہ نادر نایاب تحریروں اور تصویروں کی خاصی بڑی تعداد ہمارے ہاتھ لگی ہے۔ اس مرتبہ یہ بیش بہا خزانہ ہم آپ تک پہنچانا چاہتے تھے، مگر کیا کریں ضخامت کے پاؤں وسائل کی چادر سے باہر نکل آئے۔ سو نہ چاہتے ہوئے بھی یہ خصوصی شمارہ آئندہ کے لیے اٹھا رکھا ہے۔ تاکہ اس کی اشاعت اُسی انداز میں ہو جو شاعر رومان کے شایان شان ہو۔

پیارے قارئین! میں نے تو رسم دنیا نبھاتے ہوئے بہت کچھ لکھ دیا ہے۔ آپ میرے لکھے پر نہ جائیے، ورق اُلٹیے، پڑھیے اور اپنی رائے بھجوائیے۔ بے حد شکریہ

مدیر

علامہ محمد اقبال

ترجمہ: ڈاکٹر خالد حمید (ایم-ڈی)

دعا

یارب درونِ سینہ دلِ باخبر بدہ
در بادہ نشّہ را نگرم، آں نظر بدہ

یارب درونِ سینہ دلِ باخبر ملے
دیکھے نشہ جو مے میں، مجھے وہ نظر ملے

ایں بندہ راکہ بانفسِ دیگراں نزیست
یک آہِ خانہ زاد مثالِ سحر بدہ

جیتا نہیں جو بانفسِ دیگراں، اُسے
یک آہِ خانہ زاد مثالِ سحر ملے

سیلم، مرا بجوئے تنک مایۂ مپیچ
جولاں گہے بوادی و کوہ و کمر بدہ

سیلاب ہوں، نہ جوئے تنک مایہ، تو نہ کیوں
جولاں گہ بہ وادی و کوہ و کمر ملے

سازی اگر حریفِ یم بیکراں مرا
با اضطرابِ موج، سکونِ گہر بدہ

لازم ہے جب حریفِ یم بیکراں ہوں میں
با اضطرابِ موج، سکونِ گہر ملے

شاہینِ من بصیدِ پلنگاں گذاشتی
ہمت بلند و چنگل ازیں تیز تر بدہ

شاہین ہوں، نہ صیدِ پلنگاں، تو اے خدا
ہمت بلند، چنگ بھی اک تیز تر ملے

رفتم کہ طائرانِ حرم راکنم شکار
تیرے کہ نافگندہ فتد کارگر بدہ*

کرنا ہے طائرانِ حرم کا شکار گر
اک تیر، بے چلائے جو ہو کارگر، ملے

خاکم بہ نورِ نغمۂ داؤد برفروز
ہر ذرۂ مرا پر و بالِ شرر بدہ

ہوں خاک، نورِ نغمۂ داؤد دے مجھے
ذرے کو تا مرے پر و بالِ شرر ملے

نعت

سحر دم رحمتِ حق کا یہ مستانہ پیام آیا
مبارک اہلِ ایماں کو کہ وہ خیر الانام آیا

خدائی جس کے جلووں سے ہمیشہ جگمگائے گی
شبستانِ خدا کا آج وہ ماہِ تمام آیا

زمین و آسماں بھی جس کے در پر سر جھکائیں گے
ہیں چرچے قدسیوں میں آج وہ عالی مقام آیا

جبینِ بندگی بے تاب ہے سجدے لٹانے کو
الٰہی! تیرے بندوں کی زباں پر کس کا نام آیا؟

مرے دل میں ہزاروں طورِ سینا جگمگا اٹھے
کچھ اس انداز سے دل میں ترا شوق تمام آیا

بشر تھا وہ مگر ایسا جسے خیر البشر کہیے
غریبوں کی خبر لی اُس نے، بے زباں کے کام آیا

زباں چپ ہو گئی، جب دل نے چھیڑا تذکرہ اُن کا
دلوں کو وجد آیا، جب زباں پر اُن کا نام آیا

بجھے جتنے داغ کثرت کے، دلوں سے دُھل گئے سارے
لیے ہاتھوں میں ساقیٔ عرب وحدت کا جام آیا

مزہ جب ہے کہ جا پہنچیں خلد میں ہم اس طرح اختر
کہیں حوریں، محمد کا وہ مستانہ غلام آیا

اختر شیرانی

نعت

سحر دم' رحمت حق کا یہ مستانہ پیام آیا
مبارک اہل ایماں کو کہ وہ خیر الانام آیا

خدائی جس کے جلووں سے ہمیشہ جگمگائے گی
شبستان حرا کا آج وہ ماہ تمام آیا

زمین و آسماں بھی جس کے در پر سر جھکائیں گے
ہیں چرچے قدسیوں میں آج وہ عالی مقام آیا

جبین بندگی بے تاب ہے سجدے لٹانے کو
الٰہی' تیرے بندوں کی زباں پر کس کا نام آیا؟

مرے دل میں ہزاروں طورِ سینا جگمگا اٹھے
کچھ اس انداز سے دل میں ترا شوق تمام آیا

بشر تھا وہ مگر ایسا' جسے خیر البشر کہیے
غریبوں کی خبر لی' اس نے بیماروں کے کام آیا

زباں چپ ہو گئی' جب دل نے چھیڑا تذکرہ ان کا
دلوں کو وجد آیا' جب زباں پر ان کا نام آیا

تھے جتنے داغ کثرت کے دلوں سے دھل گئے سارے
لیے ہاتوں میں ساقی عرب وحدت کا جام آیا

مزہ جب ہے کہ جائیں خلد میں ہم اس طرح اختر
کہیں حوریں' محمدؐ کا وہ مستانہ غلام آیا

سانحہ ۸-اکتوبر

قیامت خیز زلزلہ اور اہلِ قلم کی المیہ شاعری

اردو زبان و ادب کے فروغ کا علمبردار

۷۴ سالہ ماہنامہ

بانی علامہ سیماب اکبر آبادی (مرحوم)

زیر ادارت : افتخار امام صدیقی

۲۲۸-۲۰۸، دینا ناتھ بلڈنگ پی۔ بی
ممبئی ۴۰۰۰۰۴، بھارت

عبدالعزیز خالد

صبحیں سیاہ پوش ہیں، شامیں دھواں دھواں

صبحیں سیاہ پوش ہیں ، شامیں دھواں دھواں
یہ قہرماں پہاڑ یہ ویران بستیاں!
منظر شکست و ریخت کے جس اور دیکھیے
یہ نیستی کا خطہ ہے یا ارضِ زندگاں؟
آبادیاں نمونہ بنیں رستخیز کا
کب سے نجانے تاک میں تھی مرگِ ناگہاں؟
یہ سرزمین دُکھ اور مصیبت کی سرزمیں
ناگفتنی ہے جس کی الم ناک داستاں
آشفتہ حال ، سوختہ بختوں کی کائنات
آہیں ، دعائیں ، نالے ، مناجاتیں ، سسکیاں؟
ہر آنکھ اشکبار ہے ، ہر چہرہ سوگوار
ہر شے تہس نہس ہے ، قیامت کا ہے سماں
ملبے کے ڈھیر سے جو نکالے نہ جا سکے
موجودگاں جو بن گئے آخر کو رفتگاں
جو جیسے تیسے دفن کیے جا سکے ہیں وہ
ہیں اجتماعی قبروں میں بے نام و بے نشاں
اے ذوالجلال تو متعال و مہیب ہے
ہم مشتِ خاک ہم کو نہیں تاب امتحاں

ہیں خواستگار عفو کے گو مستحق نہیں
ہیں ہاتھ کاسہ کاسہ ، نگاہیں فغاں فغاں
ہیں یونہی لب کشا یہ گنہگار جس طرح
منہ اپنے کھول دیتی ہیں بارش میں سیپیاں
ہر چند خستہ دم ہے پہ زندہ ہے آرزو
زور آزمائے باد مخالف ہے بادباں
تم پر ہے فرض ان کی مدد حسب مقدرت
یہ ہے ہمارے ظرف کی وسعت کا امتحاں
اس رزق میں سے دو جو خدا نے دیا تمھیں
ناممکناتِ قول ''قل العفو'' ہوں عیاں
انسانیت ہے سلسلہ نفس واحدہ
روح ایک ہی ہے انفس و آفاق میں رواں
فکر و عمل اگرچہ جداگانہ ہیں مگر
سب لوگ ہی کشاکش و کاہش میں ایکساں
توحید رمز وحدتِ نوع بشر کی ہے
سب تفرقے بھلا کے بنو سارے ایک جاں
اے ماجد و مہیمن و قیوم و کارساز!
رکھ ہم کو سرفراز علیٰ رغم حاسداں
رہنے دے نام درج کتابِ حیات میں
ضرب المثل بنا نہ یوں قوموں کے درمیاں
تو ہے کریم عذر پذیری ہے تیری شان
رحمت ہو تیری ہمقدم پاشکستگاں!

ڈاکٹر وزیر آغا

بتا اے شہر!

بتا اے شہر
تیری نیم روشن، تنگ
بل کھاتی ہوئی گلیوں میں،
یہ کیسا تعفن بھر گیا ہے
مکانوں کی بجھی آنکھوں میں
کالا موتیا اترا ہوا ہے
کوئی چھت پر نہیں جاتا
فلک سے رابطہ ٹوٹا ہوا ہے
ڈری سہمی ہوئی مخلوق
دیواروں کے اندر چھپ گئی ہے
کوئی آواز تک آتی نہیں ہے
وہ سناٹا
جسے تو نے کبھی گلیوں میں
آنے کی اجازت تک نہیں دی تھی
مکانوں کی بجھی آنکھوں کے رستے
چہکتے بولتے کمروں کے اندر آ گیا ہے
بتا اے شہر! تیرے تن بدن کو
یہ کیا بیٹھے بٹھائے ہو گیا ہے

شہزاد احمد

تہی دست

زلزلہ جس کے گھروندے کو مٹا دیتا ہے
اس کو بھی صبر کی توفیق خدا دیتا ہے
روز طوفان اٹھاتا ہے جو دریاؤں میں
وہی کشتی بھی کنارے سے لگا دیتا ہے
بھرتا رہتا ہے جو پہلے سے بھری جھولی کو
دیکھیے، مجھ سے تہی دست کو کیا دیتا ہے

☆☆☆

زمینِ دل میں عجب زلزلے سے آئے تھے
جو لوگ نیند میں تھے جاگنے نہ پائے تھے
فلک سروں پر اچانک ہی آ پڑا شہزاد
نجومیوں نے بہت زائچے بنائے تھے

امجد اسلام امجد

کوئی چارا نہیں

بے سکونی ہوا کی فطرت ہے
پانیوں کا نصیب بہنا ہے
ایک بے نام سے اشارے تک
وقت نے یونہی چلتے رہنا ہے!

جانتے ہیں کہ یہ حقیقت ہے
پھر بھی کیا کیا خیال آتے ہیں!
ذہن میں گونجتے ہیں سناٹے
دل میں جب جب سوال آتے ہیں

ریت کیوں ہاتھ میں نہیں رکتی!
کیوں زمیں کروٹیں بدلتی ہے!

مالک دوجہاں ، مرے معبود!
آدمی ، شہر ، خواب ، تعمیریں
وہ جو اک پل میں ہو گئیں نابود
تیری تخلیق تھیں وہ تصویریں!

سب زمینوں میں ، سب زمانوں میں
تیرے حکم ازل کی مہریں ہیں
تو ہی روشن ہے ہر ستارے میں
تجھ سے دریا ہیں ، تجھ سے لہریں ہیں

لوگ کہتے ہیں یہ مشیت تھی
اس جگہ بولنے کا یارا نہیں
صرف توفیق صبر کی مانگو
ماسوا اس کے کوئی چارا نہیں

آزمائش پہ صبر واجب تھا
سو اسے اختیار ہم نے کیا
دیکھنا یہ ہے اب ، کہ دیدہ و رد
اس پہ کیا ، کچھ وچار ہم نے کیا!

حادثہ جس قدر بھی سنگیں ہو
بیت جائے تو بھول جانا ہے
اس کا مقسوم ہے یہی ، اس سے
آدمی کتنا سیکھ پاتا ہے!

سیّد تابش الوری

انسانیت کی پکار

ہم کو انسانیت پکارتی ہے
سب کو مل کر جواب دینا ہے
زلزلے نے قیامتیں ڈھا دیں
آسماں نے زمیں کو ڈھانپ دیا
دفن کرنے کو کوئی قبر نہ کفن
ہر مکاں نے مکیں کو ڈھانپ دیا
علم کے باغ باغ اجڑے ہیں
کلیاں غنچے ، گلاب مسلے گئے
کتنے معصوم موت کے ہاتھوں
پڑھتے پڑھتے کتاب مسلے گئے
موت پھرتی ہے بال کھوئے ہوئے
ان گنت لوگ بے سراغ ہوئے

موت پھرتی ہے بال کھولے ہوئے
ان گنت لوگ بے سراغ ہوئے
کتنے معذور بے سہارا ہیں
کتنی ہوائیں بے ردا ہیں آج
کتنی آبادیوں میں ماتم ہیں
کتنے انسان بے نوا ہیں آج
جو بھی ہم دے سکیں وہ دینا ہے
جو بھی ہم کر سکیں وہ کرنا ہے
ہر خرابے کو پھر سنوارنا ہے
بستی بستی نئی بسانی ہے
اک نئے عزم و حوصلے کے ساتھ
زندگانی نئی بسانی ہے
ہم کو انسانیت پکارتی ہے
سب کو مل کر جواب دینا ہے

اسلم کولسری

عید آئی ہے بابا

عید آئی ہے بابا کفن بھیج دو
میرا ، منی کا ، بھیا کا ، امی کا
پیاری دادی کا ، بابا کفن بھیج دو
اب کے کمبل ، بچھونے ، نہیں چاہئیں
مجھ کو اپنے کھلونے ، نہیں چاہئیں
اور منی کو گڑیا نہیں چاہیے
کوئی خوابوں کی پڑیا نہیں چاہیے
کوئی پتلون ، شرٹ اور گھڑی بھی نہیں
دادی اماں کی خاطر چھڑی بھی نہیں
عید آئی ہے بابا کفن بھیج دو
میرا بستہ نہ جانے کہاں کھو گیا
میرے کپڑے نہ جانے کہاں دفن ہیں
دادی اماں کے ہاتھوں میں تسبیح تھی
اُس کے دانے بھی جانے کہاں دفن ہیں
جو میرے پیارے بھیا کی آنکھوں میں تھے
خواہشوں کے خزانے کہاں دفن ہیں
خیر اب ڈھونڈنا کیا کفن بھیج دو
عید آئی ہے بابا کفن بھیج دو

محمد ظہیر

زلزلہ اور ہم

ستارے دفن ہوئے ، ماہتاب دفن ہوئے
ہمکتے بچے ، مہکتے گلاب دفن ہوئے
ہزار پیکرِ حسن و شباب دفن ہوئے
وہ جاگتے تھے کہ تھے محوِ خواب ، دفن ہوئے
حساب کوئی نہیں ، بے حساب دفن ہوئے

زمین کھا گئی جن کو ، اب ان کو پائیں کہاں
جو ڈھونڈھنے بھی انھیں جائیں ہم تو جائیں کہاں

سزا ملی ہے گناہوں کی ، لوگ کہتے ہیں
مگر سزا تو یہاں بے گناہ سہتے ہیں
انھی کی آنکھوں سے دریا لہو کے بہتے ہیں
گناہ جن کے ہیں وہ تو بچے ہی رہتے ہیں

وہ زلزلہ ہو کہ طوفاں ، یہ فرق رہتا ہے
اس امتیاز میں انسان غرق رہتا ہے

چلو کہ پھر سے نئی بستیاں کریں آباد
نئے گھروں کی رکھیں نیکیوں پہ ہم بنیاد
کچھ ایسی رسم چلے ، ایسی طرز ہو ایجاد
کہ بچے ، بوڑھے جواں پائیں اپنے دل کی مراد
یہ ملک سب کا لگے ہم سبھی لگیں آزاد

جو زندہ لوگ ہیں وہ حادثوں کو سہتے ہیں
کچھ ان سے سیکھنے کی جستجو میں رہتے ہیں

ریاض حسین چودھری

مرے خدا!

ہر قریہ زلزلوں کی ہے زد میں مرے خدا
ہر خطے پر قضا کی ہے چادر تنی ہوئی
ہر سمت ملک خوف کے ہیں لشکری کھڑے
کوہ و دمن میں کھو گئی چہروں کی دلکشی

یارب! عذاب لمحوں سے اس کو ملے نجات
میری زمیں کو صبر و سکون و قرار دے
باشندگان ارض وطن کی خطا معاف
چہروں پہ پھول بن کے جو مہکے بہار دے

یارب ، برہنہ سر ہے مری سرزمیں پاک
یارب ، شکستگی کی لکیریں بدن پہ ہیں
رقصاں ہے موت وادی جنت نظیر میں
بادل قضا کے آج بھی سرو سمن پہ ہیں

بیٹوں کی خیر ہو ، مری ماؤں کی خیر ہو
بستی کی گنگناتی فضاؤں کی خیر ہو
سرکارؐ کے وسیلہ رحمت سے یا خدا
میرے وطن کی سبز ہواؤں کی خیر ہو

شاہدہ لطیف

ذاتِ باری کرم!

ذاتِ باری کرم! ذاتِ باری کرم!
ایک پل میں ہوئیں بستیاں وہ کھنڈر
ہنستے بستے ہوئے جن میں روشن تھے گھر
اب نہ دالان ہے اور نہ دیوار و در
ذاتِ باری کرم! ذاتِ باری کرم!

ہم گنہگار ہیں، ہم خطا کار ہیں
کاوشیں اپنی جتنی ہیں بیکار ہیں
اوجِ دنیا ملے پھر بھی لاچار ہیں
دل تری رحمتوں کے طلبگار ہیں
ذاتِ باری کرم! ذاتِ باری کرم!

وہ مہکتے ہوئے پھول اوجھل ہوئے
جو چمن ہوگئے دھول اوجھل ہوئے
لوگ معقول معقول اوجھل ہوئے
جن سے قصے تھے منقول اوجھل ہوئے
ذاتِ باری کرم! ذاتِ باری کرم!

راستے زندگانی کے دشوار ہیں
یوں تو کہنے کو ہم لوگ لاچار ہیں
ہم بھی لطف و کرم کے سزا وار ہیں
پھر بھی تیری عقیدت سے سرشار ہیں
ذاتِ باری کرم! ذاتِ باری کرم!

اشرف جاوید

زمین کا سینہ پھٹا ہوا ہے

ابھی افق پر
گلاب کی طشتری سجی ہے
ابھی لہو حرف حرف بن کر
فصیلِ شب پر ٹپک رہا ہے
یہ نیم وا دائروں کی قوسیں
عبارتوں سے تہی ہیں......لیکن
بصارتوں سے تہی نہیں ہیں

☆☆☆

پرندے چپ ہیں
زمیں کا سینہ پھٹا ہوا ہے
سفر ستارہ
کہیں ورائے نظر کھلا ہے
ابھی ابھی تو یہ دن ڈھلا ہے
ابھی سے اندیشۂ طلوعِ بہار کیسا!
ابھی سے اندازہ کیا سحر کا!
ابھی تو آغاز ہے سفر کا!!

سفر ستارہ
کہیں ورائے نظر کھلا ہے
ہواؤں نے بادبان میں گرہیں ڈال
دیں ہیں
ہتھیلیوں پر لکھی عبارت
کسی بشارت کی منتظر ہے
پرندے چپ ہیں
کوئی نظارہ!
کوئی اشارہ!
سرِ نظر حرف وصل اترنے کے دن
نہیں ہیں

☆☆☆

ابھی تو سورج
صلیبِ شب پر براجماں ہے

عباس تابش

قیامتیں کیا کیا

اور اب یہ جان کے ہوتی ہیں حیرتیں کیا کیا
کہ اپنے زیرِ قدم تھیں قیامتیں کیا کیا
یہ لوگ شہر میں یا اجتماعی قبر میں ہیں
کہ بعد مرگ بھی قائم ہیں قربتیں کیا کیا
عزیز، پیڑ، پرندے، مکاں، شکستہ خواب
مجھے اٹھانا پڑیں اب کے میتیں کیا کیا
یہاں میں نوحہ کروں کون کون سی ماں کا
کہ اٹھ گئیں مری بستی سے برکتیں کیا کیا
مرے خدا او مرے سخت بے نیاز خدا
نیاز مند سہیں اور اذیتیں کیا کیا
عجب نہیں کہ یہاں چاندنی کی فصل اُگے
قدم قدم پہ ہوئیں دفن صورتیں کیا کیا
میں زلزلے میں بچا بھی تو کیا بچا تابش
ہلاک کر گئیں مجھ کو ہلاکتیں کیا کیا

شکیل جاذب

گلہ ہو بھی تو کس سے ہو

ابھی وہ پھول کھلنا تھے
کہ جن کی نکہت پر کیف سے سانسیں معطر ہوں
ابھی رستے میں تھے وہ دن
کہ جن کی روشنی سے گھر کے بام و در منور ہوں
ابھی ان بہتے دریاؤں میں ڈھل کر
گلشن ارضِ وطن کو ہمسر افلاک ہونا تھا
ابھی بارود کی بو سے فضا کو پاک ہونا تھا
تو پھر کیوں اس زمیں کی ایک کروٹ نے
مری دنیا کو بس اک آن میں ویران کر ڈالا
اے میرے لامکاں مولا!
یہ کیسا وقت آیا ہے
مکیں خود گھر کی دیواروں کے ملبے میں
تڑپتے ہیں
کوئی وارث نہیں ملتا
جواں پھولوں کے ہر گھر سے یہاں لاشے
نکلتے ہیں
کسے آواز دے کوئی
عجب محشر کا منظر ہے
کہ اس ملبے میں ہر گھر موت کا گھر ہے
یہی مدفن ہے اب اپنا
یہی اپنا مقدر ہے

خاور نعیم ہاشمی

شہید بچوں کے نام ......

مرگ بے رحم ، کیا کیا تو نے
سارا گلشن ، مسل دیا تو نے
سینکڑوں کیا ، ہزار ہا بچے
آن کی آن میں بنے لاشے
ادھ کِھلے پھول موت نے روندے
اور جو بچ گئے ، یتیم ہوئے
کوئی وارث نہ کوئی والی ہے
کوئی گلشن نہ کوئی مالی ہے
سوچتا ہوں تو دل دھڑکتا ہے
موت ہی موت جس طرف جائیں
خوف ہی خوف جس طرف دیکھیں
دوستو! کیا کہوں کہ تاب نہیں
مر گئے کس قدر حساب نہیں

کیپٹن عطا محمد

لہجہ زمین کا

میں نے سنا ہے غور سے نوحہ زمین کا
جیسے ہو مر گیا کہیں بچہ زمین کا
کتنے ہی پھول کھا گئی یہ موت کی بلا
کتنے گھروں کو کھا گیا رعشہ زمین کا
لاشوں کے ڈھیر دیکھ کر آنکھیں ہی پھٹ گئیں
ایسا نہ پہلے دیکھا تھا غصہ زمین کا
اس دن بہت اداس تھے بچے سکول میں
کس کو خبر تھی سامنا ہوگا زمین کا
کچھ ہی پلوں میں ایسی قیامت گزر گئی
کچھ ہی پلوں میں ذائقہ بدلا زمین کا
کوہسار زلزلوں کی زباں بولنے لگے
تھا زہر میں بجھا ہوا لہجہ زمین کا
بکھرے ہوئے تھے چار سو اعضا کٹے ہوئے
پھیلا ہوا تھا چار سو نوحہ زمین کا
جتنے بھی دکھ تھے دھرتی نے یک دم اُگل دیے
یک دم عطاؔ بدل گیا چہرہ زمین کا

حمیدہ شاہین

محبت کا خیمہ

محبت کا خیمہ اٹھا کر چلے ہیں
یہ جذبوں کی روٹی
یہ آنکھوں کا پانی
یہ احساس کی گرم چادر
اخوت کا کمبل اٹھائے
لرزتے پہاڑوں کی جانب چلے ہیں
زمین کی دڑاروں میں میرا بدن خوں
میں ڈوبا پڑا ہے
شکستہ مکانوں کے ملبے تلے میرے
بازو دبے ہیں
مرے پھول، کلیاں، مری چہچہاتی ہوئی
شوخ چڑیاں
مرے قرۃ العین، لختِ جگر
موت کے سرد ہاتھوں میں ہیں
اور یہ اُن کو چھڑانے چلے ہیں
میرے سب حروفِ دعا اُن کے ہمراہ
چاہت کی شمع جلا کر چلے ہیں
محبت کے خیمے اٹھا کر چلے ہیں

مختار کھرل

سائباں آباد رکھنا ہے

نظر کو دیکھنا ہیں سارے منظر خستہ حالی کے
مگر پیشِ نظر اک گلستان آباد رکھنا ہے
بچانا ہے پرندوں کو کسی بھی ناگہانی سے
شجر کی گود میں اک آشیاں آباد رکھنا ہے
کڑکتی دھوپ میں سائے کہاں تک ساتھ دیتے ہیں
بس امکاں ہمیں اک سائباں آباد رکھنا ہے

واجد امیر

کوئی اسکول کی گھنٹی بجا دے

کوئی اسکول کی گھنٹی بجا دے
ہماری مائیں رستہ دیکھتی ہیں
کئی دن ہو گئے ہیں
زمیں پاؤں پٹکتی پھر رہی ہے
اندھیرا ہے کہ بڑھتا جا رہا ہے
ہماری تختیاں ٹوٹی پڑی ہیں
کتابیں اور بستے کھو گئے ہیں
در و دیوار اوندھے منہ پڑے ہیں
چھتیں سینے پر آ کر ٹک گئی ہیں
اندھیرا ہے کہ بڑھتا جا رہا ہے
کسے آواز دیں کس کو بلائیں
نجانے کب ہمیں چھٹی ملے گی
ہماری مائیں رَستہ دیکھتی ہیں
کوئی اسکول کی گھنٹی بجا دے

شاہد واسطی

قیامت کی گھڑی

زلزلہ کیا قیامت کا منظر ہے یہ
صوبہ سرحد ہو آزاد کشمیر ہو
گھر کہاں اپنے ہی صحن کی قبر میں ہر
کوئی دفن ہے
لعل کو اپنے بچے کی ماں رو چکی
زندہ ملنے کی امید ہی کھو چکی
زندگی آج ملبے تلے دب گئی
جاگ اٹھنے کی امید ہی دب گئی
زندگی سو گئی خواب بھی سو گئے
رونے والے تھے احباب بھی سو گئے
اب کفن کو بھی موجود کپڑا نہیں
کیا جنازہ اٹھے کوئی ملتا نہیں
اے خدا رحم کر اے خدا رحم کر
کام آئی تو بس ایک انسانیت
کوئی سمجھے تو اک یہ بھی رشتہ بہت
یہ بڑا امتحاں ہے اے اہل وطن
اب لگا دو سبھی اپنا دھن اپنا تن

ظفر علی راجا

زلزلہ

زمیں کا رزق ہے اولادِ آدم
ازل سے روز و شب انساں، مسلسل
زمیں کے پیٹ میں اس رزق کو پہنچا
رہا ہے
صبح سے شام تک ہستی کو اپنی
کفن زخمی دریدہ حسرتوں کا
خود اپنے ہاتھ سے پہنا رہا ہے
مگر شاید زمیں بھوکی ہے پھر بھی
شکم میں زلزلے پلتے ہیں اس کے
نگل لیتے ہیں ہنستی، بستیوں کو
یہاں اک شہر تھا، شہر تمنا
جہاں سب پھول مٹی میں ہیں غلطاں
جہاں مسلی ہوئی رکھی ہیں کلیاں
جہاں اک ڈھیر ہے اب حسرتوں کا

کتابیں، کاپیاں، اسکول، بستے
حیاتِ تازہ تر کے خواب سارے
دھنک آسودگی کے باب سارے
جہاں معصوم نظروں میں ابھی تک
کسی تصویر کی صورت ہیں ساکت
کہیں اِس ڈھیر کی پامالیوں میں
غبارِ نیستی میں غرق ہیں بے جان
آنکھیں
زبانِ درد ملبے میں دبی ہے
ستم دستِ فنا کے سہہ رہے ہیں
لبِ خاموش لیکن کہہ رہے ہیں
ہوس دھرتی کی بڑھتی جا رہی ہے
نہیں اِس اشتہا کا انت کوئی
زمیں کا رزق ہے اولادِ آدم
یہی تحریر ہے لوحِ ازل پر

سورج

ماجد صدیقی

کیسی انگڑائی زمیں نے لی کہ اژدر ہوگئی

خلق پیشِ زلزلہ کیا لقمۂ تر ہوگئی
کیسی انگڑائی زمیں نے لی کہ اژدر ہو گئی

خاک جو رزق آفریں تھی اس سے خوف آنے لگا
خیر جو اگلا کیے تھی ، منبع شر ہو گئی

زہر آتش کھل گئی جیسے ہوا میں سر بہ سر
سانس خود سینہ بہ سینہ جیسے اخگر ہو گئی

درسگاہوں سے اٹھا وہ حشر سیلِ مرگ کا
ہر نگریا چیختی ماں کا کھلا سر ہو گئی

کیا سے کیا تن تھے جو اترے اجتماعی قبر میں
یہ زمیں جن کے لیے میدان محشر ہو گئی

یوں لگا دیکھا نہ تھا بے رحم میلہ موت کا
آنکھ جو ، جس پر کھلی وہ دیدۂ تر ہو گئی

مقتدر لوگوں کی سب بدنظمیاں کھل کھل گئیں
دیس کی اک ایک بستی جن کا مظہر ہو گئی

شاہ بھی اس حشر سے کچھ درس لیں خلقت کے ساتھ
خلق کی فریاد جن کے واسطے زر ہو گئی

لمحہ بھر کو ہی سہی ماجد ہوا اتنا ضرور
زندگانی کی حقیقت سب کو ازبر ہو گئی

ابن عبداللہ شاکر

مگر اس کام سے پہلے

کسی آفت زدہ بستی
کے ملبے پر کھڑا تنہا
کوئی بچہ یہ کہتا تھا
مرے رخسار پر یہ جو
جمے خوں کی لکیریں ہیں
مری مرتی ہوئی ماں کی
محبت کی نشانی ہیں
مرے منہ کو نہیں دھونا

مرے بالوں میں تہہ در تہہ
جو مٹی اور ریزے ہیں
یہی تو اک گواہی ہیں
کہ میرے سر پہ بھی چھت تھی
مرے سر کو نہیں دھونا
مرے گاؤں کے میداں میں
نئے خیموں کی بستی میں
مرے رہنے کے ساماں ہیں
مرے اپنے نہیں بستے
وہ جن کے ساتھ رہنا تھا
وہی اس میں نہیں رہتے
مجھے رہنے کا مت کہنا

کہیں خیمہ نہیں ایسا
جہاں پر منتظر ہو ماں
کوئی کوچہ نہیں ایسا
جہاں ہوں کھیلتے بھائی
جہاں بہنیں نہیں رہتیں
وہاں میں نے نہیں رہنا

چلو اچھا میں رہ لوں گا
میں منہ اور سر بھی دھو لوں گا
مگر اک کام ہے میرا
مرے ٹوٹے کھلونوں کی
جھلک مجھ کو دکھا دینا
مرے اپنوں کی لاشیں تو
کفن دے کر دبا دینا
مگر اس کام سے پہلے
مرے کپڑوں کے دھبوں کو
مری آنکھوں کے گوشوں کو
مری زندہ خراشوں کو
مرے سینے کے تمغوں کو
مرے زخموں کو مت چھونا
کسی آفت زدہ بستی کے
ملبے پر کھڑا تنہا
کوئی بچہ یہ کہتا تھا

شعیب احمد

ریلیف کیمپ

وہ کہتی ہے
کہ جب یہ سب ہوا، ہم تین بہنیں، چار
بھائی تھے
ہمارا گھر تھا،
گھر میں رونقیں تھیں
زندگی خوشیاں لٹاتی تھی!
ماں!
ہمیں، ہم سب کو اپنے ہاتھ سے کھانا
کھلاتی تھی
ہمیں تیار کر کے،
پیار کر کے،
الوداع کرتی تھی،
کہتی تھی ...... ''خدا حافظ''
اور اس کے بعد
جب تک ہم گلی سے مڑ نہیں جاتے تھے
ہم کو دیکھتی رہتی تھی حسرت سے!

☆☆☆

وہ کہتی ہے
کہ جب ہم گھر سے نکلے، تین بہنیں،
چار بھائی تھے

سکول آ کر ابھی ہم اپنی کلاس میں
پہنچے ہی تھے
جب زلزلہ آیا
دھماکا سا ہوا اور بس!!
مجھے جب ہوش آیا ہر طرف پتھر ہی پتھر تھے
قیامت کا سماں تھا، دور تک چیخیں ہی
چیخیں تھیں
مجھے اپنے سوا حد نظر تک کچھ نظر آتا نہیں
تھا
صرف میں تھی اور یہ ننھا ''منور'' تھا
مری استانیاں، ہم درس، تین بھائی اور
دو بہنیں
مرے ابو، مری امی!!
وہ کہتی ہے مری امی تو اک پل رہ نہیں
سکتی ہے
میرے بن!!
وہ کہتی ہے ''منور دودھ پیتا ہے تو سوتا ہے''
وہ کہتی ہے ''بہت سردی ہے اس میدان میں،
ہڈیاں چٹختی ہیں''
وہ کہتی ہے ''ہمیں بس ایک کمبل اور خیمے
کی ضرورت ہے!!!''

لطیف ساحل

برباد بستی کی طرف اپنی محبت بھیجنے والو

پہاڑوں پر بھی
برباد بستی کی طرف اپنی محبت بھیجنے والو
یہاں شہروں میں ہر جانب
بہت خیمے لگائے ہیں محبت نے
جہاں سکوں کی بارش ہے
جہاں بستر ہیں، کپڑے ہیں
یہاں ہر آنکھ بھی نم ہے
یہاں ہر ہونٹ بھی شل ہے
تمھیں رونا بھی آتا ہے
زمینِ دل میں تخمِ آرزو، بونا بھی آتا ہے
یہاں حرفِ تسلی لے کر سب گلیوں میں
پھرتے ہیں
بہت برباد لوگوں کے لیے کتنا اثاثہ جمع
کرتے ہیں
مگر ان دور افتادہ پہاڑوں پر
ہوا، لاشوں کے سینوں سے ابھی مٹی
اڑاتی ہے
کسی دوشیزہ کے آنچل کا اک پرچم بناتی ہے
جہاں کوئی نہیں پہنچا، وہاں سب کو بلاتی ہے

وفا، ہاتھوں پہ رکھ کر سو گئے سارے
زمیں کو جوتنے والے، زمیں کے ہو گے
سارے
کوئی اُن سب کے نیلے، ہاتھوں کو
ابھی چھونے نہیں آیا
کسی نے آنکھ میں ٹھہرے ہوئے خوابوں
کی مورت تک نہیں دیکھی
کسی نے ہونٹ پر انگلی نہیں رکھی کہ چپ
کی داستاں چپ ہو
کھلونوں میں پڑا بچہ، کھلونا ہو گیا خود بھی
فضا کی وسعتوں میں منجمد چیخوں کے
جالے ہیں
دعا، زخمی پروں سے لمحہ بھر پرواز کرنے
کو ترستی ہے
محبت، منتشر ہوتے ہوئے لمحوں میں
بکھری ہے
یہاں شہروں میں ہر جانب
بہت خیمے لگائے ہیں محبت نے
مگر اُن دور افتادہ پہاڑوں پر
ہوا، لاشوں کے سینوں سے ابھی مٹی
اُڑاتی ہے

فوزیہ سلطانہ

وہ آنکھیں اب نہیں روتیں

وہ آنکھیں اب نہیں روتیں
عجب اک خوف سے پتھرا گئی ہیں
کسی غم کی نہایت پا گئی ہیں
ان آنکھوں میں کسی دور مصیبت کی کہانی ہے
نہ آنسو ہیں نہ پانی ہے
وہاں سورج نکلتا ہے
مگر صبحیں نہیں ہوتیں
قیامت خیز لمحوں میں بہت بے گور لاشیں ہیں
سسکتی زندگانی ہے
کہیں ماؤں سے بچے چھن گئے ہیں
کوئی معصوم زندہ ہے
مگر محروم ہے ماں کی محبت سے
غموں کے اس تلاطم میں
وہ آنکھیں خشک رہتی ہیں
وہ آنکھیں اب نہیں روتیں

تنقید و تحقیق

ظفر علی راجا
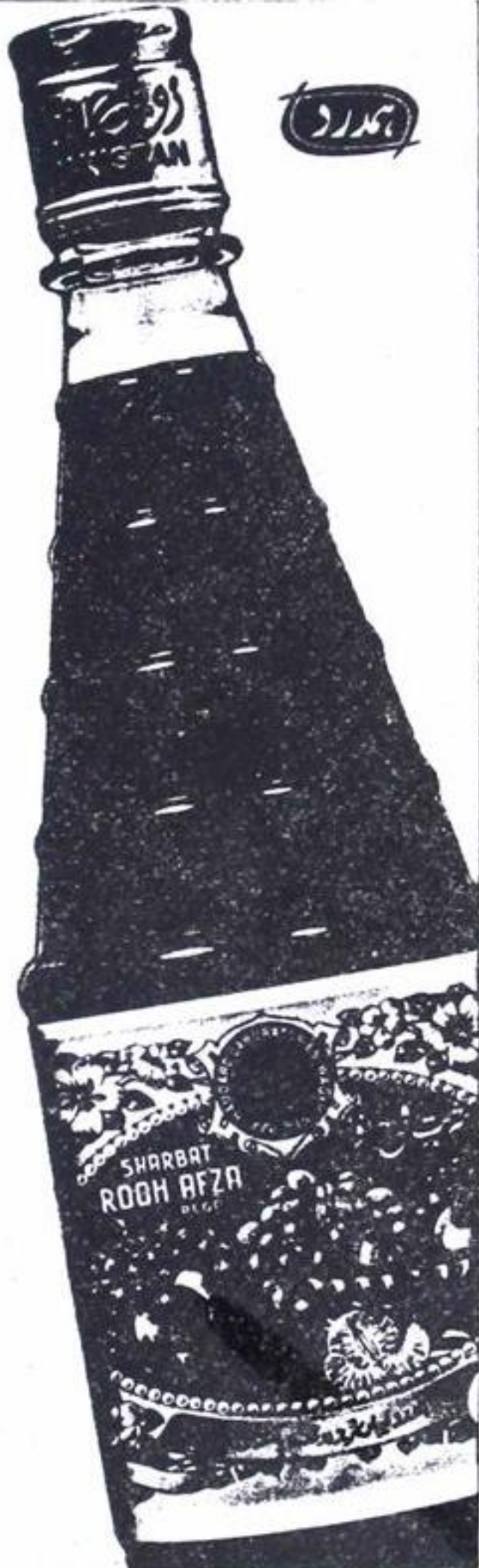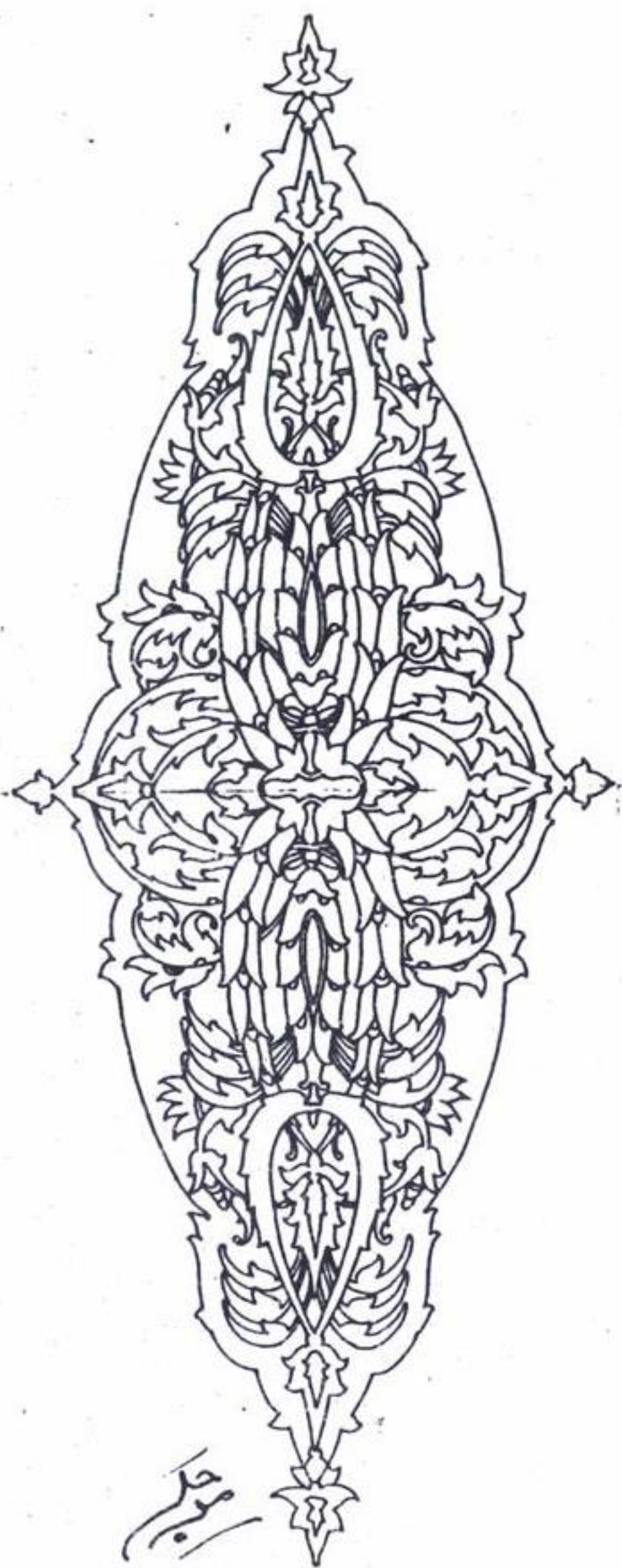
خط اور خطاطی کی مختصر تاریخ

خطاطی ایک فن لطیف ہے اس کی ابتدا پیغمبروں کے دستِ مبارک سے ہوئی۔ ایک روایت کے مطابق اس کائنات میں پہلا حرف حضرت آدم علیہ السلام نے گیلی مٹی کے ٹکڑے پر لکھا تھا اور پھر اسے آگ میں پکا کر پختہ کر دیا تھا۔ اس طرح جریدۂ عالم پر اولین تحریر معرض وجود میں آئی تھی۔ پتھر کے دور کے جو آثار مصر، چین، ایران، بابل، آشور، نینوا اور ہندوستان وغیرہ سے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں انسانی تحریر کے ابتدائی خدوخال تصویری اشکال میں مٹی اور دھات کے برتنوں اور پتھر کی سلوں پر نقش دکھائی دیتے ہیں۔ مستند روایات کے مطابق جن کی تصدیق آسمانی کتب سے بھی ہوتی ہے۔ باقاعدہ خطاطی کی ابتداء اللہ کے ایک اور پیغمبر حضرت ادریس علیہ السلام کے قلم سے چار ہزار سال قبل مسیح میں ہوئی تھی۔ بعدازاں ۳۲۰۰ قبل مسیح کے لگ بھگ مصر میں (Glaphy Hiero) ہیروغلیفی خط ایجاد ہوا۔ تصویری نقوش والا یہ خط فراعنہ مصر کے اہراموں میں لگی سنگلاخ چٹانوں پر آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ عراق کے آثار قدیمہ حضرت ادریس ہی کے زمانے کے لگ بھگ لکھے گئے ایسے پتھریلے کتبے دریافت ہوئے ہیں جن پر کیل نما آہنی آلے کی مدد سے خطاطی کی گئی ہے۔ ماہرین نے اس خط کو اسی مناسبت سے ''خط میخی'' کا نام دیا ہے۔ اس کے حروف بھی کیل یا میخ سے مشابہت رکھتے تھے خط میخی کی اب تک نو اقسام دریافت ہو چکی ہیں۔ قرآن حکیم میں بھی سابقہ زمانے کی ایک کتاب، صحیفہ ابراہیمی، کا ذکر ملتا ہے۔ حضرت ابراہیم کا زمانہ ۲۰۰۰ سال قبل مسیح کا زمانہ ہے۔ امریکہ میں کولمبس کی آمد سے دو ہزار سال قبل کا ایک کتبہ برازیل سے دستیاب ہوا ہے جو آرامی زبان کی خطاطی سے مزین ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آرامی سیاح حضرت عیسٰی علیہ السلام کی

باقاعدہ خطاطی کی ابتداء حضرت ادریسؑ کے قلم سے چار ہزار سال قبل مسیح میں ہوئی تھی

پیدائش سے بہت پہلے امریکہ پہنچ چکے تھے اور انہوں نے الفاظ و کلمات تحریر کرنے پر قدرت حاصل کر لی تھی۔ اس کتبے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آرامی قوم نے ۲۲ حروف ابجد کی خطاطی وضع کر لی تھی۔ برازیل سے دریافت ہونے والا یہ کتبہ ۱۲۵۰ سال قبل مسیح کا ہے۔ اور اس پر تحریر داہنی سے لکھی گئی ہے۔ آرامی اقوام بالادست اور تجارت پیشہ تھیں۔ وسعت تجارت اور

قدیم خط میخی کا عکس اور علامات

فتوحات کے ساتھ ساتھ آرامی خط دنیا کے مختلف علاقوں میں پھیلتا اور مقامی اثرات قبول کرتا چلا گیا۔ اس طرح آرامی اور علاقائی آمیزش سے یونانی، سریانی، ایرانی، عبرانی، خروشتی، مسند، نبطی اور بعدازاں عربی خط معرض وجود میں آئے۔

الفبا ہیروغلیفی

رموز ہیروغلیفی	اس کے مقابل غیر عربی حروف	عربی حروف	رموز ہیروغلیفی	اس کے مقابل غیر عربی حروف	عربی حروف
𓄿	;	ا	𓎛	h	ح
𓇋	i, y	!	𓐍	h	خ
𓇌 ، "	y	ی أو !	𓄡	h	خ
𓂝	'	ع	𓋴 ، 𓊃	s	س
𓅱 ، 𓏲	w	و	𓈙	š	ش
𓃀	b	ب	𓈎	k	ق
𓊪	p	ب	𓎡	k	ك
𓆑	f	ف	𓎼	g	غ
𓅓 ، 𓐝	m	م	𓏏	t	ت
𓈖 ، 𓋔	n	ن	𓍿	t	ث
𓂋	r	ر، ل	𓂧	d	د
𓉔	h	ه	𓆓	d	ج أو ز

2000ء سال قبل مسیح میں آرامی خط کی ایجاد سے عربی خط کی اختراع تک مختلف خطوط کے عالم وجود میں آنے کی تقویم پر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے تو پتا چلتا ہے کہ یہ عرصہ کم ازکم پانچ سو سال پر محیط ہے۔

ظہور اسلام اور نزول قرآن کے بعد عربی خط اور اس کے ذیلی خطوط میں قلمکاروں نے حسن تعمیر کے ساتھ ساتھ ذوق نظر اور ندرت قلم کا وہ اظہار کیا کہ صدی صدی پھیلے ہوئے علمی منظرنامے میں یہ خط فردوس نگاہ بنتے چلے گئے۔ عربی رسم الخط سے مکی اور مدنی طرز خطاطی نے جنم لیا۔ پھر خوش نظری اور خوش جمالی کے رنگا رنگ پہلو لئے ہوئے خط کوفی، مغربی، کیروانی،

جزائیری، تیونسی، کرتبی، بغدادی اور سوڈانی خط ایجاد ہوئے۔ اس کے بعد کے زمانوں میں عقل انسانی نے ذوقِ جمال کی مزید ارتقائی منازل طے کیں اور خط ریحان، خط ثلث، خط دیوانی، خط سیاقت، خط توقیع، خط غبار اور خط مسلسل نے صفحۂ قرطاس پر ظہور کیا۔ خط نسخ، خط شکستہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ

خَلَقَ • خَلَقَ الْاِنْسَانَ

مِنْ عَلَقٍ • اِقْرَاْ وَرَبُّكَ

الْاَكْرَمُ • الَّذِیْ عَلَّمَ

بِالْقَلَمِ • عَلَّمَ الْاِنْسَانَ

مَا لَمْ یَعْلَمْ •

قدیم خط کوفی کا ایک خوبصورت نمونہ

اور خط نستعلیق نے جنم لیا پھر وقت کے ساتھ ساتھ تحقیق اور فکری ہم آہنگی کی کارفرمائی کے نتیجے میں اقلیم قلم کے مختلف دبستان عالم وجود میں آئے۔ اس طرح خطاطی کے دبستان مصر، دبستان ترکی، دبستان ایران، دبستان بخارا اور دبستان ہرات وغیرہ قائم ہوئے۔

اسلام اور خطاطی، چولی دامن کے ساتھی ہیں۔ مسلمانوں کے ہاں خطاطی کا آغاز نزول وحی کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ اللہ کے بھیجے ہوئے مقدس پیغام کو محفوظ بنانے کا اہتمام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اس طرح عربی خط اسلام اور مسلمانوں کا خط بن گیا۔ اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ پوری دنیا میں پھیلتا چلا گیا۔ اسلام کے اولین خطاطوں میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ شامل ہیں۔ وحی الٰہی کی اولین کتابت انہی بزرگ ہستیوں کے دست ہائے مبارک سے آغاز پذیر ہوئی۔ پیغمبر اسلام ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے۔ تو کتابت وحی کا فریضہ ابی بن کعبؓ، زید بن حارثؓ، اور معاویہ بن ابی فیضانؓ سر انجام دینے لگے۔ دین حق میں قلم کو جو تقدس حاصل ہے وہ حضور اکرم کے توسط سے عالم انسانیت پر نازل ہونے والی پہلی اور دوسری وحی سے ظاہر ہے۔ پہلی وحی کے الفاظ کچھ اس طرح سے ہیں۔

''پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا ہے انسان کو ایک خون کے لوتھڑے سے۔ پڑھ تیرا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے انسان کو قلم کے ذریعے وہ سب کچھ سکھا دیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔''

اس کے بعد نازل ہونے والی دوسری وحی کے الفاظ دیکھئے۔

''ن۔ قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جس کو لکھنے والے لکھ رہے ہیں''

اس طرح اللہ بزرگ و برتر نے اپنے اولین کلام ہی میں قلم خط اور خطاطی کی اہمیت و

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تحریر

برکات کو اجاگر کر دیا۔ دین اسلام سے محبت نے جہاں قرآنی آیات کو زیادہ سے زیادہ خوش خط بنانے کا رجحان پیدا کیا۔ وہاں اللہ تبارک تعالیٰ کی عظمت اور اللہ کے رسول سے بے پایاں محبت نے اسمائے ربانی اور اسمائے حسنیٰ کی دیدہ زیب خطاطی کے ان گنت اطوار و اسالیب کو زیب قرطاس کیا۔ اس زمانے میں چونکہ کاغذ بالکل نایاب تھا اس لئے کھجور کے درخت کے چھلکے، چوڑی اور لمبی ہڈیاں اور جانوروں کی کھال بطور قرطاس استعمال کی جاتی تھی۔ پہلی مرتبہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے الگ الگ قرآنی مخطوطات کو حضرت حفصہؓ سے حاصل کر کے حضرت زید بن ثابت انصاریؓ کے ذریعے جمع کروایا۔ اس طرح قرآن حکیم ایک جگہ مجتمع ہو گیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تحریر

۳۰ھ میں حضرت عثمان نے حضرت زید بن ثابت کی نگرانی میں قرآن کے چار پانچ نسخوں کی کتابت کروائی۔ قرآن مجید کے یہ نسخے اونٹ کی کھال کی جھلی پر سیاہ روشنائی والے قلم سے خوش خط لکھے گئے تھے۔ حضرت عثمان کو جب شہید کیا گیا تو بعض روایات کے مطابق انہی میں سے ایک نسخہ ان کی گود میں تھا۔ جس پر ان کے لہو کے قطرے گرے تھے۔ خط نبطی کی خصوصیات سے مزین قرآن کا یہ تاریخی نسخہ تاشقند میوزیم ترکستان میں آج تک موجود ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں کاغذ پر، جسے بردی کہا جاتا تھا، خطاطی کا آغاز ہو چکا تھا۔ کاغذ پر قدیم

پہلا حرف حضرت آدمؑ نے گیلی مٹی کے ٹکڑے پر لکھا تھا

ترین اسلامی تحریر آسٹریا کے دارالحکومت ویانا کے عجائب گھر میں موجود ہے۔ اس کا سن کتابت ۲۲ھ ہے۔ تحریر مدنی خط سے مشابہ ہے اور اس میں الف کا رجحان گولائی کی جانب نظر آتا ہے۔ دوسری قدیم ترین تحریر عبدالرحمٰن بن خیر کی قبر کا ایک کتبہ ہے۔ اس پر ۳۱ھ درج ہے۔ حضرت عثمان کے زمانہ خلافت میں کندہ کردہ یہ سنگی نمونہ تحریر ۱۹۲۹ء میں حسن آفندی ہواری نے مصر میں اسوان بند کے لئے کھدائی کے دوران دریافت کیا تھا۔ اس کی عربی تحریر میں الف خمدار نہیں بلکہ بالکل سیدھا لکھا گیا ہے۔

ابن خیر کی قبر کا کتبہ، ۳۱ ہجری

حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں بصرہ کو صوبائی دارالحکومت کے طور پر اہمیت حاصل ہوئی۔ تو عربی رسم الخط نے یہاں بھی تہذیبی مراحل طے کرنا شروع کئے۔ مشہور زمانہ فاضل متقی اور صوفی حسن بصری نے خط بصری میں کمال حاصل کیا۔ اسلام کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ خط مدنی کی اصلاح اور نوک پلک درست کرنے کا کام مختلف اقوام کے خطاطوں نے جاری رکھا۔ یہ اصلاح یافتہ خط، خطِ کوفی کہلایا۔ بعد ازاں یہ خط مقبول ہو کر سندھ سے مراکش تک پھیل گیا۔ مسلمان خطاطوں نے خط کوفی کو ہندسی شکل میں ڈھالا جو کہ دراصل سریانی خط کا خاصہ تھا۔ شروع شروع میں خطِ کوفی خط نقطوں سے مبرا ہوتا تھا۔ خطاطی کو باقاعدہ طور پر لفظوں سے مزین کرنے کا آغاز نصر بن عاصم اور یحییٰ بن یعمر نے کیا جبکہ خلیل بن احمد فراہیدی (۱۰۰-۱۷۰ھ) نے اعراب کا موجودہ طریقہ اختراع کیا۔ اس طرح عربی خط کو دنیا کا بہترین خط ہونے کا اعزاز حاصل ہو گیا اور اس کی مقبولیت تیزی سے پھیلنے لگی۔

مسلمانوں میں خطاطی کا عمدہ ذوق جمال خالصتاً اسلام کی دین ہے۔ اسلام نے مجسمہ

سازی، بت گری اور تصویر کشی کو ناپسند کیا ہے۔ اس لئے ابتداء ہی میں سے مسلمانوں نے ان فنون کے بجائے تجرید فکر سے کام لیتے ہوئے خطاطی میں تزئین حرف اور حسن تحریر پر توجہ دی۔ اس کے بعد فن تعمیر میں اپنی فنی اپج کو جولاں گاہ بنایا۔ مسلمانوں نے خطاطی میں قلم سے شاخوں اور پھولوں کی آمیزش کے ساتھ دیدہ زیبی پیدا کی اور ستاروں اور میناروں کی سی روشنی کے تاثر سے الفاظ کو سجانا شروع کیا۔ اس طرح خطاطی کے خوش نما نمونے عالم وجود میں آنے لگے۔

خلفائے امیہ (۱۳۲ تا ۱۴۰ھ) میں سے خلیفہ عبدالمالک بن مروان پہلا شخص تھا جس نے ساری مملکت اسلامیہ میں عربی زبان اور عربی کو سرکاری مراسلت کے لئے مخصوص کیا۔ اس کے ساتھ ہی عربی کاتبوں کی ضرورت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ اور بہتر سے بہتر خطاطی کا مظاہرہ کرنے کا جذبہ مسابقت پیدا ہوا۔ اس کے نتیجے میں خطاط تحسین خط اور کتابت کی جانب مائل ہونے لگے۔ تحسین خط کا اولین سہرا عبدالمالک بن مروان کے کاتب خاص قطبہ بن شبیب الطائی کے سر ہے۔ قطبہ ''المحرر'' کے لقب سے مشہور تھا۔ اس نے تحریر کے اصول وضوابط مقرر کرنے کے علاوہ حروف کی پیمائش اور ساخت کے لئے نوک قلم کو پیمانہ مقرر کیا۔ اس طرح خط کوفی کی روایتی سادگی میں خوبصورتی اور دلکشی کے بہت سے پہلو اجاگر ہونے لگے۔ فن کتابت میں خوش خطی کا یہ رجحان قرآن کی کتابت میں بھی جلوہ گر ہوا۔ خلیفہ ولید بن عبدالمالک کا کاتب خاص خالد ابی الہیاض وہ قلم کار تھا جس نے سب سے پہلے دیدہ زیب طرز میں قرآن حکیم کی خطاطی کی اور مسجد نبوی کی محراب پر سورۃ والشمس جلی قلم کے ساتھ لکھی۔ عہد بنی امیہ کے بعد عباسی دور حکومت آغاز پذیر ہوا۔ تو بلاد اسلامیہ میں بہت سی آزاد مملکتیں قائم ہوئیں۔ ہر مملکت میں خط کوفی کو اپنے اپنے انداز میں مزید حسن وخوبی سے آراستہ کیا گیا۔ اور متعدد دیدہ زیب خط ایجاد کئے گئے۔ ابو عبد اللہ سفاح کی خلافت (۱۳۲ تا ۱۳۶ھ) کا زمانہ فن خطاطی میں ضحاک بن عجلان کا زمانہ تھا۔ جبکہ ۱۵۴ھ میں اسحاق بن حماد نے شہرت حاصل کی۔ ان اہل فن کی کاوشات سے اس زمانے کے مقبول خط طومار میں نئی نئی جدتیں پیدا ہوئیں اور اس خط کو تزئینی انداز میں رقم کرنے کے لئے ۱۲ مختلف قلم ایجاد ہوئے۔ بنی عباس کے خلیفہ منصور عباسی کے دور میں ۱۵۸ھ کے دوران کرنسی سکے ڈھالے گئے ان پر اللہ اور محمد کے اسمائے مقدس خوبصورت خطاطی کی صورت میں ابھرے

خطاطی کو باقاعدہ طور پر نقطوں سے مزین کرنے کا آغاز نصر بن عاصم اور یحییٰ بن یعمر نے کیا

عبارت

درمیان میں ہے۔
لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ
اور اطراف میں ہے۔
ھوالذی ارسل رسولہ بالہدی
ودین الحق لیظہرہ علی
الدین کلہ۔

درمیان میں محمد
رسول
اللہ
اور اطراف میں یہ تحریر ہے۔
ضرب ھذالدینر سنۃ ثمان وخمسین مئۃ
(یہ دینار ۱۵۸ھ میں ضرب ہوا۔)
لا الہ الا اللہ

ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

۲۰۰ھ کے اردگرد کا زمانہ یوسف شجری کے نام لکھا گیا۔ یہ بڑا با کمال خطاط تھا۔ اس نے ایک خوبصورت اور لطیف قلم ایجاد کیا جسے مرور کبیر کا نام دیا گیا۔ شجری ۲۱۰ھ میں فوت ہوا تو اس کا ایک نامور شاگرد ابراہیم احول بجستانی فن خطاطی کی امامت کے مرتبے پر فائز قرار پایا۔ ابراہیم احول نے بہت سے قلم اختراع کیے۔ مثلاً خفیف، ثلث، خط مسلسل، خط غبار، خط مقص اور خط خورد وغیرہ۔ خلیفہ مامون کے زیر ہدایت استاد احول کی تحریر قسطنطنیہ میں قیصر روم کے سامنے پیش کی گئی تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اس کے حکم سے اس تحریر کو حسن و جمال کا نمونہ قرار دے کر گرجا کے دروازے پر آویزاں کر دیا گیا۔ خلیفہ معتمد کی ایک تحریر کو بھی ایسے ہی اعزاز سے نوازا گیا۔ اہل روم کا کہنا ہے کہ عربوں کی کسی شے پر انہیں اتنا رشک نہیں آتا جتنا ان کی خوبصورت تحریر پر آتا ہے۔ ۳۱۷ھ عبد الرحمٰن ناصر کے دور حکومت تک قرطبہ میں بے شمار نساخ، وراق، نقاش اور خطاط ناموری کی منازل طے کر چکے تھے۔ یہ سلسلہ بعد میں جاری رہا۔ اس دور کے خطاطوں میں سلیمان بن محمد معروف بہ ابن الشیخ (۴۴۰ھ) اساتذہ کے درجہ اولیٰ

خلیل احمد فراہیدی نے اعراب کا موجودہ طریقہ اختراع کیا

تک پہنچا۔ اس کے علاوہ خطاطی میں حسن قلم سے ابن رشیق قیروانی۔ عبدالعزیز۔ محمد القرشی۔ محمد بن یحیٰ صقلی کے نام تاریخ خطاطی میں آج بھی جگمگا رہے ہیں۔

بغداد کے ابن بواب نے خطاطی کے قواعد وضوابط کو بہتر بنا کر خطوط کی تہذیب کی اور اپنی عظمت کا لوہا منوا کر ۴۲۳ھ میں فوت ہوا اور وراثت میں شاگردوں کی ایک بڑی تعداد چھوڑی۔ ان میں سے سب سے شہرت یاقوت مستعصمی کے حصے میں آئی۔ یہ نابغہ روزگار فن کار قبلۃ الکتاب کہلایا۔ ۶۵۶ھ میں ہلاکو خان نے بغداد کو قتل عام کا نشانہ بنایا۔ اور خون کی ندیاں بہادیں۔ اس ہنگام میں یاقوت اپنے قلم اور سیاہی لے کر ایک ویران اور شکستہ مسجد میں جا چھپا۔ وہ اپنے ساتھ کاغذ اٹھا کر نہ لا سکا تھا۔ چنانچہ شوق خطاطی کی تکمیل کے لئے اپنی دستار پر لکھنا شروع کیا۔ دستار کو مینار سے باندھ کر پھیلایا اور دو بالشت موٹے (تقریباً 8انچ) حروف میں اس شان سے خطاطی کی کہ کاغذ اور کپڑے پر تحریر میں تمیز کرنا مشکل ہوگئی۔ یاقوت شاعر بھی تھا۔ اپنے ایک شعر میں اس نے لکھا: ''دوسروں کا خط اگر چشم یعنی آنکھ کی مانند ہے تو میرا خط آنکھ کی پتلی ہے۔''

یاقوت مستعصمی کے تحریر کردہ مخطوطات کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے قلم پارے ایک طرف اگر بغداد سے بلادِ مغرب تک پھیلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو دوسری طرف برصغیر کے کتب خانے اب تک انہیں سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ یاقوت کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک قرآنی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ (بھارت) میں دیکھنے والوں کے لئے فردوس نگاہ بنتا ہے۔ اس پر دو مغل حکمرانوں شاہ جہان اور اور جہانگیر کی ذاتی مہریں لگی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ اس نابغہ روزگار فنکار کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک اور نادر قرآن ذخیرہ نوادرات سرسالار جنگ حیدر آباد دکن میں موجود ہے اس پر بھی شہنشاہ جہانگیر کی مہر لگی ہوئی ہے۔

یاقوت کی زندگی ہی میں بغداد کا ورثہ تاتاریوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوگیا تھا۔ لیکن یاقوت کی خطاطی کا جادو نہ صرف یہ کہ سرچڑھ کر بولتا رہا۔ بلکہ بغداد سے نکل کر دوسرے اسلامی ممالک میں بھی اس کی تقلید کا شیوہ عام ہوا۔ بغداد میں یاقوت کے فن کو آگے بڑھانے والوں میں یوسف مشہدی (انتقال 700ھ) ارغون بن عبداللہ کاملی (انتقال 740ھ) مبارک شاہ

> الطائی نے تحریر کے اصول وضوابط مقرر کیئے اور حروف کی پیمائش اور ساخت کے لئے نوک قلم کو پیمانہ مقرر کیا

تبریزی زریں رقم (انتقال 760ھ) سید حیدر گندہ نویس اور شیخ زادہ سہروردی بغدادی شامل ہیں۔ گندہ نویس جلی خط میں لکھنے والے کو کہتے ہیں۔ اپنے دور میں سید حیدر شاہ سے بہتر جلی تحریر لکھنے والا اور کوئی نہ تھا۔ ان کے بعد ان کے بے شمار شاگردوں نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ ان میں سے عبداللہ حیرنی سب سے ممتاز قرار دیئے جاتے ہیں، شیخ زادہ سہروردی بغدادی کتبہ نویسی میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ اسے شش قلم خطاط مانا جاتا تھا اس کے قلم پارے ترکی کے کتب خانوں اور عجائب گھروں میں اب بھی دعوت نظارہ دیتے ہیں۔

خطاطی کی تاریخ میں آٹھویں صدی ہجری ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ جدید دنیا میں مقبول ترین خط نستعلیق اسی صدی میں نکھر اور بن سنور کر سامنے آیا تھا۔ یہ خط، خط نسخ اور خطِ تعلیق کی باہمی آمیزش سے عالم وجود میں آیا۔ اس خط کا ارتقاء ایران کے قلم کاروں کا مرہونِ منت ہے۔ تقریباً سب تذکروں میں خواجہ میر علی تبریزی کو خط نستعلیق کا بانی قرار دیا جاتا رہا ہے۔ خواجہ میر علی تبریزی پہلے سلطان احمد جلائر (784-813ھ) اور بعد میں امیر تیمور کے دربار سے وابستہ ہو گیا تھا۔ علامہ ابوالفضل نے آئین اکبری میں سب سے پہلے یہ انکشاف کیا کہ امیر تیمور کے دور سے بہت پہلے کے تحریر کردہ خط نستعلیق کے نمونے کچھ کتب خانوں میں موجود ہیں۔ 1905ء میں معروف متشرق مارگولیتھ نے ایک دستاویز دریافت کی جو خط نستعلیق سے قریبی مشابہت رکھتی ہے۔ اس دستاویز پر سن کتابت 401ھ درج ہے۔ اگر ان دعوؤں کو درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ جدید خط نستعلیق کا بانی خواجہ محمد علی تبریزی ہی ہے۔ کیونکہ اس حقیقت سے کسی بھی نقاد اور صاحب نظر کو انکار نہیں ہے کہ اسی خطاط نے خط نستعلیق کے قواعد و ضوابط مقرر کیے۔ اسے عوام میں مقبول بنانے کی وسیع تر کاوشات کیں اور اسے ایک منفرد شان و شوکت سے آراستہ کیا۔ خواجہ تبریزی کے بعد اس کے فرزند میر عبداللہ تبریزی نے خط نستعلیق کو مزید فروغ دیا۔ اس کا خطاب شکریں قلم تھا۔ باپ کو نستعلیق کا استاد اول تو بیٹے کو استاد دوئم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ خواجہ تبریزی نے 850ھ میں سمرقند میں وفات پائی جبکہ اس کے فرزند عبداللہ تبریزی نے 860ھ میں دنیا سے رخت سفر باندھا۔ اس وقت تک خط نستعلیق اپنے قدم جما چکا تھا۔ لہٰذا ان دونوں نامور اساتذہ کے بعد اس خط کو میر علی بردی (951ھ) اور بابا شاہ اصفہانی مالک ویلمی (969ھ) محمد حسین تبریزی اور میر عماد حسنی

استاد احول کی تحریر کو قیصر روم نے حسن و جمال کا نمونہ قرار دے کر گرجا کے دروازے پر آویزاں کروا دیا۔

(1034ھ) جیسے صاحبان کمال نے مزید حسین، مزید جاذب اور مزید دل کش بنانے میں تاریخی کردار ادا کیا۔ صاف اور واضح حروف، متناسب دائروں، مدوں اور کشوں کی وجہ سے یہ خط ساری دنیا میں حسین ترین اور جاذب ترین خیال کیا جاتا ہے جبکہ اس خط میں مصورانہ خوبصورتی پیدا کرنے کے بھی لامحدود امکانات موجود ہیں۔

خط نستعلیق کے بعد خط شکستہ ایجاد ہوا۔ تذکرہ نویسوں کا اتفاق ہے کہ یہ خط عہد صفوی میں ایران کے صوبہ ہرات کے حاکم مرتضیٰ قلی خان شاملو کی اختراع ہے۔ مرتضیٰ قلی خان شاملو کا انتقال 1100ھ میں ہوا۔ شاملو کی وفات کے بعد اس خط کو ہرات ہی کے خطاط محمد شفیع ہروی حسینی نے مزید مہذب کیا اور اس خط کے ارتقاء میں اس قدر عرق ریزی کا مظاہرہ کیا کہ اس دور کے لوگ اس خط کو خط شفیعا کہہ کر پکارنے لگے۔ محمد شفیع ہروی نے 1124ھ کے لگ بھگ وفات پائی۔

تاتاریوں نے جب خلافت عباسیہ کی بساط الٹائی تو قتل و غارت کا ایک طویل سلسلہ بھی شروع کیا۔ جس میں بڑے بڑے نامور علماء اور فنکاروں کو نہ صرف تہ تیغ کر دیا گیا۔ بلکہ نادر و نایاب کتابوں اور تاریخی مخطوطات کو بھی دریائے دجلہ کی سرکش موجوں کے حوالے کر دیا گیا۔ قانون قدرت ہے کہ ہر خزاں کے بعد بہار آتی ہے۔ فن خطاطی نے تاتاری خزاں کے بعد رفتہ رفتہ دنیا کے مختلف علاقوں میں الگ الگ بہار کی صورت ظہور کیا۔ اس طرح خطاطی کے متعدد دبستان عالم وجود میں آ گئے۔ ان دبستانوں میں دبستان ہرات، دبستان بخارا، دبستان ایران، دبستان ترکی اور دبستان مصر اپنی اپنی مخصوص انفرادی خصوصیات کی وجہ سے الگ الگ پہچان بنانے میں کامیاب ہوئے۔

خلافت عباسیہ کی بساط الٹی تو دنیا کے مختلف حصوں میں خطاطی کے متعدد دبستان عالمِ وجود میں آ گئے

دبستان ہرات:

دبستان ہرات کی بنیاد امیر تیمور کی مرہون منت ہے۔ امیر تیمور ایک صاحب نظر حکمران تھا۔ اس کا وزیر بدرالدین تبریزی خط ترسل یا خط تعلیق تحریر کرنے میں اپنے دور کا امام تھا۔ جبکہ سید عبدالقادر بن سید عبدالوہاب خط ثلث کی خطاطی میں یاقوت مستعصمی کے برابر گردانا جاتا تھا۔ اس نے خط ثلث میں امیر تیمور کے لئے ایک قرآن کتابت کیا تھا جو اپنی تہذیب و آرائش میں لاثانی قرار دیا جاتا ہے۔ یہ نسخہ جامع سلطان سلیم قسطنطنیہ میں آج بھی دعوت نگاہ دے رہا ہے۔ اسی زمانے میں ایک اور فنکار التون تاش بھی دربار سے منسلک تھا۔ وہ عقیق پتھر پر حروف کندہ کرنے میں لاثانی خیال کیا جاتا تھا اور ان سب سے بڑھ کر میر علی تبریزی کا مقام تھا۔ جس کا تذکرہ چند صفحات قبل تفصیل سے ہو چکا ہے امیر تیمور کی وفات کے بعد اس کے بیٹے شاہ رخ مرزا (807-850ھ) نے سمرقند کے بجائے افغانستان کے صوبے ہرات کو اپنا دارلحکومت بنایا۔ تو صاحبان علم و فن ہرات میں جمع ہو گئے جن میں اعلیٰ درجے کے خطاط اور خوش نویس بھی شامل تھے اس طرح دبستان ہرات باقاعدہ طور پر عالم وجود میں آیا۔ شاہ رخ مرزا کے تین بیٹے تھے۔ بایسنغر مرزا، ابراہیم مرزا اور الغ بیگ۔ یہ تینوں خود بھی ماہر خطاط تھے۔ ان کے تخلیق کردہ کتبات اور تحریریں

مختلف کتاب خانوں اور عجائب گھروں میں آج بھی موجود ہیں۔ مسجد گوہر مشہد کے محراب پر خط ثلث میں کی گئی استادانہ خطاطی امیر تیمور کے فرزند بایسنغر مرزا ہی کی یادگار ہے۔ اس کے ہاتھ کا مخطوطہ ایک قرآنی نسخہ لٹن لائبریری علی گڑھ بھارت میں محفوظ ہے۔ امیر تیمور سے لیکر سلطان حسین مرزا بالقرا تک ڈیڑھ سو سال کے دوران دبستان ہرات کا سکہ دنیائے علم و فن پر چلتا رہا۔ اس دبستان سے دیگر فنون کے علاوہ خطاطی کے بہت سے ماہرین ابھرے۔ دبستان ہرات سے متعلق مرزا جعفر تبریزی کو خط نستعلیق کا تیسرا بڑا استاد تسلیم کیا جاتا ہے۔ مرزا جعفر نے 833ھ میں شاہنامۂ فردوسی کا ایک نسخہ رقم کیا۔ جسے ''شاہنامۂ بایسنغر'' کے نام سے شہرت دوام حاصل ہے۔ یہ نسخہ تہران کے کتب خانے میں موجود ہے اور دنیا کی حسین ترین کتب میں شمار کیا جاتا ہے۔ جعفر تبریزی کا انتقال 860ھ کے لگ بھگ ہوا۔ اس کے شاگردوں میں سے ظہیر الدین اظہر تبریزی، عبد اللہ طباخ، عبدالحئی منشی استر آبادی، اور شیخ محمود زریں رقم بعد کے ادوار میں ممتاز اور معروف ٹھہرے۔ اظہر تبریزی کے ہاتھ کا تحریر کردہ خمسہ امیر خسرو دہلوی جو اس نے 877ھ میں تخلیق کیا تھا، پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ ظہیر الدین اظہر تبریزی کے شاگردوں میں سے خطاطی کے فن میں سلطان علی قائنی، سلطان علی مشہدی مالک دیلمی، عبد الرحیم، انیس خوارزمی اور حافظ حاجی محمد نے ناموری کی سند عام حاصل کی۔ مرزا جعفر تبریزی کا دوسرا نامور شاگرد عبداللہ طباخ ایک باورچی کا بیٹا تھا۔ لیکن اس نے خط نستعلیق، خط ثلث اور خط ریحان میں اس اعلیٰ درجہ کی مہارت کا مظاہرہ کیا کہ صاحبانِ نظر نے اسے یاقوت ثانی کے خطاب سے نوازا۔ عبداللہ طباخ کو اپنے استاد جعفر تبریزی کے انتقال کے بعد اس کا باضابطہ طور پر مسند نشین بنایا گیا۔ عبداللہ طباخ کے شاگردوں میں سے حافظ فوطہ، محمود کاتب اور عبداللہ بیانی مروارید نے خصوصی شہرت حاصل کی۔ عبداللہ بیانی مروارید کے بارے میں رسالہ قواعد الخطوط کے مصنف درویش محمد نے دعویٰ کیا ہے کی ''افشار غبار'' اور ''رنگ آمیز ابری'' کاغذ اس کی

خالد ابی الھیاض نے سب سے پہلے دیدہ زیب طرز میں قرآن حکیم کی خطاطی کی

خط شکستہ صوبہ ھرات کے حاکم مرتضی قلی خان شاملو کی اختراع ھے

عبداللہ بیانی مروارید کے قلم سے خطِ محقق، نسخ و رقاع، تحریر ۹۱۲ھ
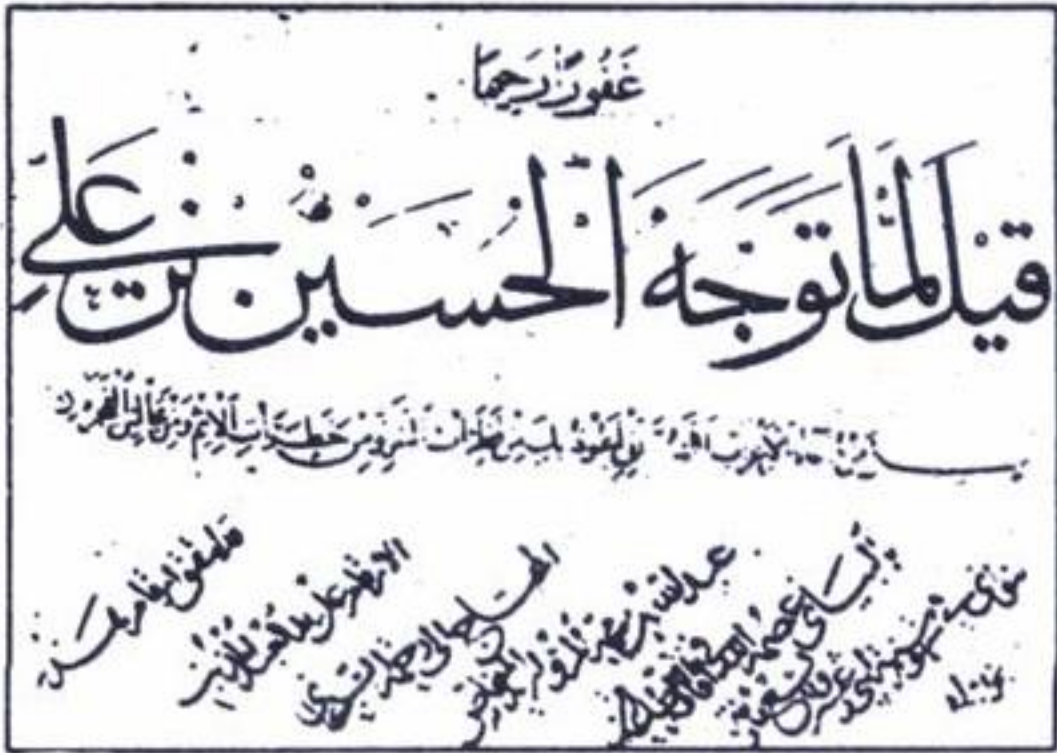
اختراع تھے۔ عبداللہ بیانی کا انتقال 922ھ میں ہوا۔ اس کے نمونہ ہائے تحریر استنبول اور ایران کے کتب خانوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ دبستان ہرات سے تعلق رکھنے والے ایک اور ممتاز خطاط کا نام سلطان علی مشہدی ہے۔ اسے خط نستعلیق لکھنے میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ خطاطی سے دلچسپی رکھنے والوں نے اسے مختلف القابات سے نواز رکھا تھا۔ سلطان علی مشہدی کو اس کے پرستار سلطان الخطاطین، قبلۃ الکتاب اور زبدۃ الکتاب جیسے اعلیٰ وارفع خطابات کے ساتھ پکارتے تھے۔ سلطان علی مشہدی نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ اسے خواب میں حضرت علیؓ کی زیارت نصیب ہوئی تھی۔ انہوں نے قلم ہاتھ میں تھمایا اور لکھنا سکھایا۔ سلطان حسین بن منصور (912-873ھ) نے سلطان علی مشہدی کے خط کی شہرت سن کر اسے اپنے کتب خانے میں بڑے معاوضے پر تعینات کر دیا۔ جہاں اس نے فن خطاطی پر ایک رسالہ صراط الخطوط تصنیف کیا۔ اس کے آثار تحریر بے شمار کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ مشہدی کے چھ شاگرد استاد زمانہ کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ جن میں سے سلطان محمد نور، محمد ابریشمی، سلطان محمد خزاں اور زین الدین محمود خطاطی کی تاریخ میں ممتاز مقام کے حامل ہیں۔ سلطان محمد مشہدی 936ھ میں اس جہان فانی سے رخصت ہوا۔ سلطان محمد نور خط خفی کی تحریر میں ماہر تھا۔ کچھ نقادوں نے اسے اپنے ہم عصر استاد سلطان محمد خزاں سے برتر قرار دیا ہے جبکہ کچھ صاحبان نظر اسے اظہر ثانی قرار دیتے ہیں۔ 911ھ سے اولاد تیمور کی حکمرانی کا زوال شروع ہوا۔ جو 917ھ تک اپنی انتہا کو پہنچ گیا

اور اس پرشکوہ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ آل تیمور میں سے ایک شہزادہ ظہیرالدین بابر ہندوستان کی طرف کوچ کر گیا۔ باقی گوشۂ گمنامی یا موت کی آغوش میں چلے گئے۔ اس طرح دبستان ہرات کی بزم خط ہمیشہ کیلئے اجڑ کر رہ گئی۔

دبستانِ بخارا:

آل تیمور کے زوال کے بعد 917ھ میں نئے حکمران شیبانی خان ازبک کو صفوی خاندان نے شکست دے کر ہرات پر قبضہ کر لیا۔ شیبانی خان کے بھائی عبیداللہ خان نے 935ھ میں صفوی حکمرانوں سے ہرات کو دوبارہ چھین لیا۔ لیکن یہاں قیام کرنے کے بجائے نامور فنکاروں کو ساتھ لے کر بخارا چلا گیا۔ ان اہل علم و فن کی سرگرمیوں نے دبستان بخارا کی بنیاد رکھی۔ عبیداللہ خان کے ساتھ جن خطاطوں نے بخارا کو مرکز فن بنایا۔ ان میں استاد میر علی ہروی، میر سید آہوِ چشم اور محمود بن اسحاق شہابی کے نام نمایاں ہیں۔ 942ھ میں بخارا شہر میں مدرسہ میر عرب تعمیر ہوا۔ اس مدرسے پر میر علی ہروی نے قطعہ تاریخ لکھا۔ سلطان ابوالغازی عبد العزیز خانؒ 947-957ھ نے میر علی ہروی کو اپنے عظیم کتب خانے کے نگرانوں میں شامل کر لیا۔ میر علی ہروی نے نستعلیق خطاطی میں خاص مہارت حاصل کی۔ تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ

محمود شہابی، خط نستعلیق
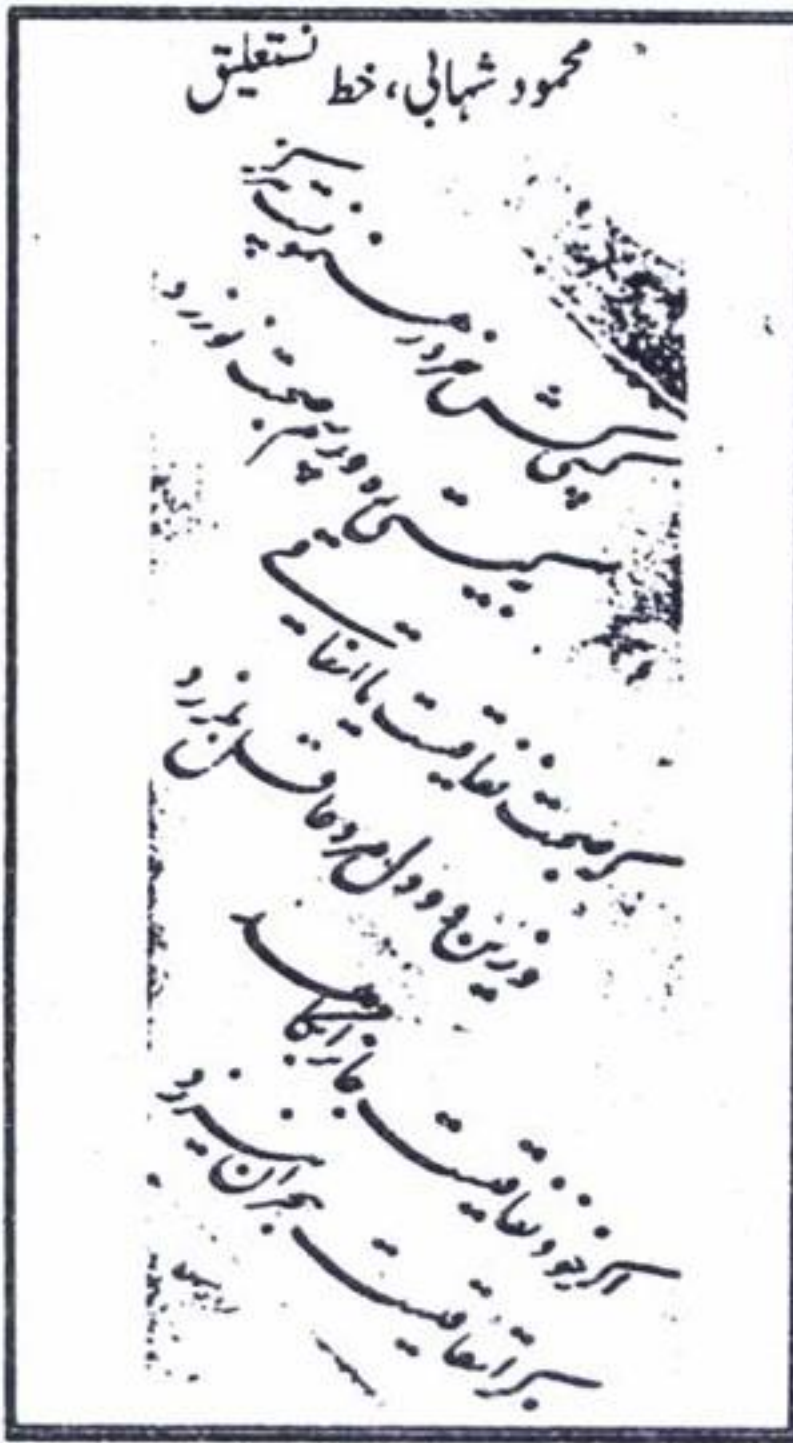
بابا شاہ اصفہانی اور شاہ محمود نیشا پوری کے علاوہ اور کوئی نستعلیق نگار میر علی ہروی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا یوسف زلیخا کا ایک مصور نسخہ دستیاب ہوا ہے۔ اس میں مصوری اور خطاطی کی نادر اشکال موجود ہیں۔ جبکہ ان کی تحریر کردہ بوستان سعدی کا نسخہ کابل میں اور مثنوی گئی چوگان کا قلمی نسخہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں رکھا ہوا ہے۔ میر علی ہروی کے علاوہ محمود شہابی، سید احمد احسنی مشہدی اور میر کلنگی دبستان بخارا کے نمائندہ خطاط تصور کیے جاتے ہیں۔ میر کلنگی امیر بخارا عبد اللہ ثانی (1001-964ھ) کے کتب خانے کا کتاب دار تھا۔ اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان حافظ کا ایک یادگار اور خوبصورت نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں دیکھا جا سکتا ہے۔ میر کلنگی کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں لاہور کی سیاحت بھی کی تھی۔ میر کلنگی 983ھ میں عالم فانی سے عالم جاودانی کو سدھارا۔

دبستان ایران:

دبستان بخارا کے پہلو بہ پہلو ایرانی نژاد قلمکاروں نے دنیائے خطاطی میں اپنا نقش اجاگر کیا۔ تبریز کے خطاطوں کی پذیرائی میں دربار شاہی بھی پیش پیش تھا۔ تبریز میں اعلیٰ درجے کے خطاطین کی اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ ایک واقعہ سے ہوتا ہے کہ 920ھ میں صفویوں کے درمیان چالدران کے مقام پر زبردست معرکہ آرائی ہوئی۔ اس جنگ میں ایرانی فوج کو شکست کا خطرہ لاحق ہوا تو تبریز کے حکمران شاہ اسماعیل صفوی نے اپنے دربار سے منسلک دو فنکاروں کو محفوظ غاروں میں چھپا دیا تا کہ جنگ کی تباہی اور قتال کی زد میں آ کر ان نابغہ روزگار شخصیات

کی زندگی کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔ جن دو فنکاروں کے لئے یہ غیر معمولی اقدام کیا گیا۔ ان میں سے ایک اس وقت کا نامور خطاط شاہ محمود کاتب اور دوسرا مشہور عالم فنکار بہزاد نقاش تھا۔ 930ھ میں شاہ اسماعیل صفوی کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے بہرام مرزا نے تاج حکومت اپنے سر پر پہنا۔ مرزا بہرام نہ صرف شاعر تھا بلکہ خطِ نستعلیق کا ماہر بھی تھا۔ اس نے اپنے دور میں نامور خطاطوں کے مخطوطہ قطعات کا مجموعہ مرتب کروایا۔ جو مرقع بہرام مرزا کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ اور خطاطی کے فن پر تحقیق کرنے والوں کے لئے ایک نایاب دستاویز کا درجہ رکھتا ہے۔ مرزا بہرام 956ھ کے دوران عالم جوانی میں اس جہان رنگ و بو سے منہ موڑ گیا۔ اس کے بعد شہزادہ سام مرزا حریر آرائے حکومت ہوا۔ اس شہزادے نے بھی اپنے بھائی بہرام مرزا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شاعروں، ادیبوں، خطاطوں اور فنکاروں کا تذکرہ مرتب کروایا۔ جو تحفۂ سامی کے نام سے معروف ہے۔ مرزا سام کے بعد مرزا بہرام کے بیٹا ابراہیم مرزا برسر اقتدار آیا۔ یہ شہزادہ فن نوازی میں صفوی خاندان کا امتیاز قرار دیا جا سکتا ہے۔ ابراہیم مرزا جامع الصفات شخص تھا۔ وہ خود نہ صرف یہ کہ علم ریاضی، عروض، طب، موسیقی، علم انساب، علم الحدیث، تجوید قرات اور صرف و نحو وغیرہ میں طاق تھا۔ بلکہ خطاطی، نقاشی، تصویر سازی، زرافشانی، زرگری وغیرہ میں بھی قدرت نے اسے ید طولیٰ سے نوازا تھا۔ اس کی شاعری پر مبنی ایک ترکی دیوان جس میں تین ہزار اشعار موجود ہیں، تہران کے سرکاری کتب خانے میں اب بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے ذاتی کتب خانے میں بہت سے خطاط اور نقاش ملازم تھے۔ مرزا ابراہیم نے خوش نویسوں کے لکھے ہوئے بہت سے خطوط و قطعات کے علاوہ لگ بھگ چار ہزار خوبصورت قلمی کتب اپنی یادگار کے طور پر چھوڑیں ان میں مشہور زمانہ خطاط میر علی ہروی کی بہت سی نگارشات بھی شامل ہیں۔ سلطان مرزا ابراہیم نے خطاطی کے علم میں مالک دیلمی سے اکتساب فیض کیا تھا۔ سلطان مرزا ابراہیم کا انتقال 984ھ میں ہوا۔

صفوی شہزادوں اور حکمرانوں کے علاوہ دبستان ایران کے حوالے سے مالک دیلمی ایک اہم نام ہے۔ مالک نے ایران کے شہر قزوین میں دسویں صدی ہجری کی چوتھی دہائی کے دوران اس وقت کے ممتاز خطاطین رستم علی اور حافظ بابا جان سے خط نستعلیق کی تعلیم حاصل کی۔ یہ دونوں خطاط سلطان علی مشہدی کے شاگرد تھے۔ 964ھ میں مالک دیلمی نے مشہد میں شاہ طہماسپ صفوی کے نو تعمیر محل پر کتبات رقم کیے۔ بعد ازاں قزوین کے چہل ستون پر حافظ

میر کلنگی نے اپنی زندگی میں لاہور کی سیاحت بھی کی تھی

شیرازی کے غزلیات خطِ نستعلیق میں کندہ کیں۔ امیر حسین بیگ کے تیار کردہ ایک مرقع کا مقدمہ مالک دیلمی کے دست ہنر کا شاہکار ہے۔ یہ مرقع آجکل لینن گراڈ کے ایک کتب خانے میں عاشقان خطاطی کو دعوتِ نظارہ دیتا ہے۔ مالک دیلمی نے 969ھ میں تبریز میں وفات پائی۔

مالک دیلمی کے ہاتھ سے نستعلیق کے نمونے

محمد حسین تبریزی کا شمار بھی دبستان ایران کے ممتاز خطاطوں میں کیا جاتا ہے۔ اس کا تعلق آزربائیجان سے تھا۔ اس نے سید احمد مشہدی اور میر حیدر سے خط نستعلیق کی تربیت حاصل کی اور اس کے بعد مالک دیلمی کی شاگردی اختیار کی۔ خطۂ خراسان کے خوش نویس اپنے سامنے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے لیکن محمد حسین تبریزی کی فنی عظمت کو وہ بھی تسلیم کرتے تھے۔ محمد حسین تبریزی کی تحریر میں استحکام اور سرعت دونوں صفات موجود تھیں جو فن خطاطی میں بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہیں۔ تبریزی نے 985ھ میں قزوین میں جہان فانی کو الوداع کہا۔

مالک دیلمی کے بعد کا دور شاہ اصفہانی کا دور تصور کیا جاتا ہے۔ بابا شاہ اصفہانی کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ اس نے نستعلیق خطاطی میں ایک خاص شیوہ اختراع کیا تھا۔ اس شیوہ میں پختگی، استحکام، دلکشی کے عناصر نظروں کے لئے ایک خاص کشش کا باعث بنتے تھے۔ معاصرین اور متاخرین اس بات پر متفق ہیں کہ شاہ بابا اصفہانی خط نستعلیق کا ایک صاحب طرز اور ماہر خطاط تھا۔ بابا شاہ اصفہانی تحریر کردہ کچھ قطعات استنبول کے دارالآثار میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ شاہ اصفہانی کے ہاتھ کا مخطوطہ ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کتب خانے میں بھی موجود ہے۔ شاہ بابا اصفہانی نے 996ھ میں انتقال کیا۔

دبستان ایران کا کوئی تذکرہ عماد الملک میر عماد بن ابراہیم حسنی سیفی کے بیان کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ میر عماد حسن کا تعلق بھی قزوین سے تھا۔ اس نے تبریز میں محمد حسین تبریزی سے فن

خطاطی میں اکتساب فیض کیا۔ آزر بائیجان کے والی فرہاد خان قرامان نے اسے شعبۂ کتابت میں تعینات کیا۔ فرہاد خان 1007ھ میں قتل کر دیا گیا۔ تو میر عماد دل برداشتہ ہو کر قزوین میں گوشہ نشین ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد دربار اصفہان سے بلاوے پر شاہ عباس صفوی کے ہاں ملازمت کر لی۔ میر عماد نے بھی شاہ بابا اصفہانی کی تقلید میں فن نستعلیق کو نئی رفعتیں عطاء کیں اور ایک نئے شیوہ کو متعارف کروایا اس کے نئے طرز تحریر میں شاہ بابا اصفہانی کی نرم روی اور میر علی ہروی کی استواری یکجان ہو کر قلب و نظر میں ایک احساس جمال پیدا کر دیتی تھیں۔ وہ قلم خفی کو نمکین اور قلم جلی کو استوار اور شیریں لکھتا تھا۔ اس کے زمانے میں شعراء حضرات میر عماد سے اپنے دیوانین کی کتابت پر فخر کیا کرتے تھے۔

میر عماد ایک غیرت مند اور خوددار فنکار تھا۔ ایک مرتبہ شاہ اصفہان شاہ عباس صفوی نے میر عماد کو ستر اشرفیاں بھجوائیں اور شاہنامہ فردوسی لکھ کر دینے کی فرمائش کی۔ میر عماد نے اشرفیاں رکھ لیں اور ایک سال بعد شاہی قاصد کے ہاتھ ستر اشعار بادشاہ کے بھجوا دیئے۔ اور ساتھ یہ پیغام بھی دیا کہ شاہی عطیہ جس قدر تھا اس قدر کام کر دیا گیا ہے۔ قاصد کی زبانی پیغام سن کر بادشاہ کا مزاج سخت برہم ہوا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اشعار میر عماد کو واپس کر دیئے جائیں اور ستر اشرفیاں اس سے وصول کر لی جائیں۔ میر عماد ایک سال کے دوران تمام اشرفیاں خرچ کر چکا تھا۔ اس نے اپنا ایک ایک شعر الگ الگ کاٹ کر شاگردوں میں تقسیم کر دیا۔ شاگردوں

نے فی شعر ایک ایک اشرفی اپنے استاد کو پیش کی۔ میر عماد نے تمام اشرفیاں جمع کر کے بادشاہ کو واپس بھیج دیں۔ بادشاہ نے یہ سارا ماجرا سنا تو اور زیادہ برافروختہ ہو گیا اور با آواز بلند کہا۔

''ہے کوئی جو اس کا سر کاٹ کر لائے''

میر عماد حسنی کے قلم سے خط نستعلیق کا نمونہ

چند ہی روز بعد صبح کاذب کے وقت میر عماد کو قتل کر دیا۔ میر عماد کی عوامی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ شہریوں اور عمائدین نے بڑی تعداد میں نماز جنازہ میں شرکت کی اور تعزیتی محافل منعقد کیں، میر عماد کے قتل کی خبر جب ہندوستان میں شہنشاہ جہانگیر تک پہنچی تو یہاں بھی مجلس تعزیت منعقد کی گئی۔ اس مجلس میں شہنشاہ جہانگیر نے کہا کہ اگر میر عماد کو قتل کرنے کے بجائے ہمارے حوالے کر دیا جاتا تو ہم اسے اس کے وزن کے بدلے موتیوں کے عوض بخوشی لے لیتے۔ میر عماد کا قتل 1034ھ میں ہوا۔ اس کے نامور شاگردوں میں عبدالرشید دیلمی۔ ابوتراب اصفہانی اور نورالدین نے فن خطاطی میں شہرت حاصل کی۔ میر عماد کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مخطوطات ترکی اور ایران کے علاوہ پاکستان میں بھی موجود ہیں۔ میر عماد اور اس کے شاگردوں کے بعد دبستان ایران میں حسن خان شاملو فن خطاطی کے میدان میں استادی کے درجہ پر پہنچا۔ وہ خراسان اور ہرات کے حاکم کے عہدہ پر بھی فائز رہا۔ جلی حروف میں خط نستعلیق لکھنا اس کا خاص فن تھا۔ امام رضا کے مزار پر اس کے قلم سے لکھی ہوئی جلی حروف میں ایک رباعی آویزاں کی گئی تھی۔ حسن خان شاملو کا انتقال 1100ھ میں ہوا۔

دبستانِ ترکی:

عباسی دورِ حکومت زوال پذیر ہوا تو آل عثمان کے زیرِ نگیں ترکی میں ایک عظیم الشان اسلامی ریاست نے اپنا سکہ جمایا۔ خلافت عثمانیہ میں خطاطی کے فن نے یاقوت مستعصمی کے شاگردوں کی شب و روز محنت سے مقبولیت کی منازل طے کیں۔ یاقوت کے شاگرد اپنے استاد کی طرح خط نسخ کے شیدائی تھے۔ چنانچہ بلادِ عثمانیہ میں اسی خط نے اپنا پہلا نقش قائم کیا۔ اس کے بعد خط تعلیق اور آخر میں خطِ نستعلیق نے اپنا جادو جگایا۔

سلاطین عثمانیہ خود بھی خطاطی کے فروغ میں دل چسپی رکھتے تھے۔ سلطان مراد ثانی (824-866ھ) سلطان مراد ثالث (982-1002ھ) اور سلطان سلیمان وغیرہ نے خطِ نسخ میں مہارت حاصل کی۔ جبکہ سلطان مراد چہارم (1042-1044ھ) خط نستعلیق کا ماہر خطاط تھا۔ دبستان ترکی سے منسلک شہرت یافتہ خطاطوں میں شیخ حمداللہ اماسی کا نام سرفہرست ہے۔ اس نے ہجرت کے ذریعے ترکی کے شہر اناضول میں مستقل رہائش اختیار کی۔ دبستان ایران کے معروف خطاط عبداللہ صیرفی کے ایک شاگرد خیر الدین مہرعشی سے مراسم کے نتیجہ میں اماسی خطاطی کی طرف مائل ہوا اور اسی کی تربیت کے نتیجے میں خط نسخ میں نہ حرف مہارت حاصل کی بلکہ اس کی تجدید میں بھی نمایاں پیش رفت کا مظاہرہ کیا۔ خطاطی میں شیخ احمداللہ اماسی کے فن کی تحسین کرتے ہوئے 886ھ میں سلطان بایزید نے اماسی کو استنبول میں بلا کر فن خطاطی کی خدمت پر معمور کیا۔ یہاں اماسی نے 47 مرتبہ پورا قرآن اپنے قلم سے تحریر کیا۔ اس کی لکھی ہوئی الگ الگ سینکڑوں سورتیں بھی اس کے فنی جمال اور کمال کا مظہر ہیں۔ حدیث کی مشہور کتاب مشارق الانوار بھی اماسی ہی کے قلم کا شہکار ہے۔ اماسی کے شاگردوں میں محی الدین، جمال الدین اماسی اور عبداللہ ابارہ نے شہرت حاصل کی۔ شیخ حمداللہ اماسی نے ایک روایت کے

مطابق 96 برس کی عمر میں 926ھ کے دوران وفات پائی۔ بعد میں آنے والے ترک خطاطوں کی اکثریت نے اماسی کے فن سے فیض حاصل کیا۔ اس لحاظ سے اماسی کو ترک خطاطین کا قطب بھی کہا جاتا ہے۔

اسی زمانے میں ایک اور خطاط درویش حسام الدین نے بھی شہرت حاصل کی۔ حسام الدین خطِ نستعلیق میں مہارت رکھتا تھا۔ نقادانِ فن کی رائے ہے کہ اگر ترک خطاطوں میں سے کسی نے دبستانِ ایران سے وابستہ استادوں کی صحیح پیروی کی ہے تو وہ درویش حسام الدین ہے۔ حسام الدین کا انتقال 1000ھ کے لگ بھگ ہوا۔

شیخ حمد اللہ اماسی کے بعد ترک خطاطوں میں حافظ عثمان بن علی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ حافظ عثمان کا تعلق قسطنطینیہ سے تھا۔ حفظِ قرآن کے بعد اس نے ایک مقامی استاد درویش علی خطاط کی شاگردی اختیار کی اور 18 سال کی عمر میں خط کی تعلیم مکمل کی۔ حافظ عثمان نے شروع شروع میں حمد اللہ اماسی کی روش کو اپنایا۔ بعد ازاں خطِ نسخ میں اپنی ایجاد کردہ جدّتوں کے سبب خود بھی ایک شیوۂ خطاطی کا بانی قرار پایا۔ خلافتِ عثمانیہ کے ایک وزیر مصطفیٰ پاشا کی دستگیری کے سبب اس کی شہرت اور نام پوری ریاست پھیل گیا، اور بالآخر اسے سلطان احمد خان ثالث اور سلطان مصطفیٰ خان ثانی کا استاد بننے کا اعزاز حاصل ہوگیا۔ حافظ عثمان ایک درویش صفت انسان تھا۔ ہر بدھ کے دن جہاں وہ امراء اور اہلِ اختیار کو فنِ خطاطی کی تعلیم دیتا تھا۔ وہاں ہر اتوار کے دن غرباء اور مساکین کو بلا معاوضہ اس فن کی تربیت عام کرتا تھا۔ وہ سرِ راہ چلتے چلتے کسی موڑ پر رک کر اور زمین پر بیٹھ کر بھی کسی طالبِ فن کی اصلاح میں باک محسوس نہیں کرتا تھا۔ اس طرح اسے ترکی میں خطِ نسخ کے مقبول ترین امام کا درجہ حاصل ہوگیا۔ حافظ عثمان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے 25 قرآن اس وقت بھی موجود ہیں۔ حافظ عثمان سے قرآن کی کتابت کروانے کے لئے قدردان منہ مانگی اجرت ادا کرنے پر تیار رہتے تھے۔ چالیس برس تک فنِ خطاطی کو اپنی فنی مہارت سے مالا مال کرنے کے بعد یہ نابغۂ روزگار خطاط 1110ھ میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہوا۔

ترکی میں نام کمانے والے ایک اور خطاط کا نام درویش عبدی ہے۔ اس کا اصل نام سید عبداللہ بخاری تھا۔ وہ ایران کے شہر اصفہان کا رہنے والا تھا۔ اصفہان میں اس نے خطِ نستعلیق کے مشہورِ عالم استاد میر عماد حسنی سے خطاطی کی تربیت حاصل کی۔ بعد ازاں سیاحت کی غرض سے

حافظ عثمان کو ترکی میں خط نسخ کے مقبول ترین امام کا درجہ حاصل ھے .

ترکی پہنچا۔ تو اسکے فن سے متاثر ہو کر سلطان مراد چہارم نے اسے اپنے دربار سے وابستہ کر لیا۔ ترکی میں خطِ نستعلیق کی متعارف کروانے کا سہرا درویش عبدی کے سر ہے۔ ترکی حکومت کے ایک وزیر محمد پاشا کی فرمائش پر درویش عبدی نے شاہنامہ فردوسی کا ایک دیدہ زیب نسخہ تیار کیا تھا۔ درویش عبدی نے بہت سے شاگردوں کی تربیت کی اور سلطان مراد کے خرچ پر حج کی سعادت حاصل کرنے کے بعد 1057ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے ایک شاگرد محمود چلپی نے اپنے استاد کے فن کو آگے بڑھایا اور خط نستعلیق کے ساتھ ساتھ خط شش گانہ خط ثلث اور خط نسخ کی تعلیم حافظ امام محمدؒ سے حاصل کی۔

درویش عبدی، خط نستعلیق

فن خطاطی میں حسن سلیقہ ترتیب اور خط شناسی جیسے اوصاف کے حوالے سے دیکھا جائے تو دبستان ترکی میں ولی الدین آفندی کا نام نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ یہ خط نستعلیق کو جلی اور خفی حروف میں بہت مہارت سے لکھتا تھا۔ اور اپنی تحریر میں جمالیاتی زاویوں کو نمایاں کرتا تھا۔ آفندی کے تحریر کردہ تین مرقعہ جات جامعہ استبول کے کتب خانے میں جبکہ اسکے لکھے ہوئے متعدد قطعات ترکی کے عجائب گھروں موجود ہیں۔ خطاطی میں نفاست اور استحکام کے حوالے سے محمد عبدالعزیز رفاعی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ عزیز رفاعی نے خط کی تربیت حاجی احمد عارف فلبوی سے حاصل کی جبکہ خط نستعلیق کے قواعد وضوابط حسنی قرین آباد سے سیکھے۔ مصر کے حاکم فواد اول نے عبدالعزیز رفاعی کے حسن خط کے بارے میں سنا تو اسے قاہرہ آنے کا پیغام بھیجا۔ عزیز رفاعی 1340ھ میں قاہرہ پہنچا۔ تو فواد اول نے اس کی بہت عزت کی۔ یہاں عزیز رفاعی نے 6 ماہ کی محنت شاقہ سے نہایت نفیس خط

ولی الدین افندی نے خط کے جمالیاتی زاویوں کو نمایاں کیا

میں پورے قرآن کی خطاطی مکمل کی۔ اس کے بعد مسلسل آٹھ ماہ کی کاوش سے اپنے تحریر کردہ مسودے کی تذہیب اور جلد بندی کا کام پایہ انجام کو پہنچایا۔ اس حسین وجمیل قرآنی نسخے کو دیکھ کر فواد اول نے عزیز رفاعی کو خطیر انعام و اکرام سے نوازا اور عزیز رفاعی کے فن کا اعتراف کرتے ہوئے خطاطی کے تعلیم کے لئے ایک خاص مدرسہ قائم کر کے عزیز رفاعی کو اس کا صدر استاد مقرر کر دیا۔ عزیز رفاعی نہ صرف یہ کہ خط شش گانہ کا ماہر تھا بلکہ اس کی طبیعت نئی نئی اختراعات کی جانب بھی مائل تھی۔ اس نے 14 مختلف قلم نکالے تھے اور سب میں مہارت کے ساتھ لکھتا تھا۔ خطاطی کے ساتھ ساتھ عزیز رفاعی تجلید، تذہیب۔ ترمیم اور نقاشی وغیرہ میں بھی دستِ کمال کا حامل تھا۔ عبدالعزیز رفاعی کا انتقال 1353ھ میں ہوا۔

عبداللہ زہدی دبستان ترکی کا آخری بڑا خطاط مانا جاتا ہے۔ عبداللہ نے قاضی عسکر آفندی عزت سے خط کی بنیادی تربیت حاصل کی۔ سلطان عبدالحمید نے روضہ رسولؐ کی بڑے پیمانے پر مرمت کروائی۔ اور مرمت کے بعد وہاں قرآن کی آیات لکھوانے کے لئے عبداللہ زہدی کی خدمات حاصل کیں۔ عبداللہ نے یہ کام خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ واپسی پر مصر میں اسمٰعیل پاشانے اسکے فن کی شہرت سن کر اسے قاہرہ میں روک لیا اور مدرسہ خدیویہ کا استاد بنا دیا۔ بعدازاں عبداللہ غلاف کعبہ پر آیات لکھنے پر مامور ہوا اور نہایت حسنِ خط میں قرانی آیات غلاف کے کپڑے پر لکھیں۔ اسکا انتقال مصر میں 1296ھ کو ہوا۔

عبد اللہ زھدی نے غلاف کعبہ پر آیات قرآنی تحریر کیں

1432ھ میں مصطفیٰ کمال پاشانے ترکی میں خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کر دیا۔ اور ایک حکم کے ذریعے ترکی میں عربی زبان اور عربی رسم الخط کو ممنوع قرار دے دیا۔ مصطفیٰ کمال پاشانے عربی زبان اور رسم الخط کے بجائے رومن رسم الخط کو اختیار کرنے کے احکامات جاری کئے۔ اس طرح گذشتہ چھ صدیوں سے مسلسل ارتقاء پذیر عربی رسم الخط کو ترکی سے جلاوطن کر دیا گیا۔

دبستان مصر:

گذشتہ سطور میں بغداد کے نابغہ روزگار خطاط ابن بواب اور اس کے نامور شاگرد

عبد الرحمان بن صائغ پھلا شخص ھے۔ جس نے شاگردوں کو باقاعدہ اسناد جاری کرنے کا آغاز کیا

یاقوت مستعصمی کا ذکر ہو چکا ہے۔ تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کی ثقافت اور سیاست اجڑ جانے کے بعد جن فنکاروں اور خطاطوں نے مصر کا رخ کیا اور اپنی جدت طرازیوں سے دبستان مصر کی بنیاد ڈالی۔ ان میں ابن بواب کے فرزند ارجمند علی ابن بواب کا نام سرفہرست ہے۔ علی کے علاوہ مصر میں نقل مکانی کرنے والے خطاطین میں عزالدین عبدالسلام، علامہ ابن منظور احسان العرب، شہاب الدین تیغا ئیشی، امام ابن حاجب، مجدالدین فیروز آبادی جیسے صاحبان قلم شامل تھے۔ ان سب خطاطین کے سلسلہ کا جائزہ لیا جائے تو یہ ابن بواب اور پھر اس سے پہلے ماضی میں چلتا ہوتا ہوا ابن مقلہ تک جا پہنچتا ہے۔ ابن مقلہ کی فنی عظمتوں کا بیان بھی ماقبل ہو چکا ہے۔ دبستان مصر سے وابستہ خطاطین میں محمد بن عبدالمالک، زینب شہدہ، امین الدین یاقوت، ولی العجمی، عفیف، عمادالدین، شمس الدین بن ابی رقبہ، شہاب الدین غازی، محمد وسیمی، محمد بن کزل عبادی، جمال الدین ہمیتی، شیخ یاسین، محمد بن حسن طیبی، محمد بن علی رفناوی اور قلقشندی وغیرہ شامل ہیں۔ دبستان مصر کے نمایاں ترین خطاطین میں ابوعلی جوینی کو ایک منفرد خطاط تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کا پورا نام ابوعلی حسن بن علی ابراہیم ہے جبکہ اسے فخر الملک جیسے وقیع لقب سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ یہ نیشاپور کے ایک گاؤں جوین میں پیدا ہوا۔ سلطان نورالدین زنگی کے دور حکومت میں بغداد سے شام اور پھر وہاں سے مصر آ گیا۔ مصر میں اس کے فن کو اصل پہچان اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ ابوعلی جوینی خط نستعلیق میں شیوۂ بواب کا پیروکار تھا۔ نقادان فن کا کہنا ہے کہ مصر میں طرز بواب پر ابوعلی جوینی نے جو خطاطی کی ہے اس کے مماثل کام آج تک مصر میں سامنے نہیں آیا ہے۔ ابوعلی جوینی کا انتقال 584ھ کے لگ بھگ ہوا۔ اس کے دست ہنر سے تخلیق شدہ شاہکار اب تک قاہرہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ ابوعلی جوینی کے بعد عبدالرحمان بن صائغ پہلا شخص ہے۔ جس نے اپنے شاگردوں کو باقاعدہ اسناد جاری کرنے کا آغاز کیا۔ عبدالرحمان کے سند یافتہ خطاط اپنے

عبدالرحمن بن صائغ

خط ثلث

مخطوطہ قطعات پر اپنے نام کے ساتھ بہ اہتمام اپنی سند کا حوالہ بھی درج کرنے لگے۔ عبد الرحمان نے سلطان برقوق کیلئے دل کش تزئینی خطاطی میں قرآن کا ایک نسخہ تیار کیا تھا جو اس وقت دارالکتب مصریہ قاہرہ میں رکھا ہوا ہے۔ یہ قرآن خط محقق میں رقم کیا گیا ہے۔ اس پر سال کتابت 801ھ درج ہے۔ عبدالرحمان نے ماضی کے نامور خطاطوں ابن عفیف، شہاب الدین غازی، ولی العجمی اور اپنے استاد محمد ویسی کے شیوہ ہائے نگارش پر عبور حاصل کرنے کے بعد اپنا ایک خاص شیوہ جاری کیا تھا جو اس کی لازوال شہرت کا باعث بنا۔ عبدالرحمان ابن صائغ نے اپنے زمانے میں مسجد نبوی کی دیوار پر سورۂ فتح بہت خوبصورت انداز میں تحریر کی تھی جو ایک عرصہ تک زائرین کی نظروں اور آنکھوں کو ایک جمالیاتی طراوٹ سے نوازتی رہی۔ اس نے مختصر حجم کا قرآن لکھنے کے علاوہ فن خطاطی پر ایک کتاب بھی سپرد قلم کی تھی جو 1967ء میں ''تحفہ اولی الالباب'' کے نام سے تیونس سے شائع ہوئی۔ عبدالرحمان ابن صائغ 845ھ کے دوران قاہرہ میں فوت ہوا۔ دبستان مصر کے نمائندہ خطاطین شیخ ابوالعباس احمد قلقشندی، محمد بن حسن طیبی، ابو علی جوینی اور عبدالرحمان ابن صائغ کی مستحکم کاوشات کا نتیجہ یہ نکلا کہ آئندہ تقریباً نصف صدی تک مصر کے میدان خطاطی میں ابن بواب کے شیوۂ نستعلیق کا طوطی بولتا رہا۔

برصغیر پاک و ہند میں خطاطی کا ارتقاء:

برصغیر پاک و ہند میں خطاطی کی تاریخ محمد بن قاسم کی آمد سے شروع ہوتی ہے۔ خاندان امیہ کے خلیفہ ولید بن مالک کے حکم پر محمد بن قاسم نے 93ھ میں سندھ کا علاقہ فتح کیا اور اپنی فتوحات کے سلسلے کو ملتان تک پھیلا دیا۔ اس طرح ہندوستان میں عربوں کی حکومت کا آغاز ہوا۔ جو کسی نہ کسی صورت میں آئندہ 197 سال تک جاری رہا۔ محمد بن قاسم کی فتوحات اور مقبولیت کی بنا پر اشاعت اسلام کے ساتھ ساتھ سندھ اور ملتان میں قرآن حکیم احادیث مبارکہ اور دیگر علوم اسلامی نے تیزی سے قبولیت عامہ حاصل کی۔ محمد بن قاسم کا زمانہ بلادِ عرب میں خط کوفی کی مقبولیت کا زمانہ تھا۔ لہٰذا ہندوستان کی تاریخ میں خطاطی کا آغاز خط کوفی سے ہوا۔ ماہرین آثار قدیمہ قرار دیتے ہیں کہ کراچی کا علاقہ دھابے جی دراصل زمانہ قدیم میں بھنبھور کہلاتا تھا۔ اور محمد بن قاسم طویل سمندری سفر کے بعد اسی علاقے بھنبھور کے ایک مقام دیبل پر

بھنبھور کی مسجد سے ملنے والا سنگی کتبہ۔ خط کوفی
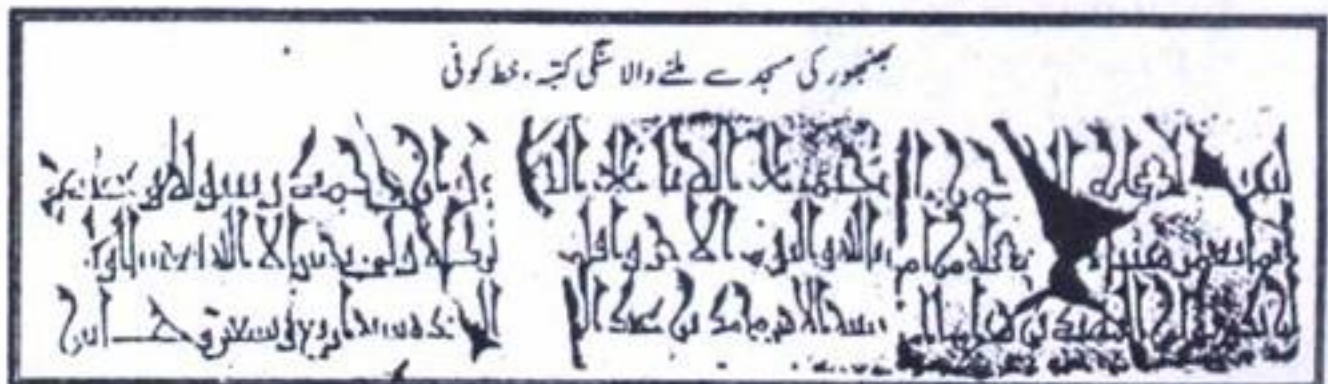
لنگر انداز ہوا تھا۔ ماہرین آثار قدیمہ نے بھنبور میں ایک قدیم مسجد کا سراغ لگایا ہے جس کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ فتح سندھ سے 16 سال بعد تعمیر کی گئی تھی۔ اس قدیم مسجد میں دو کتبے دریافت ہوئے جن پر خط کوفی میں آیات قرآنی کو رقم کیا گیا ہے۔ دریافت ہونے والے دو کتبات میں سے ایک پر 109ھ (722ء) سن درج ہے جبکہ دوسرے کتبے پر 294ھ (906ء) کی تاریخ کندہ ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ کا اندازہ ہے کہ دوسرا کتبہ مسجد کی تعمیر کے 184 سال بعد اس کی مرمت یا تزئین نو کے دوران نصب کیا گیا ہوگا۔

بعض تاریخ دانوں کا کہنا ہے کہ محمد بن قاسم کی باقاعدہ فتوحات سے قطع نظر ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ اللہ کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ کے دور رسالت ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ ماہرین آثار قدیمہ کا اندازہ ہے کہ ہندوستان کے جنوبی حصہ میں آغاز اسلام ہی سے مسلمانوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔ اور اشاعت اسلام کا بھی آغاز ہو چکا تھا۔ اس کا ثبوت جنوبی ہند کے صوبے کیرالہ سے ملتا ہے۔ اس علاقے کی ایک آبادی کلم میں ایک قدیم مسجد کے آثار دریافت کئے گئے ہیں، ان آثار میں خط کوفی میں لکھا ہوا ایک سنگی کتبہ بھی موجود ہے۔ اس کتبے کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے خط کوفی کے ماہر خطاط اسماعیل بن مالک بن دینار نے 109ھ میں تحریر کیا تھا۔ اس کے علاوہ درہ ٹوچی (صوبہ سرحد) کے راستے بھی مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے آثار ملتے ہیں۔ وادی ٹوچی سے عربی اور سنسکرت میں لکھا ہوا ایک قدیم کتبہ ملا ہے۔ جس پر 243ھ (757ء) سن درج ہے۔ اس کتبے پر بھی عربی تحریر خط کوفی میں لکھی گئی ہے۔ مذکورہ بالا آثار سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ہندوستان میں رائج

میر عماد حسنی کے قلم سے خط نستعلیق کا نمونہ

ہونے والا سب سے پہلا عربی خط، خط کوفی تھا۔ ہندوستان میں خط کوفی کی مقبولیت اور غلبے کا دور خاصا طویل رہا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق برصغیر میں خط کوفی نے لگا تار ساڑھے چار سو سال تک اپنا اثر قائم رکھا۔ صوبہ پنجاب میں خط کوفی کو غزنوی دور میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ سلطان محمود غزنوی نے 413ھ میں لاہور کو فتح کیا، اس شہر کو زیر تسلط ہندوستانی سرزمین کا دارالخلافہ قرار دیا۔ اور پہلا مسلمان حاکم مقرر کیا۔ لاہور کے دارالحکومت بننے اور قیام حکومت کے ساتھ ہی اس شہر میں کاتبوں کیلئے طلب اور کشش پیدا ہو گئی۔ پنجاب یونیورسٹی کے ذخیرہ مخطوطات میں موجود اس دور کی ایک کتاب بھی قابل ذکر ہے۔ کتاب کے مندرجات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی کتابت لاہور میں 28 جمادی الثانی 436ھ میں مکمل ہوئی تھی۔ اور اس کی کتابت ابو حامد بن ایوب بخاری کے قلم سے عالم وجود میں آئی تھی۔

لاہور کے بادشاہ سلطان ابراہیم بن مسعود غزنوی کے چار سالہ دورِ حکومت (154 تا 454ھ) کو فن خطاطی کا باقاعدہ اور ارتقائی دور قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ لگ بھگ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان میں پہلی مرتبہ کاغذ متعارف ہوا۔ اس دور کے خطاطین نے خط کوفی کے ساتھ ساتھ خط ثلث اور خطِ نسخ کو بھی ہندوستان میں رواج دیا۔ خود بادشاہ سلطان ابراہیم خطاطی سے دل چسپی رکھتا تھا۔ اور خوبصورت انداز میں خط نسخ کی خطاطی کیا کرتا تھا۔ ایک روایت کے مطابق وہ اپنے ہاتھ سے دو مکمل قرآن لکھتا تھا۔ جن میں سے ایک ہر سال مکہ مکرمہ اور دوسرا مدینہ منورہ بھجوایا کرتا تھا۔ غزنوی دور کے متعدد آثار برصغیر پاک و ہند میں اب تک محفوظ ہیں۔ ضلع رہتک مشرقی پنجاب کے قصبہ مہم سے ایک قدیم کتبہ دریافت ہوا جس 440ھ (7 مئی 1049ء) کی تاریخ رقم ہے۔ خط نسخ میں لکھا ہوا ایک کتبہ احمد آباد کی قدیم مسجد کاچ میں نصب ہے اس پر 455ھ سن درج ہے۔ اس کے علاوہ لاہور کے عجائب گھر میں غیاث الدین بلخی کے مزار کا کتبہ محفوظ ہے اس پر 543ھ (1148ء) کا سن لکھا ہوا ہے۔

محمود غزنوی کی حکومت پنجاب تک محدود رہی لیکن بعد ازاں معز الدین محمد بن سام غوری نے 588ھ یعنی 1193ء میں دہلی اور اجمیر تک کو فتح کر کے مسلم حکمرانی کا دائرہ وسیع تر کر دیا۔

پھر قطب الدین ایبک نے آنے والے دور میں دہلی، اجمیر، بدایوں، ہانسی اور کیتھل میں عمارات تعمیر کروائیں ان عمارات میں بہت سے کتبات نصب ہیں جو اس زمانے کے فن خطاطی کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ قطب الدین ایبک نے دہلی میں مسجد قوۃ الاسلام کی بنیاد رکھی۔ اس کے واحد مینار پر تین کتبات نصب ہیں۔ پہلا کتبہ 587ھ کا لکھا ہوا ہے یاد رہے کہ یہ فتح دہلی کا اولین سال تھا۔ دوسرا کتبہ 592ھ جبکہ تیسرا کتبہ 594ھ کا ہے۔ یہ تینوں کتبات الگ الگ

خطوط میں رقم کیے گئے ہیں۔ پہلا خط ثلث، دوسرا خط نسخ اور تیسرا خط کوفی میں ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فتح دہلی کے زمانے میں پنجاب کے خطاطوں میں یہ تینوں خط مقبول اور رائج تھے۔ اس دور کے سلطان شمس الدین التمش کے بارے میں روایت ہے کہ وہ اپنے ذاتی اخراجات قرآن کی خطاطی سے پورے کیا کرتا تھا۔ اور ایک سال میں کم از کم دو قرآن شریف کتابت کیا کرتا تھا۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ غزنوی اور غوری دور کی کوئی ایسی کتاب یا تحریر دریافت نہیں ہوسکی جس سے اس زمانے کے ممتاز خطاطین کے احوال اور اسماء سے آگاہی ہو پاتی۔ 602ھ میں دہلی کو اسلامی ہندوستان کا دارالحکومت قرار دیا گیا۔ تو خطاطی کے بہت سے ماہرین نے اس شہر کو اپنے فن کا مرکز بنایا۔ ان کی اختراعی کاوشات سے ایک نیا خط، خط بہار کے نام سے عالم وجود میں آیا۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کی تحقیق کے مطابق خط بہار میں لکھے گئے قرآن کے نسخے ساتویں اور نویں ہجری کے دوران تکمیل پذیر ہوئے تھے۔ اگرچہ یہ امر ابھی تحقیق طلب ہے کہ خط بہار کا خالق کون تھا لیکن خط بہار کے تنقیدی جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خط حقیقت میں خط نسخ میں آزادانہ تصرف کے ذریعے حروف کے دائروں کو ہلالی شکل دے کر تشکیل دیا گیا ہے۔ حروف کے جوڑ بھی نسخ سے مختلف دکھائی دیتے ہیں۔ ایک مرتب اور منظم انحراف اور جدت کے سبب اس خط کی الگ پہچان اور شناخت بن گئی۔ اس طرح اسلامی خطاطی کی تاریخ میں پہلا خالص ہندوستانی خط عالم وجود میں آیا۔

غزنوی اور غوری ادوار حکومت میں قائم ہونے والی بہت سی اسلامی ریاستوں کے ایران سے ثقافتی تعلقات استوار ہو چکے تھے۔ اور ایران کے علاقے ہرات سے جو اسلامی خطاطی کے ایک منفرد دبستان کا درجہ رکھتا تھا، بہت سے اہل ہنر اور اہل فن ہندوستان کی ریاستوں اور صوبائی حکومتوں میں پہنچ چکے تھے۔ اس سلسلے میں صوبہ سندھ، گجرات، مالوہ، بیجاپور اور دکن وغیرہ کی ریاستیں قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ جنوبی ہندوستان کی مسلم ریاستوں میں خطاطی کا فن خاصا مقبول تھا۔ اور سربراہان مملکت ان فن کی سرپرستی میں پیش پیش تھے۔ ان سربراہان مملکت میں ریاست گجرات کا سلطان مظفر نہ صرف یہ کہ خطاطی کا زبردست قدردان تھا بلکہ خود بھی ایک ماہر خطاط تھا۔ اس کا وطیرہ تھا کہ وہ ہر سال جلی حروف میں آب زر سے دو قرآن مجید اپنے ہاتھ سے رقم کرتا تھا اور مکمل ہونے پر انہیں حرمین شریفین ارسال کردیا کرتا تھا۔ سلطان مظفر 932ھ بمطابق 1525ء اس جہان فانی سے رخصت ہوا۔ ریاست مالوہ کا ایک حکمران غیاث الدین شاہ خلجی بھی ہنر پروری میں خاص شہرت رکھتا تھا۔ اس کے دور حکومت میں ریاست مالوہ کے نامور خطاط شہوار نے بوستان شیخ سعدی کی نادر انداز میں کتابت کی تھی۔ یہ کتاب خوبصورت تصاویر سے بھی مزین تھی۔ اس کتاب میں شامل تصاویر اس وقت کے ممتاز مصور حاجی محمود نے تیار کی تھیں۔ کتاب میں شامل تصاویر اور خطاطی دونوں میں دبستان ہرات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ایران سے ہندوستان کی مسلم ریاستوں میں آنے والے خطاط اپنے ساتھ خط نستعلیق کا ہنر لے کر آئے تھے۔ اس لیے ہندوستان میں خط نستعلیق پہلا چلن ہمیں یہیں دکھائی دیتا ہے۔ خطاط شہوار کی لکھی ہوئی بوستان شیخ سعدی کو ہندوستان میں خط نستعلیق کا پہلا کتابی نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔ بوستان کی حتمی تیاری تک شاہ غیاث الدین انتقال کر چکا تھا۔ لہٰذا سلطان عبدالقادر نے 908ھ میں ہندوستانی تاریخ کا یہ اولین مرقع اس کے فرزند ناصر شاہ بن غیاث الدین کی خدمت میں پیش کیا۔

خط نسخ کے دائروں کو ہلالی شکل دے کر خط بہار ایجاد کیا گیا

شاہ سوار کی لکھی ہوئی بوستان سعدی کو ہندوستانی تاریخ کا اولین مرقع قرار دیا جاتا ہے

877ھ میں ریاست دکن کے سلطان نظام شاہ کے ایک وزیر محمود گاوٗں نے ہندوستانی تاریخ کا اولین مدرسہ تعمیر کروایا۔ اس مدرسے کی عظیم الشان محراب پر علی صوفی نامی خطاط نے سورہ زمر کی آیات 71 اور 72 درج کیں۔ یہ آیات خطِ نسخ کا خوبصورت نمونہ ہیں۔ ریاست دکن کے آثار سے 917ھ کا لکھا ہوا ایک کتبہ بھی دریافت ہوا ہے۔ اس کتبے پر خط نستعلیق میں نفسِ مضمون تحریر کیا گیا ہے۔ مذکورہ کتبہ کولہاپور کے عجائب گھر میں آج بھی موجود ہے۔

> مسلمانوں کے ہاں خطاطی کا آغاز نزول وحی کے ساتھ ہی ہو گیا تھا

بیجا پور کے حکمران سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی کا دور حکومت (987 تا 1035ھ) بھی فن، موسیقی اور خطاطی کے ارتقاء میں اہمیت کا حامل ہے۔ سلطان کے دربار سے وابستہ خطاطین میں میر خلیل اللہ سب سے زیادہ ممتاز ہے۔ سلطان ابراہیم نے فن موسیقی پر ایک کتاب نورس کے نام سے لکھی تھی۔ اس ضخیم کتاب کی کتابت میر خلیل اللہ نے خط نستعلیق میں کی تھی۔ یہ دیدہ زیب کتاب 1027ھ میں مکمل ہو کر بادشاہ کے حضور پیش ہوئی تو بادشاہ نے عمدہ خطاطی کی تحسین کرتے ہوئے میر خلیل اللہ کو ''بادشاہ قلم'' کا خطاب عطا کیا اور تخت شاہی پر اپنے پہلو میں جگہ دی۔ اسی دربار سے وابستہ ایک اور خطاط محمد باقر کاشانی نے بھی خطاطی کے منفرد انداز کی بدولت شہرت حاصل کی۔ بادشاہ نے محمد باقر کاشانی کے فن سے متاثر ہو کر اسے بیجا پور کے شاہی کتب خانے کا انچارج مقرر کر دیا تھا۔

مغل دور حکومت

ظہیر الدین بابر کا عہد:

جنوبی ہندوستان کی مسلم ریاستوں میں جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے خطِ نستعلیق 900ھ کے لگ بھگ متعارف ہو چکا تھا اور اہم کتب کی کتابت بھی اس خط میں ہونے لگی تھی۔ لیکن خطِ نستعلیق کو پورے ہندوستان یں پھیلانے اور رائج کرنے کا سہرا مغل حکمران کے سر جاتا ہے۔ ہندوستان میں مغل سلطنت کا بانی ظہیر الدین بابر، امیر تیمور کا پڑپوتا تھا۔ اس کی پرورش ہرات

خط بابری
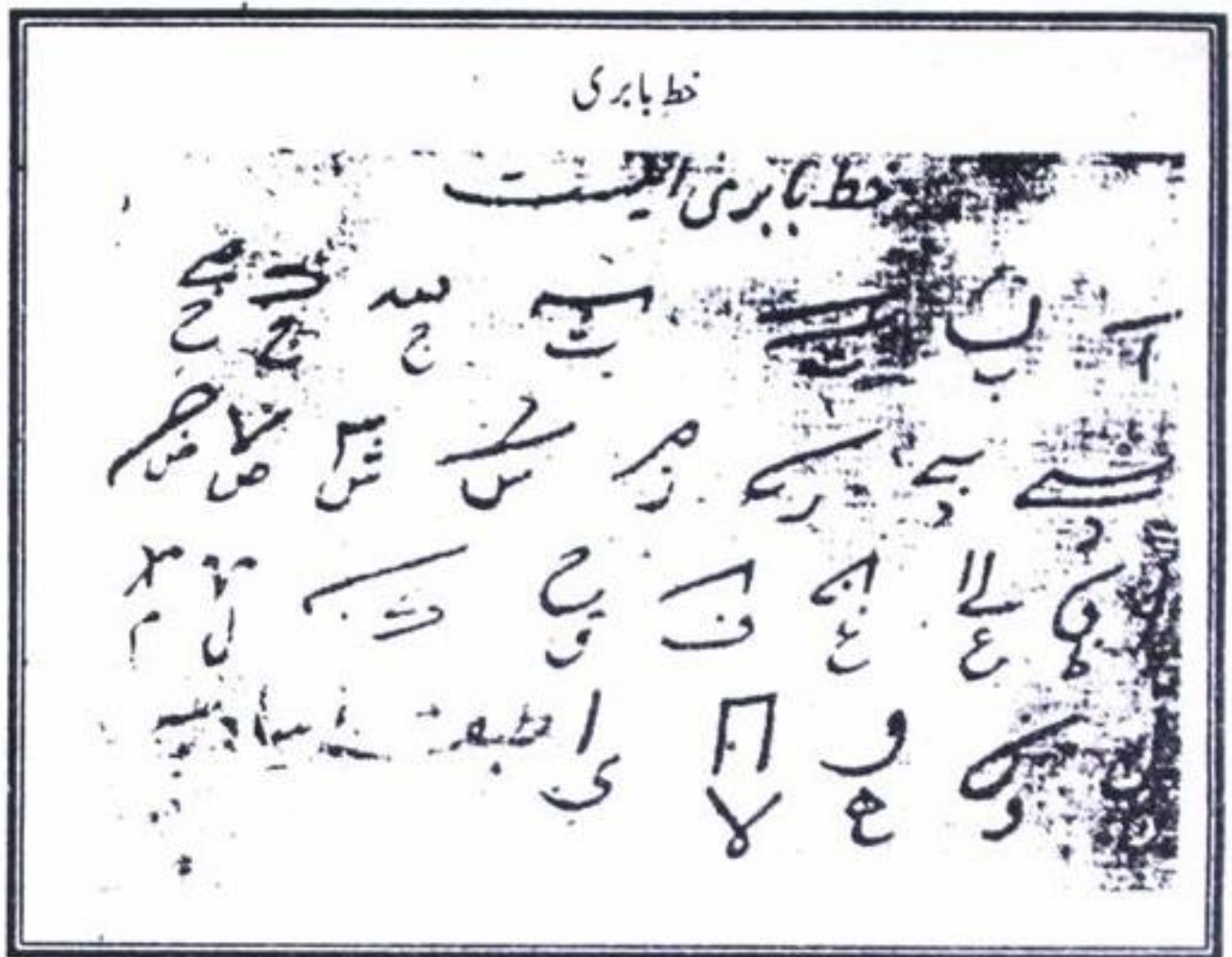
کی وادی میں ہوئی تھی۔ لہٰذا وہ اہل علم اور اہل ہنر کا قدر دان تھا، جس کا ثبوت اس کی سوانح حیات تزک بابری سے بھی ملتا ہے۔ ظہیر الدین بابر خود بھی ایک اچھا خطاط تھا۔ اس کی فطرت میں اختراع اور جدت کے عناصر پائے جاتے تھے۔ بابر نے رائج الوقت اسالیب خطاطی سے ہٹ کر ایک نیا خط ایجاد کیا تھا۔ جس میں حروف کو نئی اشکال میں ڈھالا گیا تھا۔ اہل فن نے اس خط کو بابر کے نام سے منسوب کرتے ہوئے خط بابری کا نام دیا۔ بابر کی اختراع کردہ الفبائی کا ایک نمونہ محمد طاہر بن قاسم کی مرتب کردہ کتاب عجائب الطبقات میں شامل کیا گیا تھا۔ یہ کتاب 1055ھ (1645ء) میں بلخ کے حاکم نذر محمد خان کی ہدایت پر لکھی گئی تھی۔ تاشقند اکیڈیمی میں موجود عجائب الطبقات کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خط بابری عربی خط سے بالکل ایک الگ خط ہے شائد یہی وجہ ہے کہ خط بابری کو مقبولیت حاصل نہیں ہوسکی۔ ''تاریخ خط و خطاطین'' کے مؤلف پروفیسر سید محمد سلیم کا بیان ہے کہ خط ثلث شکستہ میں لکھا ہوا بابر کا ایک فرمان مرقومہ 933ھ انہوں نے خود شاہ ولی اللہ اورینٹل کالج حیدر آباد کے دارالآثار میں دیکھا لیکن کوشش کے باوجود اسے پڑھنے سے قاصر رہے۔ عہد بابری کے ممتاز خطاطوں میں مولانا شہاب معمائی ہروی کا نام شامل ہے۔ 28 رجب 932ھ کو پانی پت کی جنگ میں ابراہیم لودھی کو شکست دینے کے بعد بابر نے دہلی میں خواجہ نظام الدین اولیا کے مزار پر حاضری دی اور امیر خسرو کے مزار پر شہاب معمائی ہروی کے قلم سے ایک رباعی کندہ کروائی۔ یہ رباعی خط نستعلیق میں ہے۔

ظاہر ہے کہ اس خط کی منظوری بابر نے بہ نفسِ خود دی ہوگی شہاب معمائی نے طویل عمر پائی اور بادشاہ ہمایوں کے بھائی مرزا کامران کے دیوان کی کتابت بھی انہوں ہی نے کی۔ یہ دیوان بھی خط نستعلیق میں تحریر کیا گیا ہے۔ شہاب کا انتقال 981ھ میں ہوا۔ بابر کے ہمراہ ہندوستان آنے والے لوگوں میں ایک شخص کا نام زین الدین خوافی تھا۔ زین الدین خوبصورت کتابت کا ماہر تھا۔ ہندوستان میں فتوحات کے بعد بابر نے ایران اور توران میں مختلف مقامات پر اپنی فتح کی اطلاعات بھجوائیں۔ ان تحریروں کو فتح نامہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بابر کے بھجوائے ہوئے تمام فتح نامے زین الدین خوافی نے تحریر کئے تھے۔ آخری فتح نامہ پر 933ھ کا سن درج ہے۔ تزک بابری کا ترکی سے فارسی زبان میں ترجمہ بھی زین الدین نے بابر کی زندگی ہی میں مکمل کیا تھا۔ بابر کے دربار سے منسلک ایک اور ممتاز کاتب کا نام علی الکاتب ہے۔ بابر نے اپنی حیات ہی میں علی الکاتب سے تزک بابری کا ایک دیدہ زیب اور مصور نسخہ تیار کروایا تھا۔ یہ مصور نسخہ راجھستان بھارت کی ریاست الور کے عجائب خانے میں اب تک موجود ہے۔ کتابیات سے قطع نظر بابر نے آگرہ، دھول پور، پالم اور ایودھیا میں جو قابل ذکر عمارات تعمیر کروائیں۔ ان پر بھی متعدد کتبات عہد بابر کی خطاطی کی یادگار ہیں۔ عمارتوں پر نصب کتبے خط نسخ میں لکھے گئے ہیں۔

تزک بابری کا فارسی ترجمہ زین الدین خوافی نے سپردِ قلم کیا تھا

ہمایوں کا عہد

بابر نے اس جہانِ رنگ و بو سے رختِ سفر باندھا تو اس کا بیٹا ہمایوں 937ھ میں تخت نشین ہوا۔ اقتدار میں آنے کے فوراً بعد ہمایوں نے آگرہ میں کھچورہ کے مقام پر ایم عظیم الشان مسجد تعمیر کروائی۔ اس مسجد کی تعمیراتی نگرانی بابر کے ایک خطاط زین الدین خوافی نے کی جبکہ اس پر کتبات نگاری کا کام دور بابر ہی کے دوسرے نامور خطاط شہاب معمائی نے کیا۔ 945ھ میں شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو شکست دے دی۔ جس کے نتیجے میں ہمایوں ایران چلا گیا۔ دس سال بعد اس نے ہندوستان میں دوبارہ اقتدار حاصل کرلیا۔ ایران سے واپسی پر بہت سے اہل فن اور اہل ہنر بھی ہمایوں کے ہم رکاب ہندوستان آئے۔ ان میں عبدالصمد شیریں رقم، میر سید علی تبریزی، مُلا فخر اور مذہب وغیرہ ممتاز ہوئے۔ ملا فخر جلد سازی میں ماہر تسلیم کیا جاتا تھا۔ ہمایوں کیساتھ ہندوستان آنے والوں میں ہرات کا باسی سلطان بایزید بن میر نظام دوری بھی تھا۔ یہ

شخص اعلیٰ پائے کا خطاط تھا اور الملک دوری کے لقب سے مشہور تھا۔ روایت ہے کہ الملک دوری بخارا کے صاحب طرز خطاط میر علی کا شاگرد تھا۔ الملک ہمایوں کی وفات کے بعد بادشاہ اکبر کے دربار میں بھی اعلیٰ مقام پر فائز رہا۔ اکبر بادشاہ کی بیگم سلیمہ سلطانہ کی فرمائش پر اس نے 966ھ میں امیر خسرو کی ایک مثنوی دیدہ زیب انداز میں رقم کی تھی۔ یہ نسخہ کپورتھلہ بھارت کے ایک کتب خانے میں موجود ہے۔ 967ھ میں بایزید دوری نے دو فٹ لمبی سنگ مرمر کی ایک سل پر ناگور مارواڑ کی ایک مسجد کا کتبہ بھی لکھا تھا۔

جلال الدین محمد اکبر کا عہد

ہمایوں کے بعد اس کا فرزند جلال الدین محمد اکبر ہندوستان کا فرماں روا بنا۔ اکبر نے فتح پور سیکری میں ایک علیحدہ شعبہ قائم کیا۔ جو فن کتابت اور فن مصوری کی ترویج کے لئے مخصوص تھا۔ اس طرح اکبر ہندوستان کی تاریخ میں وہ پہلا شخص قرار پایا۔ جس نے فنون لطیفہ، مصوری اور خطاطی کی ترقی اور تہذیب کے لیے ایک الگ محکمہ قائم کیا۔ اکبر کے قائم کردہ اس شعبہ سے بے شمار فنکار وابستہ تھے۔ عہد اکبری کے نمایاں ترین خطاطوں میں عبدالصمد شیریں رقم کا نام سر فہرست ہے۔ عبدالصمد دراصل ہمایوں کے ساتھ ایران سے اس وقت آیا تھا۔ جب اس نے ہندوستان میں دوبارہ اقتدار حاصل کیا۔ ہمایوں دور میں بھی خطاطی کے فن میں اس کی انفرادیت کا شہرہ تھا۔ لیکن بعد ازاں اکبر بادشاہ کی قربت میں اس کے فن کو ارتقاء کے وسیع مواقع میسر آئے۔ بادشاہ عبدالصمد کی صلاحیتوں کا اس قدر معترف تھا کہ اس نے عبدالصمد کو پہلے فتح پور سیکری میں سرکاری ٹکسال کا منتظم اور بعد میں صوبہ ملتان کا گورنر تعینات کر دیا تھا۔ عبدالصمد شیریں رقم کو خط خفی اور خط نستعلیق لکھنے میں خاص مہارت حاصل تھی۔ خط خفی میں اپنی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے عبدالصمد نے ایک مرتبہ خشخاش کے دانے پر مکمل قل ھو اللہ لکھ کر بادشاہ کے حضور پیش کی تھی۔ بادشاہ خفی خط میں عبدالصمد کی یہ چابکدستی اور مہین کاری دیکھ کر حیران رہ گیا اور اس نے عبدالصمد کو ''شیریں رقم'' کے خطاب سے نوازا۔ عبدالصمد شیریں رقم کا ایک اور کارنامہ نفیس کپڑے پر لکھی ہوئی داستان امیر حمزہ ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں 20 سال کا عرصہ صرف ہوا۔ بہت سے خطاطوں نے اس کی ترتیب و تدوین میں ہاتھ بٹایا۔ جبکہ خطِ نستعلیق میں اس کی کتابت عبدالصمد شیریں نے مکمل کی۔ داستان امیر حمزہ کے اس نسخے میں

اکبر نے ہندوستانی تاریخ میں پہلی مرتبہ فنون لطیفہ اور خطاطی کی ترقی کے لئے ایک الگ محکمہ قائم کیا

اکبر کے دستخط اور مہر کے ساتھ قرآن کریم کا آخری صفحہ
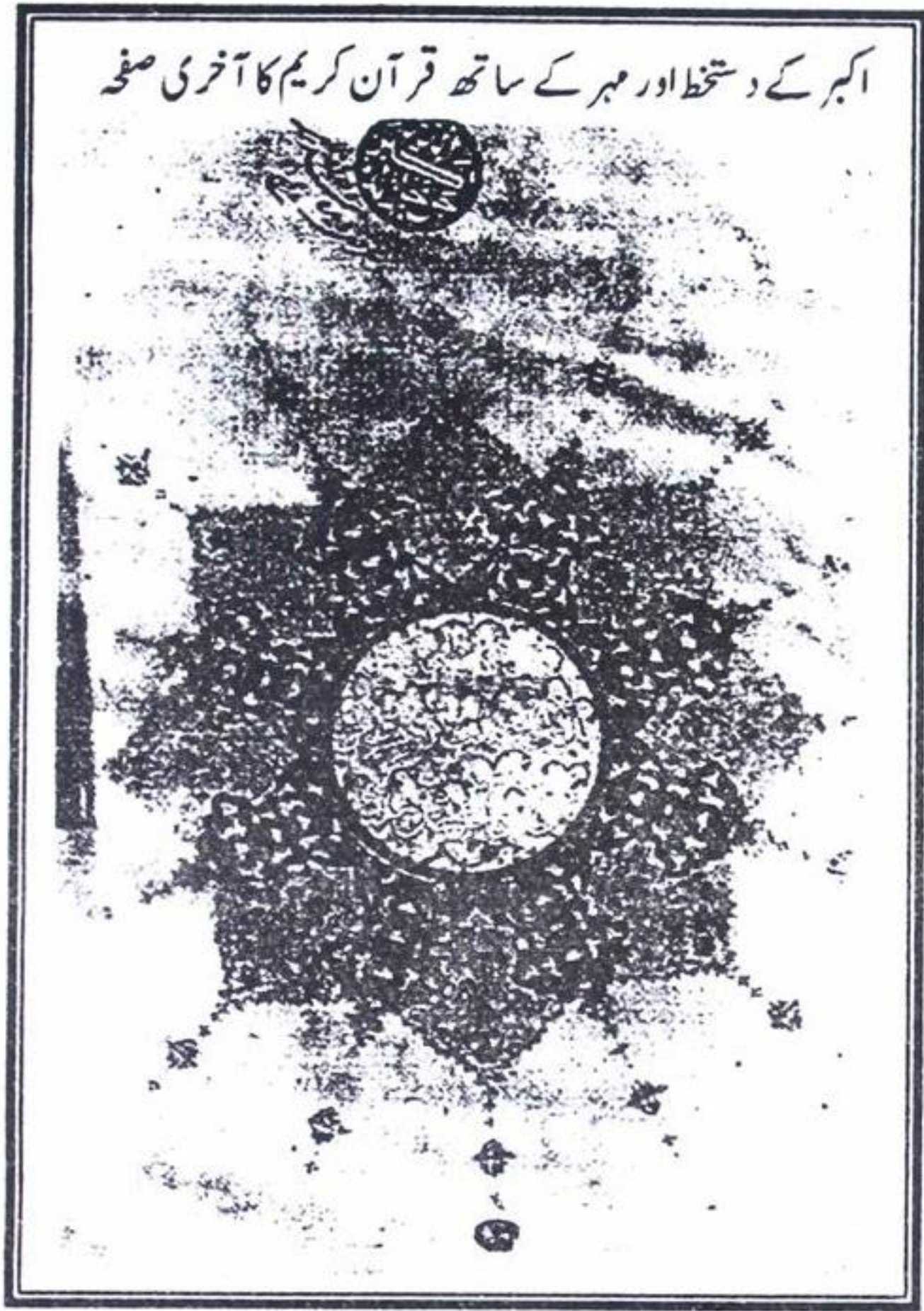
کتاب کا سائز 22x22 انچ رکھا گیا تھا۔ اوراس میں چار سو تصاویر شامل تھیں ۔ یہ تصاویر میر سید علی تبریزی کے موقلم سے تخلیق ہوئی تھیں ۔ یہ نسخہ تمام مغل حکمرانوں نے اپنی خاص تحویل میں رکھا۔ 1152ھ میں جب نادرشاہ درانی نے دہلی کو تاراج کیا تو وہ تخت طاؤس، کوہ نور ہیرے اور دیگر نوادرات کے ساتھ اس نادر نسخے کو بھی ایران لے گیا۔ جہاں اس کے اوراق منتشر ہو گئے ۔ کچھ اوراق آج تک دنیا کے مختلف عجائب گھروں میں لخت لخت پھیلے ہوئے ہیں۔ البرٹ میوزیم لندن اور آسٹریا کے شہر وائنا کے عجائب گھر میں اس تاریخی کتاب کے اوراق دیکھے جا

سکتے ہیں۔ نفیس کپڑے پر نستعلیق خطاطی میں تخلیق کی گئی یہ مصور کتاب اسلامی تاریخی خطاطی میں اپنی طرز کی اوّلین کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ فتح پور سیکری میں اکبر بادشاہ کے قائم کردہ کتابت و تصویر خانہ میں تیار کردہ دو اور کتابیں بھی قابل ذکر ہیں۔ فنی خوبیوں اور مصورانہ لطافتوں سے مالا مال ان کتب میں سے ایک کا نام حمزہ نامہ ہے۔ یہ کتاب چند سال قبل لندن میں نیلامی کے لئے پیش کی گئی تو ایک لاکھ اڑتالیس ہزار پانچ سو پاؤنڈ میں فروخت ہوئی۔ اس طرح عہد اکبری کی یہ شہکار کتاب دنیا بھر میں سب سے زیادہ قیمت پر فروخت ہونے والے نوادرات کی فہرست میں اول نمبر پر آگئی۔ اکبر کے عہد میں مہا بھارت کا فارسی ترجمہ رزم نامہ کے نام سے ہوا۔ اس کی کتابت عنایت اللہ شیرازی نے کی۔ اس کتاب کو بہت سے فنکاروں نے مل کر مصور کیا تھا۔ 997ھ میں تیار ہونے والا یہ نایاب نسخہ جے پور کے ایک کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اسی زمانے کا ایک اور نامور خطاط محمد حسین کشمیری ہے۔ اکبر بادشاہ نے اسے ''زریں رقم'' کا خطاب دیا تھا۔ اکبر کی ہدایت پر محمد حسین کشمیری نے شیخ سعدی کی کتاب گلستان کا ایک نہایت دیدہ زیب نسخہ خط نستعلیق میں تیار کیا تھا۔ یہ نسخہ مصور اور نہایت نفیس خط میں ترتیب دیا گیا تھا۔ محمد حسین کشمیری زریں رقم نے آئین اکبری کا ایک نہایت خوبصورت اور فنی خوبیوں سے بھرپور نسخہ بھی خط نستعلیق میں تیار کیا تھا۔ یہ نسخہ مصور بھی تھا۔ ایک روایت کے مطابق اس نسخے کی تیاری پر اس زمانے میں تین لاکھ خرچ ہوئے تھے۔ اس نسخے کی ایک اور انفرادیت یہ ہے کہ اس کے آخر میں کتاب کے خطاط محمد حسین کشمیری اور مصوروں منوہر لال، بن لسباون اور ایک شاگرد کی قلمی تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔ اس طرح اس کتاب کو دنیائے خطاطی کے ایک ایسے اوّلین نسخے کا درجہ حاصل ہوگیا ہے۔ جس میں اس کی کتابت کرنے والے خطاط کی تصویر بھی شامل ہے۔ یہ نادر و نایاب نمونہ نسخہ اس وقت رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کی تحویل میں ہے۔ اکبر بادشاہ کا رتن ابوالفضل محمد حسین کشمیری کے فن کا معترف تھا اور اسے اکبر بادشاہ کے دیئے

محمد حسین کشمیری، نستعلیق

خطاب زریں رقم کے بجائے جادو رقم کا نام دیتا تھا۔ شہنشاہ جہانگیر کا قول تھا کہ محمد حسین سے بہتر نستعلیق لکھنے والا پورے ہندوستان میں ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتا۔ جہانگیر نے محمد حسین کشمیری کے فن کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اسے ایک ہزار روپیہ اور ایک ہاتھی انعام میں دیا تھا۔ محمد حسین کشمیری کے لکھے ہوئے نمونہ جات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور باڈلین لائبریری آکسفورڈ میں موجود ہیں۔ پاکستان میں شیخوپورہ کے ہرن مینار پر جو کتبہ نصب ہے وہ بھی محمد حسین کشمیری زریں رقم کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ عبداللہ مشکیں رقم بھی بابر کے دربار سے منسلک ایک ممتاز خطاط تھا۔ الہ آباد کے قلعے اور خسرو باغ کے کتبے عبداللہ نے لکھے تھے۔ اس نے 1011ھ میں حسن سنجری کا دیوان بھی قلمبند کیا تھا۔ یہ دیوان عبداللہ مشکیں رقم کے فن کا اعلیٰ ترین نمونہ خیال کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں عبداللہ کی تصویر بھی شامل اشاعت ہے۔ جہانگیر کے عہد میں 1025ھ کے دوران عبداللہ کا انتقال ہوا۔ اس وقت تک اس کے دو بیٹے محمد صالح اور میر محمد مومن فن خطاطی میں شہرت حاصل کر چکے تھے۔ عبدالرحیم کی زیر سرپرستی ایک اور خطاط عبد الرحیم نے ناموری کی منازل طے کیں۔ بعد ازاں یہ فنکار بھی دربار اکبری سے منسلک ہو گیا۔ اکبر کی وفات کے بعد جہانگیر نے بھی اس کے مراتب کو نہ صرف بحال رکھا۔ بلکہ اسے عنبرین رقم کا بھی عطا کیا۔ اس کے ہاتھ کی مخلوطہ دو وصلیاں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود ہیں۔ اکبر بادشاہ نے اپنے والد کے محسن بیرم خان کے بیٹے عبدالرحیم کی تربیت کا ذمہ اس وقت اٹھایا جب اس کی عمر چار سال تھی اور اس کے والد کو قتل کر دیا گیا تھا۔ عبدالرحیم کو تاریخ میں خانِ خاناں کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ علوم وفنون کا بڑا قدر دان تھا۔ بابر کی تزکِ بابری کا فارسی ترجمہ اس نے اپنے قلم سے کیا تھا۔ اس کے شعبہ کتاب میں ملا محمد امین، ملا محمد مومن اور محمد حسین کاشی جیسے صاحبانِ فن جلد ساز مولانا فہیم، میاں ندیم اور مرزا بہبود جیسے خوش نویس شامل تھے۔ یہ خطاط میر علی ہروی کے شیوہ پر خطاطی میں شہرتِ خاص رکھتے ہیں۔ تفسیر کشاف خانِ خاناں نے بطور خاص لکھوائی تھی۔ اس کا ایک نسخہ اسلامیہ کالج پشاور میں موجود ہے۔ اس پر عبدالرحیم خانِ خاناں کے دستخط ثبت ہیں اور 991ھ سن درج ہے۔ 941ھ کی مہر والی ایک اور کتاب تاریخ محمود شاہی مدینہ منورہ کے ترکی کتب خانے میں خانِ خاناں کی یادگار ہے۔ عہد اکبری کے جن خطاطوں کے لکھے ہوئے کتبات اس عہد کی عمارتوں میں ملتے ہیں ان میں چند ایک کے نام میر محمود معصوم بھکری، قاسم ارسلان، مولانا محمد باقر، محمد امین مشہدی، مولوی عبدالحئی، حسین بن احمد

دور اکبری کے فنکاروں اور خطاطوں کے حالات پر ایک کتاب "مرقع اکبر" کے نام سے ۹۹۲ھ میں مرتب ہوئی

چشتی، مولانا عبدالعزیز، مولانا عبدالرحیم، میر عبداللہ نظامی قزوینی، اور نوراللہ شامل ہیں۔ اکبر بادشاہ کے شعبۂ کتاب نے اس عہد اکبری کے فنکاروں اور خطاطوں سے متعلق 992ھ میں ایک خصوصی کتاب مرتب کی تھی۔ جس میں اس دور کے تمام فنکاروں کے فن کے نمونے جمع کیے گئے تھے۔ اس نادر کتاب کا نام ''مرقع اکبر'' رکھا گیا تھا۔

نورالدین جہانگیر کا عہد

1014ھ، میں اکبر کی وفات کے بعد نورالدین جہانگیر نے عنان حکومت سنبھالی تو اس نے دو نئے سکے جاری کیے۔ ان سکوں پر خط نستعلیق میں ایک رباعی کندہ کی گئی تھی۔ اسلامی تاریخ خطاطی میں یہ اولین سکے ہیں جن پر خط نستعلیق اجاگر ہوا۔ یہ سکے اس لحاظ سے بھی یادگار ہیں کہ اس سے قبل کرنسی پر شاعری کو بھی کبھی جگہ نہیں ملی تھی۔ جہانگیر نے اکبر کے شعبہ کتاب کو مزید مضبوط کیا اور عہد اکبری کے تمام نامور خطاط اور فنکاروں کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ مزید مراعات دیں۔ جہانگیری عہد میں جس خطاط نے خصوصی شہرت حاصل کی اس کا نام خواجہ شریف تھا۔ بادشاہ نے اسے پہلے امیر الامراء کا خطاب دے کر ایک اعلیٰ عہدے پر فائز کیا۔ بعد ازاں اس کی کارکردگی کی مزید حوصلہ افزائی کرتے ہوئے معتمد خان کا خطاب بھی عطا کیا۔ معتمد خان خط، نستعلیق، خط نسخ اور خط ثلث کا ماہر تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ لاہور کی مسجد وزیر خان کی خط ثلث میں تحریر کردہ آیت الکرسی معتمد خان ہی کے قلم کا شاہکار ہے۔ تزک جہانگیری کے اکثر واقعات اسی کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔

مقبرہ انارکلی لاہور کے تعویز اور کتبات دور جہانگیری کی یادگاریں ہیں

لاہور کی عمارت مقبرہ انارکلی کے تعویز اور کتبات بھی دور جہانگیری کی یادگار ہیں۔ اس عمارت میں خطِ نستعلیق میں رقم ایک شعر کے نیچے بادشاہ کا نام یوں تحریر ہے۔

''مجنون سلیم اکبر ۱۰۰۸ھ''

شاہ جہاں کا عہد

شہاب الدین شاہ جہاں 1030ھ میں برسر اقتدار آیا۔ اور لگاتار تیس برس تک ہندوستان کا حکمران رہا۔ شاہ جہاں نے اپنے بزرگوں یعنی اکبر بادشاہ، ہمایوں اور جہانگیر کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے نہ صرف یہ کہ شعبہ کتب و خطاطی کو مزید ترقی دی۔ بلکہ ایسی عالی شان عمارات تعمیر کروائیں۔ جو فن تعمیر کے ساتھ ساتھ آرائش و زیبائش کا نادر نمونہ تھیں۔ فنون

لطیفہ سے شاہ جہاں کی محبت ہندوستان کے مختلف شہروں بلکہ ایران تک سے ماہرینِ فن کو دہلی کی طرف کھینچ لائی۔ ایران سے ہندوستان مراجعت کرنے والے خطاطین میں عبدالرشید دیلمی سب سے نمایاں ہے۔ عبد الرشید دیلمی کے ماموں میر عماد الحسنی قزوینی دبستان ایران کے ایک ماہر اور ممتاز خطاط تھے۔ شاہ عباس صفوی نے بہ وجہ ناراضگی میر عماد الحسنی کو قتل کروا دیا تھا۔ عبد الرشید اپنے ماموں کے قتل کے بعد روپوش ہوگیا۔ اور چھپتا چھپاتا ہندوستان پہنچ گیا۔ ہندوستان میں داخلے کے وقت اس کے تن پر پہنی پوشاک بھی پھٹ چکی تھی۔ لاہور پہنچ کر عبد الرشید نے خطاطی کے کام کا آغاز کیا۔ اور مالی حالات میں کچھ بہتری کے بعد آگرہ جا کر شاہ جہان کے دربار تک رسائی حاصل کی۔ شاہ جہان نے اس کے علم وفن سے متاثر ہوکر نہ صرف یہ کہ اسے شہزادہ داراشکوہ، شہزادی جہاں آرا اور شہزادی زیب النساء کا معلم مقرر کیا بلکہ بعد ازاں شاہی کتب خانے کا کتاب دار بھی مقرر کر دیا۔ عبد الرشید دیلمی خط نستعلیق میں اپنی ایک الگ انفرادیت رکھتا تھا۔ اس کے ہاں حروف کی چست بندش اور دائروں کا استحکام اس کی تحریر کو ایک خاص کشش عطا کرتے تھے۔ عبد الرشید دیلمی نے خط نستعلیق میں ایک خاص طرز بھی وضع کی تھی۔ جسے نقادانِ فن طرز رشید کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اور اسے امام نستعلیق تسلیم کیا جاتا تھا۔ مداحین کی محبت کا یہ عالم تھا کہ وہ عبد الرشید دیلمی کو پیار سے رشیدائے دیلمی کہہ کر پکارتے تھے۔ شہزادی زیب النساء نے رہائش کے لئے لاہور، آگرہ اور دہلی میں ایک ایک حویلی عبد الرشید دیلمی کی نذر کی۔ عبد الرشید کے ہاتھ کی لکھی ہوئی نادعلی کی ایک وصلی اس کے فنی عروج کی بہترین مثال خیال کی جاتی ہے۔ یہ وصلی نظام دکن کے ایک وزیر اعظم مہاراجہ سرکشن پرشاد کی ایک کتاب میں شامل ہے۔ عبد الرشید دیلمی کا انتقال 1081ھ کے دوران آگرہ میں ہوا۔

شاہ جہاں کے دستخط

شاہ جہان کے دربار سے منسلک ایک اور ممتاز خطاط کا نام حکیم رکن الدین مسعود تھا جو

عبدالرشید دیلمی

حکیم رکنا کاشی کے لقب سے مشہور ہوا۔ حکیم رکن الدین ایران میں شاہ عباس صفوی کے شاہی حکماء میں شامل تھا۔ شاہ کو ایک بیماری کے دوران افاقہ نہ ہوا۔ تو حکیم رکن الدین کو نہ صرف یہ کہ ملازمت سے برخاست کر دیا گیا۔ بلکہ بطور شاہی طبیب وہ جو تنخواہ وصول کر چکا تھا۔ بادشاہ نے اس کی واپس وصولی کے احکامات بھی صادر کر دیئے۔ حالات سے تنگ آ کر رکن الدین کسی نہ کسی طرح ایران سے نکل کر ہندوستان میں آ گیا اور اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر شاہ جہان کے دربار سے وابستہ ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ ہندوستان میں حکیم رکن الدین نے 1038ھ میں شیخ سعدی کی کتاب گلستان اور 1039ھ میں بوستان کی خطاطی اعلیٰ درجے کے سمرقندی زرفشاں کاغذ پر کی۔ شاندار جلدوں کی حامل یہ کتب مصور بھی ہیں۔ ان تصاویر کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں مصوروں نے شاہ جہان کے زمانے کے ثقافتی مناظر کو اجاگر کیا ہے۔ ان کتب کا ایک تاریخی پہلو یہ ہے کی شاہ جہان نے ان کتب کو انگلستان کے بادشاہ کو بطور تحفہ ارسال کرنے کے لئے منتخب کیا۔ لہٰذا 1048ھ بمطابق 1638ء میں یہ کتب بہ اہتمام خاص شاہ انگلستان چارلس کے لئے روانہ کیں۔ تقریباً 200 سال کے لگ بھگ یہ نایاب کتب انگلستان کے شاہی خاندان کی تحویل میں رہیں۔ بالآخر 1934ء میں اس وقت کے بادشاہ ولیم چہارم نے انہیں تحفہ کے طور پر ایران کے بادشاہ فتح علی شاہ کے حوالے کر دیا۔ ملکہ نواب ممتاز الزمانی بیگم بھی حکیم رکن الدین کے فن کی پرستار تھی۔ اس کی سفارش پر بادشاہ نے حکیم رکن الدین کو 24 ہزار روپے سالانہ کا عہدہ عطا کیا تھا۔

اکبر بادشاہ کے زمانے میں ایک ممتاز خطاط میر عبداللہ مشکیں رقم کا تذکرہ گزشتہ سطور

میں ہو چکا ہے۔ میر عبداللہ کے دو بیٹوں میر محمد صالح اور میر محمد مومن نے شاہ جہاں کے دور میں شہرت حاصل کی۔ یہ دونوں بھائی خط نستعلیق بہت خوبصورت انداز میں لکھتے تھے۔ یہ بھائی دیگر قدیم اساتذہ کے خط کی نقل بنانے میں بھی ماہر تھے۔ میر محمد مومن نے ایک دفعہ مشہور خطاط میر علی ہروی کی طرز پر کچھ قطعات لکھے اور شہزادہ شاہ شجاع کے حضور میں یہ کہہ کر پیش کیے کہ میر علی ہروی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے یہ قطعات کہیں سے دستیاب ہوئے ہیں۔ مجلس میں موجود سب اہل نظر نے قطعات کو دیکھا اور تسلیم کیا کی یہ میر علی ہروی ہی کے ہاتھ کا کرشمہ ہیں۔ بہت عرصہ بعد شاہ شجاع پر حقیقت کا انکشاف ہوا۔ شہزادے نے قطعات لکھنے پر میر محمد مومن کو دو ہزار روپے انعام دیا۔ محمد صالح کا انتقال 1061ھ میں جبکہ میر محمد مومن کی وفات 1091ھ میں ہوئی۔ یہ اورنگ زیب عالمگیر کا زمانہ اقتدار تھا۔

عبدالرشید دیلمی کی طرح خط نستعلیق میں حروف کے دائروں اور حلقہ بندی کو بطور خاص ملحوظِ خاطر رکھنے والا ایک اور خطاط محمد مراد کشمیری شیریں رقم تھا۔ محمد مراد خطِ جلی اور خط خفی دونوں میں منفرد مہارت کا مظاہرہ کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے متعدد

میر محمد صالح اور میر محمد مومن قدیم اساتذہ کے خط کی نقل بنانے میں ماہر تھے

قطعات برصغیر میں موجود ہیں۔ محمد مراد کے خط کی خوبی یہ تھی کہ اس میں ماضی قریب کے نامور خطاط محمد حسین کشمیری اور میر علی ہروی کی سی فنی پختہ کاری اور حرف سازی کے جوہر دکھائی دیتے تھے۔ اسی زمانے میں لاہور کے باسی مولانا منیر نے بھی خوش نویسی میں اپنا ایک الگ مقام حاصل کیا۔ ان کے والد بھی کہنہ مشق کاتب تھے اور عہد اکبری میں دربار کے شعبہ خوش نویسی میں کام کرتے چلے آرہے تھے۔ ان کا نام عبدالجلیل تھا۔ عبدالجلیل نے ابوالفضل کے ساتھ ہم نشست ہو کر آئین اکبری کے مسودات کو صاف کیا تھا۔ عبدالجلیل کے دو اور بھی بیٹے تھے۔ یہ دونوں بھی معیاری کتابت کے حوالے سے اچھی شہرت کے حامل تھے۔ مولانا منیر نے اپنا زیادہ تر وقت شاہ جہان کے ہم زلف مرزا ابوالحسن المعروف آصف خان کی ہم نشینی میں الہ آباد میں گزارا۔ 36 سال کی عمر میں عین عنفوان شباب میں مولانا منیر کو اجل کا پیغامِ سفر آ گیا۔ اس وقت وہ آگرہ میں تھا۔ موت کے بعد اس کی تدفین لاہور شہر میں ہوئی۔ انتقال کا سن 1055ھ ہے۔

شاہ جہان کو خوبصورت عمارات بنانے کے حوالے سے بھی مغل بادشاہوں میں ایک

الگ امتیاز حاصل ہے۔ ان عمارات پر آیات قرآنی کی کندہ کاری اور کتبات کی تنصیب بھی شاہ جہان کی نفاست طبع کی دلیل ہے۔ اپنی بیگم ملکہ ممتاز کی قبر پر شاہ جہان نے دریائے جمنا کے کنارے جو مقبرہ تعمیر کروایا تھا۔ وہ تاج محل کے نام سے ساری دنیا میں معروف ہے۔ اور دنیا کے سات عجائب میں شمار کیا جاتا ہے۔ تاج محل پر خط ثلث میں نہایت نفیس انداز میں قرآنی آیات تحریر ہیں یہ آیات امانت خان شیرازی نے تحریر کی تھیں۔ شاہ جہان کے ایک وزیر کا نام محمد افضل تھا۔ امانت خان اس کا بھائی اور شیراز کا رہنے والا تھا۔ امانت خان شیراز سے اکبر بادشاہ کے زمانے میں ہندوستان چلا آیا تھا۔ اکبر کی وفات پر سکندرہ میں جہانگیر نے تخت نشینی کے بعد اپنے باپ کا مقبرہ تعمیر کروایا۔ تو اس مقبرے پر قرآنی آیات کی خطاطی بھی امانت خان شیرازی نے کی تھی۔ اس مقبرے کے حوالے سے قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس مقبرے پر اللہ تبارک تعالیٰ کے ننانوے اسمائے حسنیٰ بھی امانت خان شیرازی نے اپنے قلم سے تحریر کئے تھے۔ امانت خان کا اصل نام عبدالحق تھا۔ لیکن شاہ جہان نے اس کی مہارت فن سے خوش ہو کر سے امانت خان کا خطاب عطا کیا تھا۔ اس کے علاوہ بادشاہ نے امانت خان کو لاہور کے نواح میں ایک بڑی جاگیر بھی عطیہ کی تھی۔ امانت خان نے امرتسر میں ایک وسیع سرائے بھی تعمیر کی تھی۔ جو سرائے امانت خان کے نام سے ایک مدت تک جانی پہچانی جاتی رہی۔ شاہ جہاں کے زمانہ اقتدار میں تعمیر ہونے والی عمارات پر خطاطی کے نقطۂ نظر سے استاد نور اللہ دہلوی کا ذکر بھی لازم آتا ہے۔ نور اللہ اگرچہ ایک معمار کا بیٹا تھا۔ لیکن قدرت نے اسے خطاطی میں ایک خاص جاذبیت سے نوازا تھا۔ خط ثلث میں تحریر کردہ جامع مسجد دہلی کے کتبات لگ بھگ ساڑھے تین صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی اپنی نفاست

شہزادہ خرم۔ خط نستعلیق

تحریر کے سبب سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنتے رہتے ہیں۔ شاملو کی زندگی ہی میں خط شکستہ مغل بادشاہ شاہ جہان کے دور میں ہندوستان پہنچا تو اسے یہاں محمد کفایت خان نے مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس نے خط شکستہ کی خوبصورتی اور دل کشی میں اضافے کے لئے ایک خاص روش ایجاد کی۔ اس روش کو تذکرہ نویس ''روشِ کفایت خان'' کا نام دیتے ہیں۔ کفایت خان نے بہت سے شاگردوں میں اپنی روش عام کرنے کے بعد 1095 ھ میں انتقال کیا۔ کفایت خان کا فرزند درایت خان بھی باپ کی طرح شاہی دربار سے وابستہ تھا۔ اس نے اس خط میں نئی اختراعات کیں اور برسوں کی مشق کے بعد ایک نئی طرز کی طرح ڈالی۔ خط شکستہ میں اس طرز کو درایت خانی کا لقب دیا گیا۔ تذکرہ خوش نویساں کے مرتب غلام محمد نے اپنی کتاب میں درایت خان کی توصیف کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ اگر خطِ نستعلیق کا بانی میر علی تبریزی زندہ ہوتا اور درایت خانی خطاطی کو دیکھ لیتا تو اپنے خط نستعلیق کو بھول جاتا۔ خط شکستہ نے دفتری خط ہونے کے باوصف ہندو خطاطوں کی توجہ بھی حاصل کی۔ چنانچہ چندر بھان برہمن اور رائے پریم ناتھ کے نام اس ضمن میں ممتاز ہیں۔

شاہ جہان کا بڑا بیٹا دارا شکوہ بھی خطاطی میں اپنا ایک خاص میلان رکھتا تھا۔ وہ فلسفے اور تصوف کا عالم تھا۔ عربی، فارسی، ترکی، ہندی اور سنسکرت زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا۔ صوفیاء کے حالات زندگی پر اس کی کتاب ''سفینہ اولیاء'' اور ہندو اسلامی فلسفے جیسے نازک موضوع پر کتاب ''مجمع البحرین'' اسکی مشہور تصانیف ہیں۔ وہ صاحب دیوان شاعر بھی تھا۔ دارا شکوہ نے شاہ جہان کی زندگی میں لاہور اور کابل کے گورنر کے طور پر بھی خدمات سرانجام دیں۔ خط نستعلیق بہت خوبصورت اور آرائشی انداز میں لکھتا تھا۔ شاہ جہان نے اپنے عہد کے نامور خطاط عبدالرشید دیلمی کو شہزادہ دارا شکوہ کا اتالیق مقرر کیا۔ دارشکوہ نے دیدہ زیب انداز میں خط نستعلیق کی تربیت اسی سے حاصل کی۔ عبدالرشید دیلمی ایران کے عہد ساز خطاط میر عماد الحسینی کا بھانجا تھا۔ اور میر عماد کے قتل کے بعد ہندوستان چلا آیا تھا۔ دارا شکوہ اپنے بھائی اورنگ کے خلاف اقتدار کی کشمکش میں شکست کھانے کے بعد بلوچستان سے گرفتار ہوا اس کو 30 اگست 1659ء کو دہلی میں پھانسی دے دی گئی تھی۔

اورنگ زیب کا عہد

محی الدین محمد اورنگ زیب 1068 ھ میں سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس نے اپنے مذہبی

> شہنشاہ اورنگ زیب نے عبدالرشید دیلمی اور سید علی خان جواہر رقم سے باقاعدہ خطاطی کی تربیت حاصل کی

مزاج کی وجہ سے فنون لطیفہ اور مصوری کے وہ شعبے جو اکبر کے دور سے مغل بادشاہوں کی سرپرستی میں مسلسل فروغ پزیر رہے تھے۔ بہ یک حکم ختم کر دیئے۔ اورنگ زیب نے البتہ فن خطاطی کی سرپرستی جاری رکھی۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ اورنگ زیب خود بھی حافظ قرآن تھا اور اسے قرآن کی کتابت کا شوق بھی تھا۔ اس نے خوش خطی کی باقاعدہ تربیت عبدالرشید دیلمی اور سید علی خان جواہر رقم سے حاصل کی تھی۔ اورنگ زیب خط نسخ میں قرآن کی خطاطی کے ساتھ ساتھ خطِ نستعلیق بھی عمدہ لکھ لیتا تھا۔ وہ اپنے کتابت شدہ قرآن مجید اپنا نام لکھے بغیر حرمین شریفین بھجوا دیا کرتا تھا۔ اورنگ زیب اپنے ہم عصر ایک خطاط سید علی خان کا بہت مداح تھا۔ اورنگ زیب نے سید علی خان کو جواہر رقم کا خطاب عطا کرنے کے علاوہ اس کا تقرر شاہی کتب خانے کے کتاب دار کے طور پر بھی کیا ہوا تھا اور شہزادوں کی تعلیم بھی اس کی ذمہ تھی۔ سید علی جواہر رقم کا اصل وطن تبریز تھا۔ اور وہاں کی تربیت کے زیرِ اثر وہ میر عماد کی طرز پر خطاطی کیا کرتا تھا۔ ہندوستان آمد پر اس نے محسوس کیا کہ یہاں عبدالرشید دیلمی کا شیوہ قبولیت عامہ کا درجہ رکھتا ہے۔ تو اس نے طرز رشید میں اپنی مشق کو اتنا پختہ کیا اور نسخ و نستعلیق میں وہ مہارت حاصل کی کہ حروف کی کرسی اور استواری میں طرز رشید کی سی شان پیدا کر لی۔ اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک وصلی علی گڑھ یونیورسٹی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ سید علی جواہر رقم 1094ھ میں اس دنیائے رنگ و بو سے رخصت ہوا۔ وفات دکن میں اور تدفین دہلی میں ہوئی۔ سید علی جواہر رقم کے شیوۂ

خطاطی کی مقبولیت کے پیش نظر ایک اور خطاط ہدایت اللہ زریں رقم نے بھی اسی طرز کو اپنایا۔ اور سخت محنت کے بعد اپنے قلم میں جواہر رقم کی طرز کو مزید نکھارنے کا فن پیدا کر لیا۔ نقادانِ خطاطی

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ
قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِۙ مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَۙ
وَمِنۡ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَۙ وَمِنۡ شَرِّ
النَّفّٰثٰتِ فِى الۡعُقَدِۙ وَمِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا
حَسَدَ

سورة الناس مدنية ست آيات

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ
قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِۙ مَلِكِ النَّاسِۙ اِلٰهِ
النَّاسِۙ مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ الۡخَنَّاسِۙ
الَّذِىۡ يُوَسۡوِسُ فِىۡ صُدُوۡرِ النَّاسِۙ مِنَ الۡجِنَّةِ
وَالنَّاسِ

کتبہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر
سنہ ۱۰

اورنگ زیب کے لکھے ہوئے قرآن مجید کا ایک صفحہ

کا خیال ہے کہ ہدایت اللہ زریں رقم کی تحریر اپنے توازن اور دلکشی میں سید علی جواہر رقم کی خطاطی سے بہتر قرار پاتی ہے۔ اسے بھی سید علی کی طرح شہزادگان کا استاد مقرر ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ دیوان حافظ کی خفی خط میں کتابت بھی ہدیت اللہ زریں رقم کی شہرت کا ایک سبب ہے۔ زریں رقم کی لکھی ہوئی ایک وصلی علی گڑھ یونیورسٹی میں جبکہ ایک دوسری وصلی دہلی کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔ مؤخر الذکر وصلی پر 1112ھ کا سن درج ہے۔ ہدایت اللہ زریں رقم کا انتقال 1118ھ (1707ء) میں ہوا۔

بہادر شاہ ظفر کا عہد

بہادر شاہ ظفر خاندان مغلیہ کا آخری حکمران تھا۔ وہ 1253ھ (1837ء) کو برسر اقتدار آیا۔ بہادر شاہ ظفر کو وہ اقتدار و اختیار حاصل نہ تھا۔ جو اس کے آبا و اجداد کا خاصا رہا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اس وقت تک ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں اپنے استعماری پنجے گاڑ چکی تھی۔ اور دہلی میں تو باقاعدہ حکومت بھی قائم کر چکی تھی۔ محدود وسائل کے باوجود بہادر شاہ ظفر نے جو خوش فکر شاعر بھی تھا۔ خطاطی کے فن میں بھی اپنے جوہر آزمائے۔ اور استادی کے درجے تک پہنچا۔ بہادر شاہ ظفر کے بہت سے شاگردوں نے اس فنِ لطیف میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ حضرت صابر چشتی کی درگاہ اور حکیم احسن اللہ کی دہلی میں واقع حویلی کی دیواروں پر بہادر شاہ کے لکھے ہوئے کتبات اس کی فنی عظمت کی گواہی دیتے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بھی بہادر شاہ ظفر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وصلیاں محفوظ ہیں۔ اس سے قبل 1792ء میں ایک مدرسہ قائم ہوا جو بعد ازاں دہلی کالج کے نام سے موسوم ہوا۔ ہندوستان بھر میں یہ پہلا مدرسہ تھا۔ جس میں خطاطی کی باقاعدہ تعلیم کا اہتمام کیا گیا تھا، سید محمد دہلوی اس مدرسے میں بھی خطاطی کے استاد تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے دور میں یہ مدرسہ اپنے عروج پر تھا۔ بہادر شاہ ظفر کا ایک کمال یہ ہے۔ کہ وہ خط معکوس میں اعلیٰ درجے کی آرائشی خطاطی کا بھی ماہر تھا۔ خطاطی کی تاریخ میں یہ ملکہ بہت کم لوگوں کو حاصل رہا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے ہم عصر خطاطوں اور شاگردوں میں بہت سے نام قابل ذکر ہیں۔

اس زمانے میں دہلی کے نامور خطاط منشی محمد ممتاز علی نزہت رقم نے عوامی سطح پر زبردست شہرت حاصل کی۔ یہ خطاط بہادر شاہ ظفر کا شاگرد رشید تھا۔ خط نسخ میں نزہت رقم کے لکھے ہوئے

بہادر شاہ ظفر نے خط معکوس میں خصوصی مہارت کا مظاہرہ کیا

بہادر شاہ ظفر کے قلم سے خط معکوس، کا ایک نمونہ

سپردم　بتو　مایۂ　خویش　را
تو دانی　حساب　را　و بیش　را

قرآن کے نسخہ جات فن کے نادر نمونے خیال کئے جاتے تھے۔ نزہت رقم قرآن کی کتابت کے لیے حرمین شریفین کا سفر کرتا تھا۔ اور خانہ کعبہ اور روضہ رسولؐ کے قرب و جوار میں بیٹھ کر خطاطی مکمل کیا کرتا تھا۔ اور کام مکمل کر کے واپس ہندوستان آ کر اسکی اشاعت کا اہتمام کرتا تھا۔ نزہت رقم کے لکھے ہوئے ایک قرآن کی تصحیح مولانا محمد قاسم نانوتوی نے کی تھی۔ بعد میں یہ قرآن بڑے اہتمام کے ساتھ مطبع مجتبائی کے ذریعے اشاعت پذیر ہوا۔ یہ قرآن فن نسخ کا ایک نادر شاہکار تصوّر ہوتا ہے۔ نزہت رقم کے شاگردوں میں منشی محمد قاسم لدھیانوی سلطان القلم کے نام سے مشہور ہوا۔ جبکہ خود اس کے دو بیٹے منشی مشتاق علی اور منشی عبدالغنی بھی میدان خطاطی میں نمایاں شمار کئے جاتے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کے ایک اور شاگرد محمدؐ ہمایوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک چار فٹ لمبی وصلی دہلی میں فقیر اللہ علوی کے مزار پر نصب ہے۔ اس وصلی پر ایک قرآنی آیت جلی خط میں تحریر کی گئی ہے۔ جبکہ اس کے اردگرد نیلے رنگ کا حاشیہ لگا ہوا ہے۔ اسی زمانے

کا ایک اور خطاط بدرالدین مہر کن ہے۔ جس نے خط نسخ اور نستعلیق کے ساتھ ساتھ ہندی اور انگریزی خطاطی میں بھی مہارت حاصل کی۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب تمام امراء اور قابل ذکر شخصیات اپنی مخصوص مہریں بنوایا کرتے تھیں۔ ایسے تمام لوگوں کی مہریں بدرالدین بنایا کرتا تھا اسی مناسبت سے اسے مہر کن کا نام بھی دیا گیا۔ ہندو پاکستان کے لازوال شاعر مرزا اسد اللہ خان کی مہر بھی اسی نے بنائی تھی۔ بدرالدین نے اپنی بنائی ہوئی مہروں اور لکھی ہوئی وصلیوں کا ایک البم تیار کیا تھا۔ لیکن آنے والے سالوں میں یہ محفوظ نہ رہ سکا۔

بہادر شاہ ظفر کا ہم عصر ایک اور نامور خطاط سید محمد امیر رضوی ہے۔ یہ شخص خطاطی کی دنیا میں میر پنجہ کش کے نام سے جانا جاتا ہے۔ امیر علی رضوی کی دوستی محمد حفیظ خان خطاط کے شاگرد غلام محمد ہفت قلمی سے تھی۔ اس دور میں میر کلن، قادر بخش، سرب سنگھ رائے اور پچھی نارائین پنڈت بھی معروف خطاطوں میں شمار ہوتے تھے لیکن غلام محمد ساتوں مقبول خطوں یعنی نسخ، نستعلیق، تعلیق، ثلث، شکستہ، محقق اور ریحان میں بیک وقت یکساں مہارت رکھتا تھا۔ اسی مناسبت سے اسے غلام محمد ہفت قلمی کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ ہفت قلمی کی تربیت کے طفیل سید محمد امیر رضوی کا فن بھی ارتقاء کی منزلیں طے کرنے لگا۔ امیر رضوی کو قدیم اساتذہ میں سے آقا رشید دیلمی کا طرز تحریر بہت پسند تھا۔ لہذا اس نے طرز رشیدی میں ایسی زبردست مہارت کر لی۔ کہ پورے ہندوستان میں اسے آقا رشید کی طرز پر تحریر کا سب سے بڑا خطاط مانا جانے لگا۔ عوام اسکی تحریریں جمع کرنا اعزاز خیال کرتے تھے۔ وہ مختلف کاغذوں پر منفرد حروف لکھ کر جمع کرتا رہتا تھا۔ جو بھی فقیر کچھ مانگنے کے لئے آتا۔ وہ اپنے بالا خانے سے اپنے لکھے ہوئے حروف والے کاغذوں سے ایک نیچے پھینک دیتا۔ فن خطاطی کے شائقین فقیروں سے یہ کاغذ چار چار پانچ پانچ روپے میں خرید لیتے تھے۔ سید امیر رضوی خطاطی کے علاوہ سنگ تراشی، نقاشی، مصوری، لوح نویسی، جدول کشی وغیرہ میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ ان فنونِ لطیفہ کے ساتھ ساتھ اسے طاقت آزمائی شوق بھی تھا۔ پنجہ کشی میں دہلی شہر کا استاد مانا جاتا تھا۔ میر پنجہ کش نے اپنے گھر کی چھت میں لکڑی کی ایک کڑی پر یا فتاح اور بسم اللہ الرحمان الرحیم کی خطاطی کی تھی۔ یہ تحریر خطِ نستعلیق کا ایک خوبصورت نمونہ تھا۔ اس کی لکھی ہوئی ایک وصلی علی گڑھ یونیورسٹی تین قطعات کراچی نیشنل میوزیم اور کچھ وصلیاں قلعہ دہلی کے عجائب گھر میں موجود ہیں۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے دوران ایک سپاہی نے میر پنجہ کش کو گولی مار دی تھی۔ اس وقت میر پنجہ کش کی عمر 90 سال

میر پنجہ کش ساتوں مقبول خطوں پر یکساں مہارت رکھتا تھا

تھی۔ میر پنجہ کش کے ایک نامور شاگرد کا نام آغا مرزا تھا۔ یہ عیسائی مذہب کا پیروکار تھا۔ آغا مرزا نے اپنے استاد کے طرزِ تحریر میں اس قدر مشق کی۔ کہ اس کا خط میر پنجہ کش کے خط سے مماثل ٹھہرا۔ خطاطی کے نقاد بھی میر پنجہ کش اور آغا مرزا کی تحریروں میں مشکل ہی سے پہچان کر پاتے تھے۔ آغا مرزا خط نستعلیق اور خط شکستہ میں بہت نفیس خطاطی کیا کرتا تھا۔ ریاست الور کے مہاراجہ شیودان سنگھ کی فرمائش پر آغا مرزا نے گلستان سعدی کا ایک مصور نسخہ تیار کیا تھا۔ اس کی خطاطی اور تزئین پر پندرہ سال کے عرصہ میں سوا لاکھ روپے خرچ آئے۔ یہ نادر نسخہ ریاست الور کے عجائب خانے میں جبکہ ایک وصلی علی گڑھ یونیورسٹی میں آج بھی موجود ہے۔ آغا مرزا کی وفات بھی اپنے استاد میر پنجہ کش کے سال وفات یعنی 1857ھ میں ہوئی۔

لازوال شاعر مرزا اسد اللہ خان غالب کی مہر بدر الدین مہر کن کی خطاطی سے مزین ہے۔

مذکورہ بالا خطاطین کے علاوہ دہلی، لکھنو، بنارس اور دیگر شہروں میں جن خطاطوں نے نام پیدا کیا۔ ان میں سے عبدالباقی حداد نے خط نسخ میں جدت کاری سے امیر صغیر علی مرتعش قلم نے رعشہ کی بیماری کے باوجود خوبصورت ارتعاش آمیز خطاطی کر کے، حاجی حافظ منشی حاوی علی نے طغرئی نویسی میں کمال حاصل کر کے اور سوہن حلوے کی ٹکیوں پر خوبصورت قلم کاری سے شہرت حاصل کی۔ آخری عمر میں منشی حاوی علی اندھا ہو گیا تھا۔ لیکن نابینا ہو جانے کے باوجود وہ شاگردوں کی مدد سے خطاطی کا کام کرتا رہا۔ 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی نے جہاں بہادر شاہ ظفر کے عہد حکومت کا خاتمہ کیا۔ وہیں خطاطی کے طویل اور شاندار دبستان مغلیہ کو بھی اجاڑ کر رکھ دیا۔　　　(جاری ہے)

ڈاکٹر ریاض قدیر

''کارواں'' — اردو زبان کا پہلا ادبی سالنامہ

اردو کے ادبی رسائل کی تاریخ میں ''کارواں'' کو اوّلین سالنامہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ سالنامہ ''کارواں'' ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر نے محلّہ چابک سواراں لاہور سے ۱۹۳۳ء میں جاری کیا تھا۔ اس سالنامے کے دو ضخیم شمارے ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئے۔ دونوں شمارے جملہ صوری و معنوی محاسن سے مزین تھے۔

اوّلین شمارہ بابت ۱۹۳۳ء بڑی تقطیع کے ۳۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ صحت کتابت اور حسن ذوق کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ ٹائٹل کی زمین ہلکے سلیٹی رنگ کی ہے۔ اوپر سرخ زمین پر سفید خاکستری اور گہرے سرخ رنگ میں ایک نستعلیق بیل دار حاشیہ ہے اور پھر اس حاشیے کے نیچے ایک اور حاشیہ ہے، جہاں مزید نیچے ایک کبوتر ایک خوب صورت بڑی بڑی آنکھوں والی دوشیزہ کے سر کی اوڑھنی پر بطور قاصد اترتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح یہ ٹائٹل اپنی ندرت اور اعلیٰ درجے کی صناعی میں ڈھلے اور شوخ رنگوں کا جاذب نظر مرقع بن گیا ہے جو دوشیزہ اور کبوتر کی علامتوں کی رمزیت کے حوالے سے پیام و سلام محبت اور امن و آشتی کی زندگی بخش فضا کا مظہر ہے۔ اس شمارے کے محاسن ظاہری کے بارے میں اس دور کے معروف ادبی ماہنامہ ''زمانہ'' کانپور کے ایڈیٹر دیا نرائن نگم نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا۔

> ''محاسن ظاہری یعنی لکھائی چھپائی آرائش و زیبائش اور کاغذ کے اعتبار سے ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ سالنامہ ''کارواں'' لاہور سے زیادہ حسین و جمیل رسالہ اس سال ہندوستان میں کوئی دوسرا شائع نہیں ہوا۔''(۱)

سالنامہ ''کارواں'' بابت ۱۹۳۳ء میں علم و ادب اور فنون لطیفہ پر مشتمل کُل پچاسی تحریریں شامل ہیں جو نظموں، غزلوں، افسانوں، شذرات نیز علمی و تنقیدی مضامین اور غیر ملکی تراجم پر مبنی ہیں۔ آخر میں مشرق و مغرب کی تازہ مطبوعات پر تبصرے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ ان تحریروں میں نظم و نثر پر مبنی نو ادب پارے تاثیر کے قلم کا اعجاز ہیں، گویا تاثیر محض نام کے مرتب نہیں جو دیگر ادباء

وشعرا کی نگارشات عالیہ سے اپنا دفتر سخن سجا کر خود کو نامور بناتے ہیں۔ بلکہ وہ ایک فعال شاعر، ادیب اور نقاد کے طور پر اس عظیم الشان کارواں ادب کے رہرو بھی ہیں اور رہنما بھی۔ سالنامہ ''کارواں'' کے اوّلین شمارے بابت ۱۹۳۳ء کا ایک قابل ذکر امتیازی اختصاص یہ ہے کہ اس کے قلمکاروں میں علامہ اقبال کا نام بھی شامل ہے۔ علامہ اقبال کی غزل:

اپنی جولاں گاہ زیر آسماں سمجھا تھا میں
آب و گل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں

نہایت اہتمام کے ساتھ اعلیٰ درجے کی کتابت میں جلی رنگوں کے ایک منقش تابدار حاشیے سے مزین کر کے شائع کی گئی ہے۔ ''سخن ہائے گفتنی'' کے نام سے لکھے گئے دیباچے میں تاثیر نے اس غزل کی شان نزول کا پورا واقعہ بھی تحریر کیا ہے کہ کس طرح علامہ اقبال سے ''کارواں'' کے لیے غیر مطبوعہ کلام کا تقاضا کیا گیا ہے اور اقبال نے ڈاکٹر تاثیر سے ان کی غزل:

زلف آوارہ ، گریباں چاک ، او مستِ شباب
تیری صورت سے تجھے درد آشنا سمجھا تھا میں

سنی اور اس کے قافیے میں تبدیلی کر کے فی البدیہہ نئی غزل کہہ ڈالی اور ''کارواں'' کے اس شمارے کے لیے عنایت کی (۲) کارواں میں شائع ہونے والی اقبال کی اس غزل کے نیچے ''فی البدیہہ'' کے الفاظ تحریر ہیں۔

اسی طرح ''کارواں کے اس شمارے میں محمد حسین آزاد کے تحریر کردہ ایک ڈرامے ''ابوالحسن'' کا پہلا ایکٹ بھی شائع ہوا ہے۔ یہ تحریر بھی ایک ادبی نوادر ہے جو محمد حسین آزاد کی ایک نامعلوم ادبی جہت کو سامنے لاتی ہے۔

اردو ادب کی معاصر نمائندہ تحریروں کے علاوہ عالمی ادب سے انتخاب اور دیگر زبانوں کے کلاسیکی ادب پاروں کے تراجم نیز آرٹ اور فنون لطیفہ پر تنقیدی مضامین نے مجلّے کو نہایت وقیع بنا دیا ہے۔ فن مصوری کے چوبیس شاہکار بھی اس شمارے کی زینت ہیں۔ مصور مشرق عبدالرحمٰن چغتائی کے فنی شاہکاروں کے ساتھ ساتھ معروف مغربی مصوروں کی نمائندہ تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔ ان تصاویر میں ایک ہفت رنگ ہے۔ دو تصاویر چہار رنگی ہیں۔ سات تصاویر سہ رنگی ہیں، تین تصاویر دو رنگی اور گیارہ تصاویر یک رنگی ہیں۔ ''سخن ہائے گفتنی'' کے نام سے تاثیر نے جو دیباچہ تحریر کیا ہے۔ وہ بذات خود ایک علمی وتنقیدی مقالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں ملک کی علمی ادبی فضا، فنون لطیفہ کی صورت حال اور فروغ ادب وفن کے تقاضوں پر بھرپور انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس دور میں ملک کی علمی وادبی صورت حال میں اس مجلّے کی ضرورت واہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ اور ''کارواں'' کے اجراء کے درج ذیل مقاصد بیان کیے گئے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مشرق و مغرب کے علوم و فنون کا معیاری رسالہ

سالنامہ کاروان ۱۹۳۳ء

مرتبہ

پروفیسر تاثیر ایم۔اے

منیجر رسالہ کاروان چابک سواران۔لاہور

قیمت عہ

فہرست مضامین

ب

ج

تصاویر

غزل علامہ سر اقبال	ہفت رنگ
اقبال اور چغتائی	سہ رنگ
عمل چغتائی	سہ رنگ
عمل چغتائی	سہ رنگ
اثر الہ بخش	سہ رنگ
عمل اصغر	سہ رنگ
عمل قادری	سہ رنگ
مغربی عمر خیام (پوگینی)	سہ رنگ
جدید مغربی آرٹ	چار رنگ
آہنگ خطوط	چار رنگ
اعتماد الدولہ آگرہ	دو رنگ
پنج محل سیکری	دو رنگ
مغربی آرٹ (ڈیولک)	دو رنگ
اثر بہزاد	یک رنگ
اثر بہزاد	یک رنگ
عمل رضا عباسی	یک رنگ
عمل رضا عباسی	یک رنگ
جاپانی آرٹ	یک رنگ
سلطان محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ	یک رنگ
اثر امیر علی	یک رنگ
اثر آقا عبد الرشید دیلمی	یک رنگ
جدید فوٹو گرافی	یک رنگ
جدید سنگ تراشی	یک رنگ
قدیم سنگ تراشی	یک رنگ

۱۹۳۴ عیسوی

کاروان چابک سواران لاہور

فہرست مضامین

نظم

تبصرے

فہرست تصاویر

۱- طویل اور سنجیدہ علمی و تحقیقی مضامین و مقالات کے لیے وسعت اور گنجائش پیدا کرنا جو معمولی ادبی رسالوں میں نہیں سما سکتے۔
۲- فن مصوری اور تصویر شناسی کا ذوق پیدا کرنا۔
۳- نوجوان ادباء اور شعراء کی حوصلہ افزائی کرنا۔
۴- نئے اور معیاری ادب کی نمائندگی۔
۵- فوٹوگرافی اور آرٹ کے نئے رجحانات سے قارئین کو متعارف کروانا۔
۶- دیگر زبانوں کے علوم وفنون سے اردو قارئین کو آگاہ کرنا۔

مجلّے کے اختتام میں "استدعا" کے عنوان سے تحریر میں "کارواں" کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ "یہ اپنی طرز اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل نئی چیز ہے۔ اگرچہ یورپ میں اکثر علمی رسائل سال میں صرف ایک ہی بار شائع ہوتے ہیں لیکن ہندوستان میں اپنی قسم کی یہ پہلی کوشش ہے جو سالنامہ کارواں کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے۔ رفتہ رفتہ ہر حیثیت سے اعلیٰ پایہ کے مغربی رسائل کے برابر دلچسپ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔"(۳)

"کارواں" اپنے اس دعوے پر صرف دو سال تک عمل کر سکا۔ تاثیر کی سیمابی طبیعت انھیں نئے نئے علمی محاذوں پر سرگرم رکھتی تھی۔ ان کی علمی سرگرمیوں کے کئی رخ تھے۔ حصول علم کی تڑپ ان کے سینے میں ہمیشہ موجزن رہی۔ لہٰذا وہ ۱۹۳۳ء کے آخر میں اعلیٰ تعلیم (پی ایچ ڈی) کے حصول کے لیے عازم لندن ہوگئے۔

تاثیر کی عدم موجودگی میں "کارواں" کا صرف ایک اور شمارہ ۱۹۳۴ء میں منظر عام پر آسکا، جسے مجید ملک نے مرتب کر کے شائع کیا۔

"کارواں" کا یہ دوسرا شمارہ بھی اپنی ضخامت، موضوعات کی وسعت، علمی و ادبی معیار اور طباعت کی تاب وتب کے اعتبار سے پہلے شمارے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اس شمارے کا ٹائیٹل بھی مصوری کے اعلیٰ نمونے کا مظہر ہے۔ "سالنامہ کارواں" کے جلی حروف کے دونوں طرف جنگلی پھولوں کے پس منظر میں دو دو ہرنوں کی تصاویر فطرت کے حسن اور معصومیت کا گہرا تاثر چھوڑتی ہیں۔

۳۴۵ صفحات کی ضخامت کے اس مجلّے میں مختلف علمی، ادبی اور فنی اور موضوعات پر مبنی نظم و نثر کے چوہتر (۷۴) ادب پارے شامل کیے گئے ہیں۔ رسالے کے مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے قارئین کے ذوقِ مصوری کی تسکین کے لیے اڑتیس (۳۸) شاہکار تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔ جن میں ایک تصویر چھ رنگی، ایک چہار رنگی، سات تصاویر سہ رنگی، پانچ تصاویر دو رنگی اور چوبیس تصاویر یک رنگی ہیں۔

سالنامہ ''کارواں'' کے دونوں شماروں ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۴ء کے سرورق پر ''مشرق و مغرب کے علوم و فنون کا بہترین مرقع'' کے الفاظ تحریر کیے گئے ہیں۔ مجلّے کے دونوں شماروں کے مندرجات اور تصاویر پر نظر ڈالنے سے اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ ان دونوں شماروں میں مختلف علمی، ادبی اور فنی موضوعات پر ملکی و غیر ملکی ادباء و شعرا اور ناقدین فن کی ایک سو انسٹھ (۱۵۹) تحریریں جمع ہوگئی ہیں جو اعلیٰ فنی معیارات کی حامل ہیں۔ اس طرح قومی و بین الاقوامی مصوری کے باسٹھ (۶۲) شاہکار قارئین کے ذوق نظر کا سامان مہیا کرتے ہیں۔

سالنامہ ''کارواں'' کے دونوں شمارے اردو زبان و ادب کے صفِ اول کے لکھاریوں کی نگارشات سے مزین ہیں۔ جن میں علامہ محمد اقبال، مولوی عبدالحق، حافظ محمود شیرانی، اکبر الہ آبادی، رشید احمد صدیقی، سید سلیمان ندوی، عبدالرحمٰن بجنوری، یاس یگانہ چنگیزی، اصغر گونڈوی، عبدالرحمٰن چغتائی، عبدالقادر سروری، محی الدین قادری زور، امتیاز علی تاج، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، پطرس بخاری، حفیظ جالندھری، عبدالمجید سالک، محمود نظامی، حجاب اسماعیل، ناطق گلاٹوی، ثاقب کانپوری، غلام رسول مہر، عبداللطیف تپش اور رسا جالندھری جیسے نام شامل ہیں۔

''سالنامہ'' کارواں کے ان شماروں میں اردو ادب کے تازہ اور منتخب ادبی فن پاروں کے متوازی عالمی کلاسیکی ادب (عربی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی وغیرہ) سے تراجم بھی شاملِ اشاعت کیے گئے تاکہ قارئین دیگر زبانوں کے علوم و فنون اور عالمی ادبی معیارات کا شعور حاصل کرسکیں۔

سالنامہ ''کارواں کے صرف دو شمارے اشاعت پذیر ہو سکے۔ تاثیر کی لندن روانگی کے باعث ''کارواں'' اپنا سفر جاری نہ رکھ سکا۔ تاہم ادبی رسائل کی تاریخ میں ''کارواں'' کا نام اس حوالے سے ہمیشہ زندہ رہے گا کہ یہ اردو زبان میں شائع ہونے والا اوّلین سالنامہ ہے جس نے اردو رسائل کے سالناموں اور سالانہ ادبی انتخابات کے مجموعے شائع کرنے کی بنیاد رکھی۔

☆☆☆

حواشی:

۱- ماہنامہ ''زمانہ'' کانپور جلد ۶۰ نمبر ۵ بابت مئی ۱۹۳۳ء، ص ۳۱

۲- سالنامہ ''کارواں'' لاہور ۱۹۳۳ء، ص ۶، ۷

۳- ایضاً، ص ۳۱۳

(بشکریہ ''دریافت'' اسلام آباد)

● ● ● ● ● ● ● ● ● ● ● ● ● ● ● ● ●

اردو ادب کا ممتاز ترین نام

شاعرِ رومان اختر شیرانی

کے صد سالہ جشن ولادت کے موقع پر

سہ ماہی سورج میں گوشۂ اختر

صاحبِ گوشہ کی غیر مطبوعہ تحریروں

اور تصویروں سے مزین

انتظار فرمائیے

ادارہ

داستان طرازی

عادل ندیم
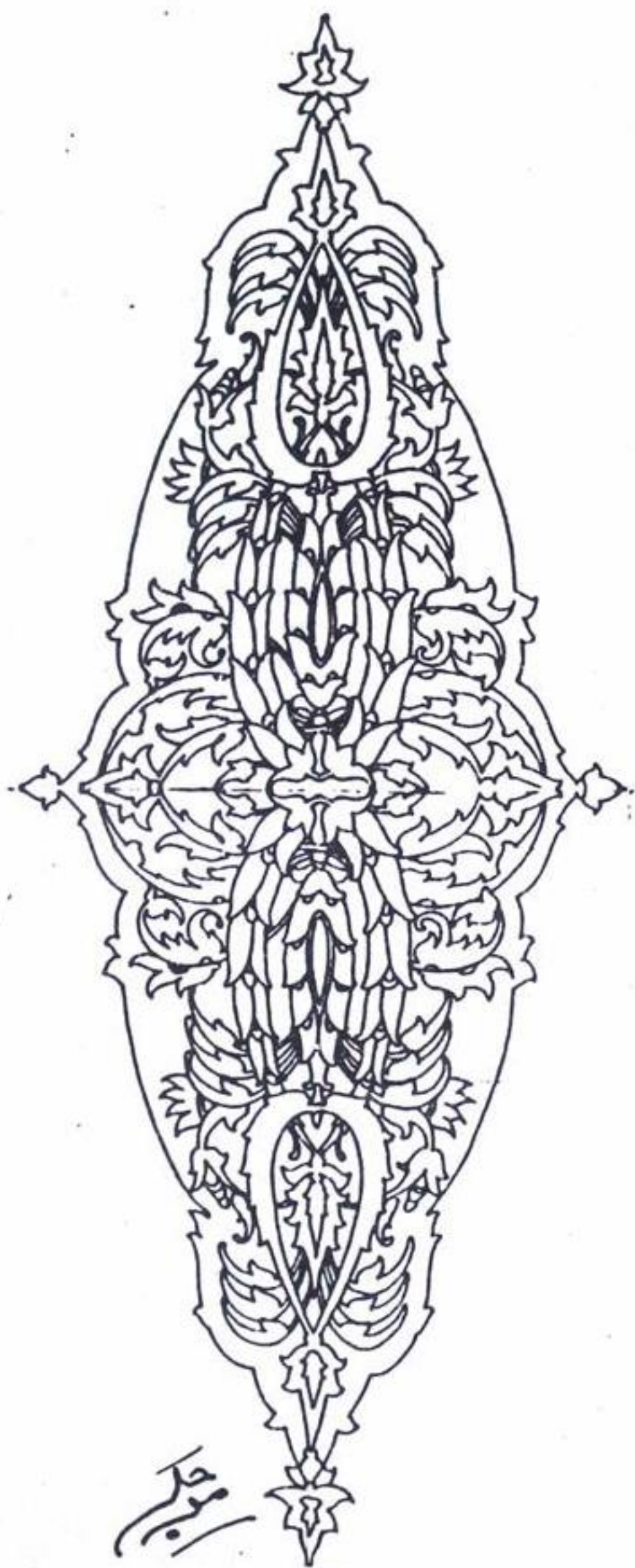
پومپی آئی کا آخری مسیحا

جدید ترین ماڈل کی بیش قیمت گاڑی میں بھی اتنی چمک دمک نہیں تھی جتنے لشکارے اس کے دل سے نکل رہے تھے۔ سٹرنگ پر اپنے ہاتھ کو وہ ذرا بھر بھی جنبش دیتا تو اس کی انگوٹھی کا ستر زاویوں سے تراشیدہ ہیرے کا نگ مہر نیمروز بن کر چمکنے لگتا۔

پورے ڈیڑھ ماہ کی بے حد آرام دہ اور پر تعیش مصروفیت کے بعد وہ یوں گھر لوٹ رہا تھا کہ اس کی کوٹ کی جیبیں بڑی کرنسی کے نوٹوں اور کھلے چیکوں سے بھری ہوئی تھیں۔ گاڑی کی پچھلی کشادہ سیٹوں پر پلاٹینم اور ہیروں کے جیولری سیٹ مخملیں ڈبوں میں پیک کیے رکھے تھے اور اس کے علاوہ قیمتی تحائف آرائشی مصنوعات اور خوشبوؤں کے خوبصورت ڈبے تھے۔

اس بار کا دورہ ضرورت سے زیادہ کامیاب رہا تھا اس نے صاعقہ کی تمام فرمائشیں پوری کر دی تھیں۔ فراعین مصر کی سی تمکنت اور تکبر کے ساتھ اس نے گردن گھما کر ایوان دستور کی کشادہ شاہراہ کے اردگرد ایستادہ بقعہ نور بنی فلک بوس عمارتوں اور فن تعمیر کے نرالے ڈیزائنوں پر بنی پر شکوہ رہائشی عالیشان کوٹھیوں کو بڑی حقارت سے دیکھا اور اس کے لبوں پر تبسم نیل و فرات کی موجوں کی طرح رقص کرنے لگا۔

اسے یوں لگا جیسے ان عالیشان محلات اور فلک بوس پلازوں کے ملکیت و مالک غلامان حرم کی مانند اس کے سامنے گردنیں جھکا کے قطار میں کھڑے ہیں۔ اس کا یہ غرور اور یہ تکبر غلط نہیں تھا۔

ملک کے ان بے تاج بادشاہوں' اقتصادیات پر حاوی چند خاندانوں' بین الاقوامی شہرت کی حامل شخصیتوں' خانقاہوں کے عیاش طبع سجادہ نشینوں عوام کے نام نہاد سیاسی لیڈروں اور بہی خواہوں اور فرمانرواؤں کی اس آبادی کے بیشتر مکینوں کے گھناؤنے افعال اور رازوں کا وہ واحد امین تھا ان سب کا کسی نہ کسی طور رازداں بھی تھا اور مسیحا بھی وہ ان سب کے لیے مرکز اماں تھا۔

اپنے عہد کا راسپوتین لیکن جو ناقابل یقین اور ناقابل بیان قوت فطرت نے اسے عطا کی تھی وہ

اس کے لبوں پر تبسم نیل و فرات کی موجوں کی طرح رقص کرنے لگا۔

اپنے عہد کے راسپوتین سے بھی سوا تھی۔ وہ جب چاہتا جہاں چاہتا تھوڑی سی مشقت کے بعد دیواروں، دبیز پردوں، آہنی شٹروں کے پیچھے جو کچھ ہو رہا ہوتا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا۔

پیراسائیکولوجی انسانی جسم کی مخفی قوتوں کیمیائی عوامل کی تحقیق اور مطالعے کے بعد بھی جب اسے کوئی سراغ نہ ملا تو اس نے اس بات پر یقین کرلیا کہ اسے جو کچھ بھی ملا ہے وہ اپنی بصیرت سے محروم ماں سے ملا ہے۔

اس کی ماں پیدائشی اندھی تھی دنیا کے لیے اس کی آنکھیں اندھے کنوؤں کی طرح اندھیری تھیں لیکن خود اس نے ان اندھیری آنکھوں میں اکثر اوقات بجلی کے کوندے کی سی چمک دیکھی تھی۔ شاید اس کے باپ نے بھی ان ہی آنکھوں میں پورا جگمگاتا شہر دیکھا ہوگا جو وہیں اپنا نشیمن آباد کرلیا تھا ماں تھی تو اندھی لیکن اس کے جسم کا پور پور ایک کمپیوٹر چپ تھا جو اسے سماعت کے ساتھ بصیرت بھی دیتا تھا۔ وہ قدموں کی آہٹ سے انسان کی عمر اور جنس جان لیتی، گفتگو سے چہرے کے تاثرات اور طرز گفتگو سے مزاج جان لیتی، آواز کے زیروبم سے لبوں کی مسکراہٹ، پیشانی کی سلوٹیں تک دیکھ لیتی، ہاتھوں کی لمس سے طرز تحریر اور رنگ پہچان لیتی۔

دنیا کے لیے اس کی آنکھیں اندھے
کنوؤں کی طرح اندھیری تھیں

لیکن وہ تو آنکھوں والا تھا۔ شاید یہی تمام خصوصیات کسی طور مرتکز ہو کر اس میں ایک انجان، ناقابل یقین، ناقابل بیان صلاحیت بن کر عود کر آئی تھی اور اس نابغہ صلاحیت کا انکشاف اس وقت ہی ہو گیا تھا جب وہ بہت چھوٹا تھا اور جب اس نے اپنے تایا کے گھر ان کی پالتو کتیا کو دیکھ کر کہا تھا۔

تایا اس کے پیٹ میں تو چار بچے ہیں تین سفید اور ایک چتکبرا، آپ چتکبرا بچہ مجھے دینا تایا۔ میں پالوں گا اسے۔

تایا اس کی بات سن کر بہت ہنسا تھا تو گویا تمہیں کتیا کے پیٹ کے اندر کے بچے نظر آ رہے ہیں بیٹا۔

ہاں تایا، سچ مچ نظر آ رہے ہیں بس میں ہی لوں گا یہ چتکبرا بچہ۔

اب جب کبھی وہ سوچتا تو اسے اچھی طرح یاد آتا کہ اس وقت اسے اپنے اوپر عجیب سی کیفیت طاری ہوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی کھچے کھچے اعصاب جسم میں ہلکی ہلکی سی لرزش پلکوں میں ٹھہراؤ اور آنکھوں میں ایک مقناطیسی دباؤ اور یہ سب کچھ چند لمحوں کے لیے ہوا اور جب وہ نارمل حالت میں آیا تو

کتیا محض کتیا رہ گئی اور اس کے بچے غائب ہو گئے۔

اور کچھ دنوں بعد جب کتیا نے بچے دیے تو اس کا تایا دوڑا دوڑا گھر آیا اور اس کی ماں کو سب کچھ بتا دیا کتیا کے چار بچے ہوئے تھے تین سفید اور ایک چتکبرا سارے گھر میں اس بات کا چرچا ہوا تو ضرور لیکن سب نے اسے محض اتفاق سمجھ کر بھلا دیا لیکن اس کی ماں نہ جانے کیوں فکر مندسی ہو گئی وہ اس سے بار بار اس واقعہ کی تفصیلات حاصل کرتی اور مزید فکر مند ہوتی جاتی۔

دوسری بار اس پر یہ کیفیت اس وقت طاری ہوئی جب وہ ہوشمند نوجوان تھا اور کالج کے ہوسٹل میں رہائش پذیر تھا۔ ہوسٹل کی پچھلی دیوار ایک تنگ گلی کے ساتھ تھی جہاں ایک اچھا خاصہ گنجان محلہ آباد تھا۔ نچلے اور درمیانہ درجہ کے لوگوں کے گھر تھے۔ ہوسٹل کی کھڑکیاں اسی گلی میں کھلتی تھیں اس کے کمرے کی عین پشت پر ایک بے حد شریف صاحب رہتے تھے جن سے اس کی دعا سلام بھی تھی اس روز رات کے پہلے پہر وہ چند لمحوں کے لیے کھڑکی کے باہر جا کر کھڑا ہوا تو اس پر وہی کیفیت طاری ہو گئی جسم کے اعصاب کھنچ گئے پلکیں جھپکنا بند ہو گئیں آنکھوں میں مقناطیسی دباؤ محسوس ہونے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سامنے والے مکان کی دیواریں جیسے ہوا میں تحلیل ہو گئیں اور اندر جو کچھ ہو رہا تھا وہ صاف صاف نظر آنے لگا۔ اس گھر کا راز یوں تشت از بام ہوا کہ وہ شرم سے پانی پانی ہو گیا۔

اس رات وہ تمام رات نہ سو سکا۔ ایک جرم کا احساس تمام شب اس پر ندامت کے کوڑے مارتا رہا اس سے ایک ایسا اخلاقی جرم سرزد ہوا تھا جس میں اس کی رضا ہرگز نہ تھی۔

تیسری بار یہ کیفیت اس پر اپنے گھر میں آدھی رات گئے طاری ہوئی۔

ساتھ والے کمرے میں اس کا والد جیسا بڑا بھائی اور ماں کے بعد ماؤں جیسی بھابھی رہتے تھے۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سب کچھ دیکھا جس سے احترام اور عقیدت کی نفی ہوتی تھی۔ احترام انسانیت کی نفی ہوتی تھی۔ اس کی اپنی تذلیل نفس ہوتی تھی۔

ندامت، شرمندگی اور احساس جرم کی بنا پر وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا تھا۔ ہوسٹل کے ساتھ والی گلی کے مکان میں اس نے ایک ایسا ہی منظر دیکھا تھا اور وہ بہت شرمندہ ہوا تھا لیکن وہ لوگ پھر بھی غیر تھے اور اس بار احساس جرم میں اتنی شدت نہیں تھی لیکن اس بار اس نے جو کچھ دیکھا وہ اسے ناکردہ گناہ کی سولی پر لٹکا گیا۔

اس رات کا بقیہ حصہ اس نے جیسے انگاروں پر لیٹے ہوئے گذارا اور صبح کاذب سے پیشتر ہی گھر سے باہر نکل پڑا تمام دن ادھر ادھر آوارہ گھومتا رہا۔ گھر لوٹنے اور بھائی اور بھابھی کو دیکھنے کی ہمت ہی

اس رات کا بقیہ حصہ اس نے جیسے انگاروں پر لیٹے ہوئے گذارا

نہ ہوئی اور پھر اسی روز اس نے اپنا گھر اور اپنا شہر ہی چھوڑ دیا۔

پہلے اس نے کسی تجربہ کار ڈاکٹر سے مشورہ لینے اور علاج کرانے کے متعلق سوچا لیکن اسے کوئی بھی جسمانی عارضہ نہیں تھا ڈاکٹر سے کیا بات کرتا اور کونسا علاج کراتا۔ پھر اس نے کسی ماہر نفسیات معالج سے ملنے کا سوچا لیکن انجانے اندیشوں اور وسوسوں نے اسے یہ بھی نہ کرنے دیا اور اس نے خود کو تقدیر کے سپرد کر دیا۔

اور قسمت کے متعین کردہ ان ہی راستوں پر ایک دن اسے صاعقہ مل گئی۔

صاعقہ پڑھی لکھی اور بے حد ذہین لڑکی تھی ملک کے ایک بہت بڑے صنعت کار کی لڑکی جس میں زر و دولت کی طمع اور حصول زر و نشاط کے لیے سب کچھ کر گزرنے کا گر موروثی تھا۔ صاعقہ نے جب اس کی سرگزشت سنی تو وہ حیران ہونے اور اس کا سبب جاننے کی بجائے اس خداداد صلاحیت سے فوائد حاصل کرنے کی منصوبہ آرائیاں کرنے لگی اور پھر اس کی چشم بینا نے روئے گیتی پر ایک ناقابل یقین' ناقابل شکست اور ناقابل فہم کاروبار کا شاندار مستقبل دیکھ لینا اور پھر اس کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔ سب سے پہلے اس نے اس قوت کو اس کی مرضی کے تابع کیا تھوڑی سی مشقت اور توجہ کے بعد فوراً ہی اسے اس قابل بنا ڈالا کہ وہ جب چاہے جہاں چاہے اپنے آپ پر وہ کیفیت طاری کر لے۔

ان دونوں نے ملک کر شہر کی بڑی بڑی کاروباری' سیاسی' سماجی شخصیتوں کی فہرستیں مرتب کیں ان کے خاندانی' ذاتی کوائف اور ازدواجی تعلقات کی پوشیدہ رپورٹیں حاصل کیں۔ ملازمتوں کی تلاش میں سرگرداں پڑھے لکھے نوجوانوں کو مستقبل کے مشروط مشاہروں کا لالچ دے کر انہیں کوائف اکٹھا کرنے پر معمور کیا اور اس طرح مخبروں اور جاسوسوں کی اچھی خاصی تعداد مصروف عمل ہوگئی نتائج توقع سے زیادہ بار آور نکلے اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے ان کا یہ انوکھا کاروبار ترقی کے تمام مدارج چشم زدن میں طے کر گیا اور پھر یہی کامیابی ان دونوں کی شادی کا سبب بن گئی اور اس طرح شادی کے بعد وہ ملک کے ان بے تاج فرمانرواؤں کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ جو خود ہی مجرم تھے خود ہی مجرموں کو پناہ دینے والے بھی اور خود ہی انصاف فراہم کرنے والے بھی۔

ابتدائی ایام میں وہ اکثر عالم تذبذب' بے بسی اور احساس ندامت میں مبتلا ہو جاتا۔ بعض اوقات وہ ایسے مناظر دیکھتا جو اسے اخلاقاً نہیں دیکھنے چاہئیں تھے۔ جن فطری عوامل کو قدرت بھی راز میں رکھتی ہے اس کے سامنے عریاں ہو کر آ جاتے وہ حیرت زدہ کر لیکن مایوس اور پریشان زیادہ ہوتا یہ دیکھ کر کہ دنیا میں لوگوں کا ایک دوسرے پر اعتبار اور اعتماد ختم ہو چکا ہے اولاد والدین پر اور والدین اولاد پر بھروسہ نہیں کرتے شوہر بیویوں اور بیویاں شوہروں کی خلوتوں پر مشکوک رہتے ہیں۔ صاحبان اقتدار اپنے شرکائے کار کی سراغرسانیاں کرتے ہیں ان کے ہر اقدام کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں اور شرکائے کار

اپنے مفاد کے اہداف تک پہنچتے ہی صاحبان اقتدار کی قبریں کھودتے ہیں۔ منصب انصاف پر بیٹھے لوگ مروج قوانین کی تشریح کسی کی جنبش ابرو کے مطابق کرتے ہیں۔

بے گناہوں کے لیے نظریہ ضرورت کی سولیاں گاڑھی جاتی ہیں اور وطن دشمن لوگوں کو منصب اعلیٰ پر فائز کیا جاتا ہے۔

یہاں بھی صاعقہ ہی نے اسے اس اذیت سے نجات دلائی اس نے ہی اسے احساس دلایا کہ اس کے سامنے جو کچھ ہو رہا ہے اس کا عمل نہیں ہے بلکہ وہ تو مکاری فریب' اور بغاوتوں اور سازشوں کو بے نقاب کر کے لوگوں کو ان کے نقصانات سے بچا لیتا ہے اور جب وہ یہ کار نیک کر ہی رہا ہے بقائے بہبود کے لیے تو اسے منہ مانگا معاوضہ لینے کا حق بھی حاصل ہے۔

بے گناہوں کے لیے نظریہ ضرورت کی سولیاں گاڑھی جاتی ہیں

اور اس طرح زیرز میں نفرتوں' عداوتوں' سازشوں اور وطن فروشی کا لاوا ابلتا رہا اور اوپر بہت اوپر اس نے آسائشوں' دولت کی فراوانی' دنیاوی نعمتوں کی علیحدہ دنیا آباد کر لی۔

سارا شہر' سارا ملک اس کے سامنے ایک بازیچہ اطفال بن گیا۔ ہر روز و شب ایک نیا تماشہ ہوتا۔ بین الاقوامی شہرت رکھنے والے' اخبارات کی سرخیاں بننے والے' عوام کے نام نہاد لیڈروں سیاستدانوں' رقہ پوشوں' سرداروں' خانقاہوں کے سجادہ نشینوں' معیشت پر قابض چند خاندانوں کے بیشتر لوگوں کے نام اس کی فہرست میں ہمیشہ شامل رہتے۔ وہ ان سب کا مونس خاص' ان کا رازداں' ان کا مسیحا بن گیا۔

اپنے اس محیر العقول کاروبار کے سلسلہ میں وہ اکثر گھر سے باہر رہنے لگا' دنوں' ہفتوں اور پھر مہینوں ایسی مصروفیات ہوتیں کہ گھر کی خبر نہ رہتی' مناسب اوقات اور مناسب مقامات کی تلاش اور مناسب مواقع کی تلاش میں کئی کئی ہفتے گذر جاتے تب جا کر کہیں شکار اس کے جال میں پھنستا' پھر اسی تگ و دو اور متعلقہ کامیابی کے بعد حسب خواہش کثیر اور بھاری معاوضہ وہ پہلی قسط میں ہی وصول کر لیتا۔ باہر شام بھیگ رہی تھی اور شہر کی یہ سب سے بڑی شاہراہ رنگ و نور میں ڈوبی ہوئی تھی۔

ڈلیش بورڈ سے قیمتی سگریٹ اٹھا کر اس نے اپنے لبوں سے لگایا اور لائٹر نکالنے کے لیے جب اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو مادام کرمانی کا دیا ہوا چیک ہاتھ میں آ گیا چیک میں جانی پہچانی کولون کی خوشبو بسی ہوئی تھی کولون کی وہی مخصوص خوشبو جو ہر شب شہر کے کسی نہ کسی نوجوان کے اعصاب پر فردوس بریں کے

نشے کی طرح غالب آ جاتی اور پردہ مادام کرمانی کی آسودہ آغوش میں ہر تعمیل حکم کے لیے موجود رہتا۔

مادام کرمانی کو اندیشہ تھا اور یقیناً بجا اندیشہ تھا کہ ان کا کروڑ پتی خاوند اپنی پہلی بیوی کے لڑکوں کے ساتھ مل کر اپنی املاک سے مادام کو محروم کر رہا ہے اس سلسلہ میں جب اس کی خدمات حاصل کی گئیں اور مادام نے اسے ایک ایسے مقام پر جا بٹھایا جہاں ملحقہ کمرے میں ان کا خاوند' پہلی بیوی کے لڑکے اور دوسرے اہل خانہ منصوبہ بندی کر رہے تھے تو مادام کے اندیشے صحیح نکلے اور اس کام کے لیے معاوضہ کی بھاری رقم کا پہلا چیک آج اس کی جیب میں تھا۔

دائیں جانب مرکز کا سب سے بلند اور وسیع پلازا تھا اور اسی پلازہ کی ایک منزل میں سیٹھ حسن نواز گردیزی نے اپنے اور اپنے احباب کے لیے ناز نوش اور عیش وطرب کے لیے جگہ بنائی ہوئی تھی شہر کے بیمار ذہن اذیت پسند سفاک اہل ثروت یہاں اکٹھے ہوتے اور بازاروں' محلوں اور گلی کوچوں سے اٹھائی ہوئی کم عمر بچیاں اپنی جاں سے گذر جاتیں۔ دوسرے روز ان کی لاشیں گذرگاہوں' پارکوں اور ویرانوں سے ملتیں تو متعلقہ ادارے کسی جنونی قاتل کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتے۔ ایسے ہی ایک متعلقہ ادارے کے ایک افسر نے اپنے طور پر پلازہ کے ایک گوشہ میں اسے بٹھا کر اس بربریت کی تصدیق تو اس سے کروالی اور اس کا اچھا خاصہ معاوضہ بھی اسے ادا کیا لیکن اسے اپنی زبان بند رکھنے کا مزید معاوضہ دے کر اس شہر سے اپنا تبادلہ کروالیا۔

معاوضہ کی بھاری رقم کا پہلا چیک
آج اس کی جیب میں تھا

دائیں جانب ایوان ہائے اقتدار کی پرشکوہ عمارت تھی نیلے نیلے پہاڑوں اور چھتنار درختوں کے درمیان گنبدوں' محرابوں اور کنگروں سے آراستہ خوابوں کے محل جیسی عمارت جس کی دیواروں کے پیچھے سیاست دوراں کی اجنبی کہانیوں اور واقعات کے سربستہ راز پوشیدہ تھے جہاں عصر رواں کے صاحبان اقتدار اور مصروف سیاسی پارٹیوں کے مخصوص خفیہ اجلاس بھی ہوتے اور اقتدار کی بحالی اور حصول کے لیے رسہ کشی بھی ہوتی۔ جہاں وفاداریاں خریدی اور بیچی جاتیں۔

یہاں کے متعلقہ لوگوں کی ایک اچھی خاصی تعداد اس کی فہرست میں شامل تھی۔ اسے ان لوگوں کے لیے کام کرنا پسند تو نہیں تھا اور معاوضہ بھی بس یونہی خانہ پری کے لیے ہوتا لیکن دوسرے بہت سے کام ایسے ہوتے جہاں یہ لوگ بڑے کارآمد ثابت ہوتے ان کی شناسائی کی بنا پر بہت سے ایسے مقفل

دروازے بھی کھل جاتے جن کی چابیاں نہیں ہوتیں۔ سامنے چھتنار درختوں کے جھرمٹ میں اس کے محل نما عالیشان مکان کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ اس نے مسکرا کر ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبایا اور سامنے کا بھاری بھرکم بہت اونچا آہنی گیٹ آہستہ سے کھل گیا اندر سیکورٹی کا چاق و چوبند عملہ اسلحہ سے لیس ڈیوٹی پر مستند تھا۔

بہت سے ایسے مقفل دروازے بھی کھل جاتے جن کی چابیاں نہیں ہوتیں۔

اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دائیں جانب کے برآمدے میں سیٹھ فتح نصیب میمن کی لیموسن کھڑی ہے۔

سیٹھ فتح نصیب میمن اس کا نیا گاہک تھا جو اس کے لیے پریشانی اور تشویش کا باعث بن رہا تھا پچھلے تین ماہ سے وہ اسے ہر ماہ باقاعدگی سے ایک خطیر رقم بطور معاوضہ دے رہا تھا لیکن ابھی تک اس نے کوئی بھی کام نہیں بتایا تھا۔ سیاہ رنگت' مکروہ صورت گفتگو میں طنز' تحکم اور تمسخر رکھنے والا سیٹھ اس کے لیے یقیناً پراسرار بنتا جا رہا تھا۔ اس کے سیکورٹی کے عملہ کے افسر نے اسے بتایا کہ سیٹھ صاحب پچھلے دو دنوں سے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں اور اس کی آمد کے شاید منتظر بھی ہیں۔

اندیشوں کا بہت بڑا اہشت پا یکلخت اس کے اندر سے ہی بیدار ہو کر باہر آ گیا۔ وہ محرابوں اور طاقچوں والی رہگذر سے ہوتا ہوا دیوان عام کی طرز کے بڑے ہال میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ کونے میں رکھی آبنوسی میز پر سیٹھ نصیب کا بریف کیس اور کوٹ رکھا ہے۔ سامنے اس کی خوابگاہ تھی جس کا منقش شیشوں اور قیمتی سنہری دھات سے ڈھلا دروازہ بند تھا وہ وہیں تھکا تھکا سا صوفہ پر بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں پر رکھا لیکن سلگائے بغیر سامنے رکھے ایش ٹرے میں واپس رکھ دیا۔

بہت دنوں بعد آج پہلی بار اسے تھکن کا احساس ہوا۔ سامنے دیوار پر ٹنگے کیلنڈر میں چھپے بڑے واضح حرفوں میں اس نے آج کا دن اور تاریخ دیکھنے کی کوشش کی پر اسے محسوس ہوا جیسے کیلنڈر کے گرد دھواں سا پھیلا ہوا ہے اور وہاں لفظوں اور حرفوں کی جگہ صرف دھبے سے رہ گئے ہیں۔ وہ نہ جانے وہاں کتنی دیر بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے اعصاب کھچنے لگے پھر آنکھوں کی پتلیاں تھرکنی بند ہو گئیں اور تمام جسم پر ایک مقناطیسی قوت کا دباؤ بڑھنے لگا۔

آج کی اعصاب شکنی ماضی کی اعصاب شکنی سے بدرجہا زیادہ تھی اور آج کے مقناطیسی دباؤ سے

پھراس کے سامنے اس کی خوابگاہ کی دیواریں موم کی طرح پگھلنے لگیں

اس کا سارا وجود پامال ہو رہا تھا۔

اور پھر۔

پھراس کے سامنے اس کی خوابگاہ کی دیواریں موم کی طرح پگھلنے لگیں کمخواب کے پردے راکھ بن کر جھڑنے لگےاور خوابگاہ کا منظر نیزے کی انی بن کر اس کی روح اور جسم میں گہرائی تک اتر گیا۔ بڑی مشکل سے صوفہ کا سہارا لے کر وہ اٹھا اور ساتھ والی کھڑکی کے پاس دیوار پکڑ کر کھڑا ہو گیا خوابگاہ اس کی پشت پر تھی۔

دیوار کا سہارا لینے کے لیے اس نے اپنا بایاں ہاتھ اٹھایا تو اس کی انگوٹھی کے ستر زاویوں سے تراشیدہ ہیرے سے روشنی کی لکیر باہر نکلی لیکن رسی کی مانند اس کے وجود کے گرد لپٹ گئی۔ کھڑکی کے باہر بھی ایک قیامت برپا تھی اس نے دیکھا کہ باہر ارد گرد چہار سو سارا شہر تہہ و بالا ہو چکا ہے۔ سارے شہر کی عمارتیں راکھ بن چکی ہیں اور اس کے مکینوں کا ایک جم غفیر اس کے گھر کے گرد جمع ہو چکا ہے۔

ان تمام لوگوں کی نگاہیں اس پر مرتکز ہیں اور وہ اپنی انگوٹھی کے ہیرے سے نکلتی روشنی کی لکیر سے ننگا جھول رہا ہے۔

☆......☆......☆

محمد سعید شیخ

بساط

یہ غرور حسن نہیں تھا۔ غرور ذات تھا، اپنے ہونے کا احساس تھا جو دور سے گھمنڈ نظر آتا تھا۔ لیکن یہ رویہ، یہ انداز ارادی نہیں تھا شعوری نہیں تھا، ایک شوخ رنگ کی طرح اس کی ہستی پر چڑھ گیا تھا، بہت گوڑھا ہو گیا تھا۔

یہ ضرور تھا کہ اس کی ذات کی تعمیر میں؛ اس کے چہرے، چہرے کی دمک جو اندر کسی جلتی تیز امید کا عکس دیتی تھی، ترچھے، کٹیلے نین نقش، قد بت اور اس کے قدموں کی سبک روی نے نمایاں حصہ ڈالا تھا۔ اس کے باپ نے اپنی طویل قامتی اور ذہنی وجاہت میں اسے زیادہ ہی وراثت منتقل کر دی تھی۔ اپنی زندگی میں ہی، ہبہ نامہ لکھ دیا تھا یہ کہہ کر کہ بھلے ہی میں نے اپنی زندگی بھر کی کمائی سے یہ چھوٹا سا گھر ہی بنایا ہے مگر میں نے اپنی بیٹیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کر دیا ہے۔ ایک کو ایم۔اے؛ بی ایڈ، اور دوسری کو بی۔اے بی ایڈ؛ کرا دیا ہے، انھیں زندگی کا سلیقہ، جینے کا قرینہ سکھا دیا ہے۔

اور اس کا باپ گھر سے نکلتا تھا تو سر اونچا کر کے چلتا تھا۔ دائیں بائیں، گلی میں، سڑک پر، نئے مکان عالیشان نئے ڈیزائن کی بلڈنگز دیکھتا جاتا تھا، مگر کسی سے مرعوب نہیں ہوتا تھا۔ یہ کہہ کر۔ یہ سوچ کر سر جھٹک دیتا تھا۔ میرے پاس علم کی دولت ہے۔ میں ایم۔اے پاس ہوں، میری بیٹیاں تعلیم یافتہ ہیں، ایک سکول میں ٹیچر ہے، میں زیادہ ثروت مند ہوں، زیادہ غنی ہوں، مجھے کس چیز کی کمی ہے۔

بتول ایم۔اے؛ بی ایڈ کرنے کے بعد سکول میں ٹیچر تھی جسے باپ نے اپنے آپ پر فخر کرنا سکھایا تھا، سر اٹھا کر، وقار سے چلنا سکھایا تھا۔ اور پھر جب اس کی شاگردوں، اس کی کولیگز نے اسے یہ احساس بھی دیا کہ اس کی ذات میں، اس کے خد و خال میں، اس کے اٹھنے بیٹھنے میں، بات کرنے میں ایک سلیقہ ہے تو اس میں، اس کی ذات میں وہ رنگ آیا تھا جسے غرور ذات کہا جا

میں زیادہ ثروت مند ہوں، زیادہ غنی ہوں، مجھے کس چیز کی کمی ہے

سکتا ہے۔

یہ غرور ایک طرح کا خوشگوار احساس تھا، اپنے ہونے کا جو دیکھنے والے کی نظروں میں کھب جاتا تھا۔ مل ملا کے سب نے اسے ایک خاص ہستی بنا دیا تھا اور وہ بھول گئی تھی کہ وہ ایک عام شخص ہے، حیاتیاتی لحاظ سے محض ایک جاندار جو ایک نامکمل اور ناقص دنیا کی باسی ہے۔ اور سارے لوگ اچھے نہیں ہیں۔

اُس کے علم سے محبت کرنے والے باپ نے اُسے کسی سے نفرت کرنا نہیں سکھایا تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ وہ سمجھتا تھا کہ ایک تعلیم یافتہ شخص، اَن پڑھ یا کم تعلیم یافتہ آدمی سے زیادہ احترام اور عزت کا مستحق ہے۔

بتول نے اپنے نصاب کی کتابوں کے علاوہ بھی بہت سی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں اور تعلیم، علم اس کے لیے صرف سجاوٹ نہیں تھی، روزی کمانے کا ذریعہ ہی نہیں تھا بلکہ یہ زندگی گزارنے کا سلیقہ تھا، قرینہ تھا اور وہ جو بھی پڑھتی تھی اس کی ذات کا حصہ بنتا جاتا تھا۔ اُسے پتا تھا دنیا میں بڑے بڑے واقعات کیا ہیں، دنیا میں کتنی بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں اور دنیا میں کتنے بڑے بڑے لوگ پیدا ہوئے ہیں اور انھوں نے کس طرح، کتنا کچھ دنیا کو دیا ہے۔ اُن میں پیغمبر تھے، شاعر تھے، سائنس دان تھے، اولیاء تھے۔ اور یہ انھی لوگوں کی بدولت تھا کہ زندگی اتنی ترقی یافتہ شکل میں موجود تھی اور دنیا میں اتنا حسن تھا، اتنی خوبصورتی تھی۔

پھر وہاں غالب کا ذکر آ جاتا تھا، ورڈز ورتھ کی باتیں ہونے لگتی تھیں

اُس کا باپ جب شام کو کالج، سکول کی لڑکیوں کو ٹیوشن پڑھاتا تھا تو دونوں بہنیں، بتول اور شازیہ بھی اُس کے پاس آ بیٹھتی تھیں۔ پھر وہاں غالب کا ذکر آ جاتا تھا، ورڈز ورتھ کی باتیں ہونے لگتی تھیں، شیکسپیئر کے ڈراموں کی زبان اور زبان کی معنی خیزی زیرِ بحث آتی تھی۔

قراۃ العین حیدر کے ناولوں کا، موپساں، چیخوف اور پھر دستوویسکی کی تحریروں اور ان تحریروں میں پوشیدہ دانش کا ذکر چل نکلتا تھا۔ بتول حیران ہوتی تھی اس کے باپ کے پاس کتنا علم تھا، اس کے باپ کے پاس کتنی دولت تھی۔

لیکن اس کے باپ نے اُسے نہیں بتایا تھا گذشتہ شام اس کے پاس اس کا ایک دُور کا عزیز، اپنے بیٹے زمان کے لیے، اس کا رشتہ مانگنے آیا تھا۔

بتول کے باپ کو بڑی مشکل پیش آ رہی تھی۔ سمجھ نہیں آتی تھی کہ کن لفظوں میں اُسے جواب دے۔ وہ اسے نہیں کہہ سکتا تھا کہ تمھارا بیٹا تو فقط میٹرک پاس ہے۔ بھلے ہی وہ پولیس کانسٹیبل ہے مگر اس کی بیٹی تو ایم۔ اے، بی ایڈ ہے، اتنی پڑھی لکھی ہے میں کیسے اس کا رشتہ اتنے

کم تعلیم یافتہ لڑکے سے کر دوں۔ اب مشکل یہ بھی تھی کہ اُسے جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا تھا۔ پھر بھی اس نے سوچ سوچ کر اُسے کہہ ہی دیا۔

اصل میں اپنے ایک دوست کو ہاں کر چکا ہوں۔ اس کا بیٹا انٹر کالج میں لیکچرار ہے۔ صرف اتنا کہنا ہی کافی تھا ورنہ تو وہ یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ مجھے پولیس کے محکمہ میں ملازم لڑکے کا رشتہ ویسے ہی پسند نہیں۔

پتا نہیں یہ کیسے ہوا کہ اس کے رشتہ دار نے اس کے تذبذب اور سوچ بچار سے یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ اُسے ٹال گیا ہے۔ اس نے تو یہ بھی کہا تھا۔ بھائی صاحب۔ میرے بیٹے نے ترقی کرکے چھوٹا اور پھر بڑا تھانے دار بن جانا ہے۔ اور آپ تو جانتے ہیں کہ تھانے دار کا کتنا دبدبہ، کتنا رعب ہوتا ہے اور پھر آمدنی بھی۔ عورت کی ضرورتیں تو کوئی تھانے دار ہی پوری کر سکتا ہے۔

اور اس نے اپنے رشتہ دار کی اس بات کا کوئی جواب ہی نہیں دیا تھا۔

اور اس بات کا ذکر اس نے اپنی بیٹی سے نہیں کیا تھا۔ رات گئے اس نے اس کی ماں کو ضرور بتایا تھا۔ ''عزیز اللہ آیا تھا، اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر۔''

''اچھا ——!''

دنیا میں علم، تعلیم ہی سب کچھ نہیں ہے۔ کتابوں سے باہر بھی بہت کچھ ہے

اس کی بیوی نے جیسے خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اس کی خوشی بے جا بھی نہیں تھی مگر اُسے اس کی یہ حیرت اور خوشی اچھی نہیں لگی تھی۔ ''اُسے بات کرنے سے پہلے سوچنا تو چاہیے تھا۔ کہاں میری بتول ایم-اے؛ بی ایڈ اور کہاں صرف میٹرک پاس اس کا لڑکا۔ کیا میل ہے دونوں کا —— ؟''

بتول کے باپ نے اپنی بیٹی پر فخر کرتے ہوئے کہا تھا۔

''کیا ہوا جو لڑکا کم پڑھا لکھا ہے، ہے تو پولیس ملازم۔ یہ کیا کم بات ہے —؟'' بتول کی ماں کی بات سن کر اس کے باپ کو افسوس ہوا تھا۔ ''تم رہیں جاہل کی جاہل، تم کیا جانو علم کیا ہوتا ہے۔''

وہ اس کے پاس سے اٹھ کھڑی ہوئی اور تلملاتے ہوئے کہنے لگی۔ ''دنیا میں علم، تعلیم ہی سب کچھ نہیں ہے۔ کتابوں سے باہر بھی بہت کچھ ہے۔''

اور اب جب وہ اپنی شاگردوں کو کتابوں کی باتیں سنا رہا تھا تو اس نے سوچا تھا۔ کتابوں سے بڑا رشتہ، بڑی حقیقت کیا ہو سکتی ہے۔ سب کچھ تو مل جاتا ہے ان میں۔ یہی تو دولت ہے، یہی تو دانائی ہے جو مومن کا گمشدہ مال ہے۔''

...اور وہ شیکسپیئر کی باتیں کرنے لگا۔

لیکن ساتھ ساتھ بتول کا چہرہ دیکھتے ہوئے سوچتا رہا اب وہ لڑکا کب آئے گا جس کے متعلق میں نے عزیز اللہ کو بتایا تھا۔

اور اُسے بہت زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اُس لڑکے کا باپ، اس کی ماں آگئے۔ اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر۔

''ہماری بیٹی آپ کی بیٹی کی کلاس میں پڑھتی ہے۔ اس نے بتول کی تعریفیں کر کر کے ہمیں مجبور کر دیا کہ ہم سکول جا کر اُسے دیکھیں، اس سے باتیں کریں۔ واقعی ہماری بیٹی ٹھیک کہتی ہے آپ کی بتول، ہماری بیٹی کی ٹیچر، اگر ہماری بیٹی بن جائے تو ہم سمجھیں گے ہم بڑے خوش قسمت ہیں۔''

میاں بیوی بتول سے بہت متاثر نظر آتے تھے۔ انھوں نے سکول کی ہیڈ مسٹریس اور دوسری ٹیچرز سے بھی بتول کے متعلق پوچھ گچھ کر لی تھی اور پھر اپنے بیٹے کی رضا مندی سے، رشتہ کی بات کرنے آئے تھے۔ بتول کے باپ کو لگا جیسے اس نے اسی لڑکے سے متعلق عزیز اللہ سے جھوٹ بولا تھا۔ تو یہ تو جھوٹ نہیں تھا۔ اس کی زبان سے نکلی بات سچ ثابت ہو گئی تھی۔

روشنی جہاں تک نہیں جا سکتی، وہاں اندھیرا بھی ہے

بتول کے ماں باپ نے ہاں کر دی۔ اور پھر ایک سادہ سی رسم میں ان کی منگنی بھی کر دی۔

بتول خوش تھی کہ اس کا ہونے والا ساتھی، اس کا ہم ذوق تھا۔ کالج میں لیکچرر تھا۔ اس کے باپ کو بھی تسلی تھی کہ اُسے اپنی تعلیم یافتہ لڑکی کے لیے تعلیم یافتہ لڑکا ملا۔ لڑکے والے تعلیم کے قدر دان تھے۔ اس کے والد نے ماسٹر کرامت کو کہا تھا۔ آپ کی بیٹی ماشاء اللہ تعلیم یافتہ ہے، سلیقہ شعار ہے۔ ہمیں اور کچھ نہیں چاہیے، کوئی چیز کوئی سامان نہیں چاہیے۔ ہمیں بتول کافی ہے۔''ہاں۔ وہ ہے ہی اس قابل، اپنا جہیز خود اس کی ذات ہے۔'' اس کے باپ نے بڑے فخر سے سوچا تھا۔ ''دیکھا۔ یہ ہے علم کی برکت۔ گھر بیٹھے ہمیں کتنا اچھا رشتہ مل گیا ہے۔'' اس کے باپ نے اپنی بیوی کو سمجھایا ''میری بتول کے پاس علم کی جو روشنی ہے، وہ کتنی دُور تک جاتی ہے۔''

لیکن ماسٹر کرامت بھول جاتا تھا اس بات کا ذکر کرنا کہ روشنی جہاں تک نہیں جا سکتی، وہاں اندھیرا بھی ہے۔

اور ان اندھیروں میں شیطان گھات لگائے منتظر رہتے ہیں کہ ذرا شام ہو اور وہ اپنی کمین گاہوں سے نکل کر روشنی پر حملہ کریں۔

انھوں نے اپنی بیٹی کو خبردار نہیں کیا تھا کہ اس دنیا میں جس میں وہ بستی تھی ہر طرف

خوبصورتی ہی نہیں تھی، بدصورتیاں بھی ساتھ ہی ساتھ رینگتی رہتی تھیں۔ ہر طرف سبزہ پھول ہی نہیں تھے ان کے پیچھے کہیں گہیں بگھیار بگھیلے بھی چھپے پھرتے تھے۔

اور وہ ایک بھیڑیا ہی تھا جو اُسے دُور سے انسان نظر آیا تھا جب وہ بس کے آخری سٹاپ سے اپنے گھر کی طرف پیدل چلی تھی۔ صبح سکول جاتے ہوئے، وہ یہ فاصلہ جو اس کے گھر کے اور بس سٹاپ کے درمیان تھا، پیدل طے کرتی تھی اور واپسی پر بس سے اتر کر اس راستے پر چل کر گھر پہنچتی تھی۔ اس نے نہیں سوچا تھا کہ یہاں، اس تھوڑے سے فاصلے میں اس کے لیے کوئی حادثہ، کوئی سانحہ چھپا ہو سکتا ہے۔ چند قدم ہی تو تھے۔ ایک چھوٹی سی پکی سڑک اور پھر اس اپنا گھر تھا، اس نے اُسے روک لیا، اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے گھبرا کر اُسے کترا کر بائیں جانب سے نکلنے کی کوشش کی تو وہ لپک کر اس کے سامنے آ گیا اور پھر اس نے اس کا دایاں بازو پکڑ کر اُسے جھٹکا دیا۔ وہ جیسے جھٹکے کے زور سے کھنچ کر اس کے جسم سے جا ٹکرائی۔ اس کا چہرہ اس کے اپنے چہرے کے نزدیک آ گیا۔ "تم ہو تو واقعی بڑی شے۔ میں چاہتا تو تمھارے اس چاند چہرے پر تیزاب پھینک کر تمھارا سارا غرور توڑ سکتا تھا۔ لیکن میں تمھیں اتنی سخت سزا نہیں دوں گا۔ تمھارے باپ نے میرے باپ سے تمھیں بیاہنے کا وعدہ کیا تھا، رشتہ تمھارا کسی اور کو دے دیا ہے۔ یہ وعدہ خلافی ہے۔" یہ آواز، یہ الفاظ اس کے چہرے پر، اس کے کانوں میں آگ کی لپٹیں بن کر گرے۔

اب مانگو مدد اپنے علم سے، اپنی کتابوں سے، اپنے غالب سے اپنے شیکسپیئر سے

خوف اور سہم سے اس کی چیخیں نکل گئیں۔ ایک دم جیسے گلی کے گھروں کے دروازے، کھڑکیاں کھل گئے۔ اِدھر اُدھر سے گزرتے دو چار آدمی چیخیں سن کر بھاگ پڑے۔ اس نامعلوم شخص نے اپنی پینٹ سے پستول نکالا اور ہوائی فائر کر دیا۔ چھوٹی سڑک کے کنارے درختوں سے پرندے اڑ کر فضا میں چیخنے لگے۔ اس نے بائیں ہاتھ سے بتول کا دوپٹہ پکڑ کر کھینچ لیا اور پھر پستول والا ہاتھ اس کے سینے پر مار کر اُسے دھکا دیا۔

"جا—— اور اپنے باپ کو کہہ دے، ہماری مرضی کے خلاف" تمھاری شادی کی تو انجام اچھا نہیں ہوگا۔"

بتول کی بائیں بغل میں دبی کتابیں، کلاس کا رجسٹر زمین پر گر پڑے۔ کتابیں کھل گئیں۔ ان کے اوراق ہوا بھری مٹی میں پھڑ پھڑانے لگے۔

اور وہ خود۔ چیختی چلاتی، گلی میں اپنے گھر تک بھاگی گئی۔ اُسے بعد میں کبھی یاد نہ آ سکا کہ اس نے یہ فاصلہ کن قدموں اور کیسے عبور کیا تھا۔ وہ تو جیسے آگ کی لپٹوں میں جلتی گئی تھی۔

بعد میں اُسے اس شخص کی صورت تک بھول گئی۔ پولیس پوچھتی رہی مگر وہ اس چہرے کو یاد نہ کر سکی۔ اس کا باپ رو رو کر، قسمیں کھا کھا کر اُسے یقین دلاتا رہا: ''میں نے کبھی بھی۔ بیٹا کبھی بھی، کسی شخص سے تمھارے رشتے کا وعدہ نہیں کیا۔ ایسا نہیں ہوا۔ ایسا ہو نہیں سکتا۔''

اُن کے گھر میں ایک خاموش تہلکہ مچا ہوا تھا۔ اندر باہر۔ کوئی چیز اپنی جگہ نہیں رہی تھی۔ کتابیں نہ ان کی تحریریں اور نہ علم اور نہ عالم۔ ساری ترتیب، سارا سلیقہ ہوا میں بکھر گیا تھا۔ بتول نے سکول جانا چھوڑ دیا تھا۔ اس کی چھوٹی بہن گھبرائی، سہمی خوف زدہ، دیکھتی کچھ تھی، نظر کچھ آتا تھا۔ اور ان کا باپ بے سہارا ہو گیا تھا، بے طاقت ہو گیا تھا۔ اس نے لڑکیوں کو ادب، شاعری پڑھانا چھوڑ دیا تھا اور یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کے علم نے اُسے کیسے ایسی کسی بھی صورتِ حال کے لیے تیار نہیں کیا تھا۔

اور بتول کی ماں جیسے دانت پیستی پھرتی تھی۔ ''اب مانگو مدد اپنے علم سے، اپنی کتابوں سے، اپنے غالب سے اپنے شیکسپیئر سے جن پر تمھیں بہت ناز تھا۔ اور چوہدری کرامت بڑی بے بسی سے، ملتجیانہ نظروں سے اُسے دیکھتا تھا۔ اس کی نظروں کے قہر سے بچنے کے لیے سر جھکا لیتا تھا۔ نیویں ڈال لیتا تھا۔

وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھتا۔ مجھے معاف کر دو۔ بیٹا۔ میں تمھارا قصوروار ہوں

پھر اٹھ کر بتول کے کمرے میں جاتا تھا جو اپنے باپ کو دیکھ کر منہ پھیر لیتی تھی۔ اس کے باپ کا دل کٹنے لگتا تھا۔ ''وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھتا۔ مجھے معاف کر دو۔ بیٹا۔ میں تمھارا قصوروار ہوں۔''

وہ ابھی اپنے باپ کی بے گناہی اور معصومیت پر ایمان لانے کے لیے خود کو تیار نہیں کر پا رہی تھی۔

یہ تو ایک زلزلہ تھا جس نے اس کی شخصیت کے شاندار محل کو زمین بوس کر دیا تھا اور وہ اس کے ملبے پر بیٹھی، مٹی روڑوں کو اٹھا اٹھا کر اِدھر اُدھر پھینکتی رہتی تھی۔ اس کی تعمیرِ نو کے لیے جو ہمت، توانائی اسے درکار تھی، وہ اس کی دسترس سے باہر تھی۔

اس کی ہیڈ مسٹریس نے دو تین دفعہ اُسے پیغام بھیجا مگر وہ اتنی انتشار کی حالت میں تھی کہ اپنے آپ کو اکٹھا کرنے کا حوصلہ نہیں پاتی تھی۔ پھر ہیڈ مسٹریس خود ہی اس کے گھر آ گئی۔

''میں تمھیں سمجھانے نہیں آئی، کیوں کہ یہ کام تمھیں خود ہی کرنا ہوگا۔'' جب وہ دونوں کمرے میں اکیلی رہ گئیں تو ہیڈ مسٹریس نے اُسے کہا۔ ''تم سوچتی ہوگی کہ میں کسی کا بُرا نہیں سوچتی، کسی کو میرے ہاتھوں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ میں تو روشنی پھیلاتی ہوں، بچیوں کو تعلیم کے

زیور سے آراستہ کرتی ہوں، میں معاشرے میں خیر کی، حسن کی پیغامبر ہوں، پھر میرے ساتھ کیوں ایسا ہوا کہ برسرِ عام، مجھ پر کیچڑ تھوپا گیا، مجھے بدنام کیا گیا۔''

بتول واقعی اس وقت یہی سوچ رہی تھی اور یہ سوچیں پک کر دردناک سوال بننا چاہتی تھیں۔

''یہ زندگی ایسی ہی ہے۔ کسی قانون، قاعدے کی پابندی سے بے نیاز۔ یہاں ہر واقعہ کی وجہ ہونا، علت ہونا ضروری نہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ تم نے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا، کسی کا بُرا نہیں سوچا تو تمھیں اس کا صلہ بھی ملے اور تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچائے، تمھارے ساتھ کوئی بُرائی نہ کرے۔ یہاں خوبصورتیوں کے پیچھے بدصورتیاں، بدنمائیاں بھی ہیں۔ یہاں سب اچھا نہیں، بہت کچھ بُرا بھی ہے۔ اور تم نے، میں نے اسی ناقص زندگی میں رہنا ہے، اسے بسر کرنا ہے۔ بدصورتی سے الگ رہ کے، بدنمائی سے بچ کے۔ اور اگر کچھ ہمارے حصے میں ایسی بدنصیبی آ بھی جائے تو اِسے اپنا حصہ سمجھ کر اسے قبول کرنا ہے، اسے زندگی کا تجربہ بنا کر اپنی تکمیل کے عمل میں استعمال کرنا ہے۔ تم خود کو زندگی کے عمل سے جدا نہیں رکھ سکتیں۔''

بتول آنکھیں جھپک جھپک کر، اپنی ہیڈ مسٹریس کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تمھیں شاید کسی نے بتایا نہیں تھا۔ ہر بندے کو اپنے حصے کا دُکھ جھیلنا پڑتا ہے، اسی آگ پر اس کا احساس پکتا ہے، پختہ ہوتا ہے۔ اس کے بغیر وہ زندگی کو ایک کل کی شکل میں نہیں دیکھ سکتا۔ بصیرت ایسے ہی حاصل نہیں ہو جاتی۔'' بتول حیرت سے اپنی ہیڈ مسٹریس کی آواز سن رہی تھی جس میں عجیب طرز کا گداز تھا۔

میں شاید تمھیں کبھی نہ بتاتی کہ میں نے بھی اپنے حصہ کا دُکھ جھیلا ہے، صدمہ برداشت کیا ہے۔ بظاہر میں تمھیں ایک کامیاب عورت نظر آتی ہوں گی مگر میں نے اپنی ہستی کی بقا کے لیے بہت کچھ سہہ لیا ہے۔

مں اپنے گھر سے، اپنے بھائیوں سے دور علیحدہ رہتی ہوں، اپنی مرضی سے، ان کی خوشی سے اور میں مر بھی جاؤں تو انھیں دُکھ نہیں ہوگا بلکہ وہ خوش ہوں گے کہ ہمارے باپ کی جائیداد سے ایک دعوے دار کم ہوگیا۔ میرے خاوند نے مجھے کھڑا کیا تھا، ان کے مقابلے میں، ناانصافی کے خلاف۔ انھوں نے اسے ہی راستہ سے ہٹا دیا۔ کسی کرائے کے قاتل کے ذریعہ اُسے قتل کرا دیا۔ اب تک اس قتل کا سراغ نہیں ملا۔ اور میں اپنے بیٹے کو لے کر اُن سے اتنی دور آ گئی، اپنے بیٹے کی زندگی کے لیے، اپنی زندگی کے لیے اور تم۔ تم سمجھتی ہو، تم سوچتی ہو تمھارے ساتھ کیوں ہوا یہ سب کچھ ___؟

ایسا کسی کے بھی ساتھ ہو سکتا ہے۔ کسی نے تمھارا غرور توڑنے کی بات کی تھی، دھمکی دی تھی

اور تم منہدم ہو گئیں۔ تم نے شکست مان لی۔ زندگی ایک یدھ ہے، ایک جنگ ہے جو تمھیں لڑنا پڑتی ہے، کبھی اپنے باہر، کبھی اپنے اندر۔ تم بھاگ نہیں سکتیں۔ میں بھاگ نہیں سکتی۔

اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھیں چھلک اٹھیں۔ بتول بے اختیار ہو کر اٹھی اور اپنی، ہیڈ مسٹریس سے لپٹ گئی۔ اس کے گال چومنے لگی۔ اس کے ہاتھوں پر بوسے ثبت کرنے لگی۔ اس کی ہیڈ مسٹریس نے اسے زندگی کا وہ رخ دیکھنے کو دیا تھا جس پر پہلے اس کی نظر نہیں پڑی تھی۔

اب ــــ ایک ہی رات میں اس نے اپنے حالات کو، خود کو، اپنی ذات کو ایک نئے تناظر میں دیکھا اور اس نے خود کو ماننے پر تیار کیا کہ ہاں زندگی میں بہت کچھ ہو سکتا ہے، ہوتا ہے، عجیب اور غیر متوقع طور پر۔

اس کا فوری اثر ہوا کہ اس نے جیسے اپنی ذات کی از سرِ نو تعمیر شروع کر دی۔ سکول جانا شروع کر دیا اور اپنے باپ کو اس الزام سے بری کر دیا جو حالات اور اس نامبارک واقعہ نے اس پر لگا دیا تھا۔

بتول بے اختیار ہو کر اٹھی اور اپنی، ہیڈ مسٹریس سے لپٹ گئی

ماسٹر کرامت علی کو بھی کچھ حوصلہ ہو گیا لیکن ابھی خود کو بحال کرنے کے قابل نہیں ہوا تھا۔ اس نے ادب، شاعری، فلسفہ پڑھنا بدستور چھوڑے رکھا۔ صرف اخبار پڑھتا رہا جن میں جرائم کی، حادثات کی سنسنی خیز خبریں تھیں۔ لوٹ مار کے واقعات تھے۔ یہ سب پڑھ کر وہ ایک طرح سے خود کو اذیت دینے کے عمل کا ذائقہ چکھ رہا تھا۔ شام کو بچوں کو پڑھانا تعلیم دینا اس نے بند کر دیا۔ اب وہ گھر سے نکلتا تھا تو گلیوں میں سر جھکا کر چلتا تھا۔ وہ اعتماد سے محروم ہو گیا تھا اور جلد بحال ہونے پر مائل نہیں تھا۔ غالب، اقبال، شیکسپیئر، کیٹس، دستوویسکی اور منٹو سے اس نے منہ موڑ رکھا تھا۔ ہر روز صبح جب وہ اٹھتا تھا تو ناآسودگی، بے اطمینانی کی کڑواہٹ اس کے حلق میں، اس کی زبان پر چپٹی ہوتی تھی ایک چپچپاہٹ، جسے تھوکتے تھوکتے اس کے حلق سے کبھی کبھی خون جاری ہو جاتا تھا اور آنکھوں سے پانی بہنے لگتا تھا۔ اُسے لگتا تھا کسی ظالم نے اس سے ساری زندگی کی دولت، ساری زندگی کا اطمینان چھین کر اُسے تہی دست کر دیا تھا۔ نادار کر دیا تھا۔

وہ یہ سوچ کر بہت دکھی ہوتا تھا کہ اُن لوگوں نے جہاں بتول کا رشتہ ہوا تھا، اُن سے کسی ہمدردی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ان کی طرف سے خاموشی بہت اذیت ناک تھی جسے سبھی محسوس کر رہے تھے۔ بتول اور اس کی ماں کو بھی خاصی پریشانی تھی۔

''یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ انھیں اس واقعہ کا علم نہ ہوا ہو۔ حق تو بنتا تھا کہ وہ آتے، ہم سے، بتول سے اظہار ہمدردی کرتے، افسوس کرتے، ہمارا صدمہ شیئر کرتے۔'' ماسٹرنی بھی سوچتی تھی مگر

وہ ایک دوسرے سے بات کرتے ڈرتے تھے۔

اور عجیب بات تو یہ ہوئی کہ افسوس کرنے، ہمدردی کا اظہار کرنے آئے بھی، تو وہی عزیز اللہ جوان سے بتول کا رشتہ مانگتا تھا۔

''آپ نے اگر ہماری بات مانی ہوتی تو آج آپ کو اتنی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ ہم دیکھتے کوئی کیسے ہماری بیٹی کو بے عزت کرتا ہے۔'' ماسٹر کرامت خاموش رہے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرتے نظر آئے کہ ان کا وہ رشتہ دار کن لفظوں میں اس کے ساتھ ہمدردی کرتا ہے۔''اپنوں میں رشتہ کرنے کا یہی تو فائدہ ہوتا ہے کہ کوئی بھی ہرج مرج ہو جائے وہ سنجال لیتے ہیں، پردہ ڈال دیتے ہیں۔ اب آپ نے دیکھ ہی لیا ہوگا بتول کی بدنامی ہوگئی اور اُن لوگوں نے آپ کے پاس آکر پوچھا تک نہیں۔''

''کوئی بات نہیں۔'' ماسٹر کرامت نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ یہ کوئی بدنامی نہیں۔ نہ ہی کوئی بے عزتی ہے۔ بس ایک حادثہ تھا۔ ہم اسے سمجھنے اور برداشت کرنے میں لگے ہیں۔ آپ کی ہمدردی کا شکریہ۔'' ان کا لہجہ خشک تھا۔ وہ سوچ رہے تھے عزیز اللہ اسے کیا سمجھانا چاہتا ہے۔

''لوگ نہیں بھولتے، باتیں بناتے رہتے ہیں۔ آپ کے لیے برداشت کرنا مشکل ہو جائے گا۔ برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ آپ سوچ لیں۔''

ان کا لہجہ خشک تھا۔ وہ سوچ رہے تھے عزیز اللہ اسے کیا سمجھانا چاہتا ہے

اور ماسٹر کرامت سوچتا رہا۔ دیر تک۔ عزیز اللہ کے جانے کے بعد بھی وہ جاتے جاتے کہہ گیا۔''ہم پھر بھی آپ کے خیر خواہ ہیں۔ آپ کے عزیز ہیں۔ ہم آپ کے کام نہیں آئے، تو اور کون آئے گا۔ اس لیے وہ لوگ آپ کی بیٹی، آپ کی کیا میٹری بیٹی کا رشتہ توڑ دیں، تو میرا بیٹا پھر بھی حاضر ہے۔''

ماسٹر کرامت کے لیے خود کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ لرزتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔''بس عزیز اللہ بس۔ اب تم جاؤ۔ مجھے تمھاری ہمدردی نہیں چاہیے۔ ہم — ہم — '' آگے، لفظوں پر اُن کا کنٹرول نہیں رہا۔

عزیز اللہ کے جانے کے بعد وہ اپنی نشست پر پڑے لمبے لمبے سانس لیتے رہے۔ انھیں ڈر تو تھا۔ ان لوگوں کی طرف سے جہاں ان کی بیٹی منسوب تھی۔ کوئی بھی ان کے پاس ہمدردی کے لیے، افسوس کے لیے نہیں آیا تھا۔''آخر انھیں بھی تو اس واقعہ کی خبر ملی ہوگی۔'' ماسٹر کرامت سوچتا تھا۔''پھر — پھر وہ کیوں ہمارے دُکھ میں شامل نہیں ہوئے —؟''

وہ اپنی بیوی کو سمجھاتا تھا۔ ''وہ پڑھا لکھا لڑکا ہے۔ کالج میں استاد ہے۔ وہ کسی افواہ پر کسی بھی کہانی پر کیسے یقین کر سکتا ہے؟'' بتول کی ماں اپنی پریشانی نہیں چھپا سکتی تھی۔ ویسے تو وہ دونوں ایک دوسرے کو سمجھاتے رہتے تھے، حوصلہ دیتے رہتے تھے۔

''ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔'' اُن کا متفقہ فیصلہ تھا۔ ''یہ صرف بتول کی رندگی کا ہی نہیں، شازیہ کا بھی مسئلہ ہے۔ وہ بھی جوان ہوگئی ہے۔''

ماسٹر کرامت کو اس کی خبر تھی، پھر بھی وہ امید کا دامن تھامے رکھنا چاہتا تھا۔ انتظار کرنا چاہتا تھا۔ اور انتظار کرنا چاہتا تھا۔

اور پھر جب انھیں لڑکے والوں کی طرف سے پیغام ملا کہ ہمارا لڑکا تو ہمیں کچھ کہے سنے بغیر بیرون ملک چلا گیا ہے، اب اس پر ہمارا کوئی اختیار نہیں رہا، آپ خود کو آزاد سمجھیں، تو ماسٹر کرامت کے ہاتھوں سے جیسے زندگی کے پتوار چھوٹ گئے اور ان کی امید کی کشتی حالات کے رحم و کرم پر رہ گئی۔

اب اس پر ہمارا کوئی اختیار نہیں رہا، آپ خود کو آزاد سمجھیں

اور خود بتول کا یہ حال تھا کہ وہ جو بچوں کو تعلیم کی روشنی تقسیم کرتی تھی، اندھیروں میں گھری رہتی تھی۔ اُسے تو یہ فکر بھی کھائے جا رہی تھی کہ میں تو چاہوں تو اپنی ذات کے سہارے زندگی گزار سکتی ہوں، مگر چھوٹی بہن شازیہ کا کیا ہوگا۔ اور پھر ابا۔ اماں وہ کیا اتنا بڑا دُکھ اور محرومی کا بوجھ اٹھا پائیں گے۔

اور لوگ، عزیز رشتہ دار تھے کہ جب کوئی آتا تھا، جب کوئی ملتا تھا، بتول کی بدنصیبی کا ذکر کرنا نہیں بھولتا تھا۔

''ہا— ہا— ہیرے جیسی بیٹی کو داغ لگ گیا—!'' ایک آدھ عورت دو چار روز بعد اس کی ماں سے ہمدردی کر جاتی۔ اور اس کا دل مسل جاتی۔

ملنے ملانے والے ان کی بیٹی کو اس واقعہ کے پتھر سے باندھے رکھنا چاہتے تھے، اُسے بھولنے پر مائل ہی نہیں تھے۔

اور ماسٹر کرامت نے اپنی کتابوں، ان کی تحریروں سے محبت کرنا چھوڑ دیا تھا سچائی اور سچ وہی تھا جس کا انھیں سامنا تھا۔

اور اب وہ اس وقت سے ڈر رہے تھے جب عزیز اللہ نے ایک دفعہ پھر بتول کے لیے اپنے بیٹے کا رشتہ لے کے آنا تھا اور انھوں نے انکار نہیں کر سکنا تھا۔

●●●●●●●●●●●●●●●●

میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں......رشید امجد

میں عام شخص کے لیے نہیں لکھتا' میرا قاری مجھے خود تلاش کرتا ہے' میری لذتوں میں وہی شریک ہوسکتا ہے جو میرے تجربے کی اسراریت کو محسوس کر سکتا ہے۔ میں کہانی جوڑتا نہیں' ٹکڑے اکٹھے نہیں کرتا۔ کہانی ایک خیال کی طرح میرے ذہن میں آتی ہے اور تخلیقی عمل سے گزر کر ایک وحدت کی طرح کاغذ پر بکھر جاتی ہے۔ میں اس کے لیے لفظ تلاش نہیں کرتا' یہ خیال اپنے لفظ خود لے کر آتا ہے' میری تخلیقی دنیا بہت سوں سے مختلف ہے' میرا تخلیقی عمل بھی مختلف ہے۔ میں جو کچھ لکھتا ہوں یہ میری باطنی واردات ہے۔ اس میں میرا ماحول اور معاشرہ بھی آ جاتا ہے کہ بہر حال میں اس کا ایک فرد ہوں' لیکن میں اپنی پہچان ایک سماجی ماہر کے طور پر نہیں کرانا چاہتا' میں ایک تخلیقی فنکار ہوں اور جہاں فن آئے گا وہاں تکنیک بھی ہوگی۔ تکنیک اور فن ہوگا تو اسلوب بھی آئے گا یہ سب مل کر جو کچھ بنائیں گے اسے دو جمع دو چار کی طرح نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس کی تفہیم کا طریقہ مختلف ہوگا۔

میں اس لیے لکھتا ہوں کہ مجھے اپنے ہونے کا احساس رہے۔ یہ میری مجبوری نہیں میرا اظہار ہے کہ اظہار کے بغیر کسی شے کا کوئی وجود نہیں ہوتا جو وجود رکھے گا وہ اس وجود کا احساس بھی کرائے گا۔ جیسا میں نے کہا میرے اظہار کا ذریعہ لفظ ہے۔ میں لفظوں کو جوڑ جوڑ کر اپنے آپ کو منکشف کرتا ہوں۔ معاشرے میں میرا سفر ناک کی سیدھ میں نہیں جو کچھ نظر آتا ہے میرے تجربے' مشاہدے اور مطالعے کا حصہ بنتا چلا جاتا ہے۔ جب میں لکھنے بیٹھتا ہوں تو یہ تجربہ میری کہانی میں ایک خارجی معنویت پیدا کرتا ہے۔ اسے سماج سے جوڑتا ہے اور اس میں روح عصر اور جدید حسیت پیدا کرتا ہے۔ میرا باطنی سفر پیچ در پیچ ہے کہ یہاں کوئی منزل نہیں۔ ایک سرمئی دھند ہے۔ جس میں چلتے رہنا' چلتے ہی رہنا' ایک مبہم سی سچائی' ایک ایسا تجربہ جسے بیان کرنے کے لیے علامت اور استعارہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ درحقیقت یہی میری کہانی کا اثاثہ ہے۔ یہ میری کہانی کا باطن ہے۔ اس کی اندرونی معنویت' جو اسے ماورائے عصر بناتی ہے۔

لکھنا......ادب لکھنا ایک پیچیدہ عمل ہے۔ ایک ایسا تخلیقی پراسیس جسے قطعیت کے ساتھ بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ خیال کس عمل سے گزرتا ہے اور کیونکر ایک فن پارے کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس کے بارے میں قیاس آرائی ہی کی جاسکتی ہے اور اس سے بھی زیادہ مشکل اس سوال کا جواب ہے کہ

آپ کیوں لکھتے ہیں؟ بس میں لکھتا ہوں کہ مجھے لکھنا آتا ہے۔ شائد نہیں یہ جواب مکمل نہیں۔ میں لکھوں نہ تو اور کیا کروں کہ مجھے اور کچھ آتا ہی نہیں۔ اظہار کے راستے تو آدمی ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔ اس لیے یہ بھی کوئی مناسب جواب نہیں تو پھر کوئی کیوں لکھتا ہے؟ شہرت کے لیے' کسی آدرش کی تکمیل کے لیے صرف اپنی ذات کے اظہار کے لیے...... میرا خیال ہے کہ یہ سب باتیں مل کر وہ اکائی بناتی ہیں جو لکھنے کا محرک ہوتی ہے۔

لکھنے کے لیے ایک اضطراب اور بے چینی بہت ضروری ہے۔ یوں بھی نفس مطمئنہ کس کو ملا ہے۔ کشف کے بڑے سے بڑے تجربے کے بعد بھی ایک کسک' ایک بے چینی تو موجود رہتی ہے۔ لکھنا بھی ایک مکاشفہ ہی ہے۔ لکھنے والا مطمئن ہو جائے تو صورت حال کا غلام بن جاتا ہے۔ اس کے اندر دربار داری پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنے لفظوں سے وہی کام کرتا ہے جو بھانڈ اپنی حرکتوں اور پھبتیوں سے کرتا ہے۔ تفریح اور حظ آفرینی میں ایک فرق ہے۔

میں اس لیے لکھتا ہوں کہ اپنا اظہار چاہتا ہوں۔ اپنے عہد اور اس کے آشوب کو لفظوں میں زندہ کرنا چاہتا ہوں۔ ایک آدرش کی تکمیل چاہتا ہوں کہ کبھی تو وہ غیر طبقاتی آئیڈیل معاشرہ وجود میں آئے گا جہاں میں اور مجھ ایسے سب سر اٹھا کر چل سکیں گے ہمیں کوئی فتح کرنے والا نہیں ہوگا۔ ہماری رائے کی اہمیت ہوگی۔ یہ خواب سہی' میری بے تاب تمنائیں سہی' لیکن میری تحریروں کا اثاثہ یہی خواب اور یہی تمنائیں ہیں۔ میں تو درویش بننا چاہتا تھا لیکن اس کا ظرف نہ تھا۔ دنیا دار اس لیے نہ بن سکا کہ دنیا داری کا سلیقہ نہ تھا۔ سو میں نے لکھنے والے کا بھیس اپنا لیا ہے کہ اپنا تماشا دیکھوں اور دوسروں کا بھی۔

☆ ☆ ☆

رشید امجد

ایک عام آدمی کا خواب......2

اللہ بخش ایک جن ہے جس کا کوئی وجود نہیں' لیکن اس کے خوابوں' خیالوں اور تصورات میں اللہ بخش اپنے پورے وجود اور امکانات کے ساتھ نہ صرف موجود ہے بلکہ اس کے ہر اشارے پر ناچتا اور اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ یہ معاشرہ جہاں وہ رہتا ہے' اللہ بخش کے بغیر اس کے لیے ایک جنگل ہے جہاں انسان نہیں حیوان رہتے ہیں۔ اللہ بخش اس کے ہونے اور ہونے کے احساس کو قائم رکھنے کی دلیل ہے اور اسی کی کہانی میں مرکزی کردار کی حیثیت رکھتا ہے!

یہ کہانی ہر صبح سات بج کر بیس منٹ پر شروع ہوتی ہے جب وہ اپنے گلی سے نکل کر بڑی گلی میں دائیں طرف مڑتا ہے۔ یہ گلی جس میں اس کا گھر ہے نیچے سے اوپر کی طرف جاتی اور بڑی گلی سے ملتی ہے۔ جب اس نے گھر بنایا تھا تو موڑ کے دونوں طرف اتنی جگہ خالی تھی کہ دائیں بائیں سے آنے والوں کو نیچے سے اوپر جانے اور اوپر جانے والوں کو دائیں بائیں کی گاڑیاں نظر آ جاتی تھیں' پھر یہ ہوا کہ بڑی گلی کے ایک گھر والے نے اپنی دیوار آگے کر لی' اسے دیکھ کر دوسرے اور پھر تیسرے نے بھی یہی کیا' نتیجتہً موڑ اندھا ہو گیا۔ نیچے سے آنے والے کو دائیں بائیں اور دائیں بائیں والوں کو چڑھائی چڑھتی گاڑی دکھائی نہیں دیتی' جس کی وجہ سے یہاں آئے دن گاڑیاں ٹکراتے ٹکراتے رہ جاتی ہیں یا کئی بہت ہی تیز گاڑیاں ٹکرا بھی جاتی ہیں۔ نیچے والوں نے کئی بار اوپر والی سیدھی گلی میں جمپ بنانے کی کوشش کی ہے لیکن اوپر والی گلی میں ایک جج صاحب رہتے ہیں۔ انہیں ایک لمحہ کے لیے جمپ پر رکنا پسند نہیں' اس لیے جمپ نہیں بننے دیتے۔ چڑھائی چڑھنے والے مسلسل ہارن بجاتے اوپر کی طرف آتے ہیں لیکن سیدھی گلی میں آنے جانے والے ہارن کی پروا نہیں کرتے بلکہ بعض اوقات اس تمسخر سے دیکھتے ہیں جیسے ہارن بجانے والا بینڈ بجا رہا ہے۔ اسے ایسے موقعوں پر بہت غصہ آتا ہے اور کئی بار اس نے گردن نکال کر چیختے ہوئے کہا بھی ہے...... ''یہ میں تمہاری ماں کا بینڈ نہیں بجا رہا۔''

اس پر کئی بار ہاتھا پائی ہوتے ہوتے رہ گئی' اسے غصہ بہت آتا ہے لیکن کر کچھ نہیں سکتا' ایسے

یہ کہانی ہر صبح سات بج کر بیس منٹ پر شروع ہوتی ہے

موقعوں پر اللہ بخش بہت کام آتا ہے۔ وہ کہتا ہے...... ''اللہ بخش اسے الٹا لٹکا دو۔'' اللہ بخش حکم کی تعمیل میں ہارن کی پرواہ کرنے والے کو الٹا لٹکا دیتا ہے۔ وہ مسکرا کر اسے دیکھتا اور آگے نکل جاتا ہے۔ اب چھوٹی سڑک اور پھر بڑی سڑک کو کراس کرنے کا مرحلہ ہے یہاں بھی یہی ہوتا ہے۔

سیدھے آنے والے ایک لحہ کے لیے بھی آہستہ ہونا پسند نہیں کرتے کہ اس سے رفتار میں فرق پڑتا ہے اور یہ دور تو ہے ہی رفتار کا' تیزی کا...... کئی کئی منٹ سڑک کے خالی ہونے کا انتظار' پھر سڑک خالی ہو جائے تو اچانک کوئی غلط طرف سے نکل آتا ہے اور معذرت کرنے کی بجائے الٹا ایسے گھورتا ہے جیسے اس نے کوئی بڑا نقصان کر دیا ہو...... اللہ بخش یہاں بھی اس کے حکم کی تعمیل کے لیے موجود ہے۔ ٹریفک والوں سے تو کوئی امید نہیں کہ وہ سڑک کے ایک کنارے کھڑے بسوں اور ویگنوں نے روزانہ یہ وصول کر رہے ہیں۔ ہاں اللہ بخش اس کے حکم کے مطابق غلط آنے والوں کی سرزنش کرتا ہے اور کبھی کبھی انہیں ایک زناٹے دار تھپڑ بھی رسید کر دیتا ہے۔

دفتر تک پہنچنے کے لیے دس اشاروں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہر اشارے پر ایک ہی صورت ہے' سپاہی مزے سے دوسرے کنارے کھڑا تماشا کرتا رہتا ہے۔ کچھ گاڑیاں اشارے کی بالکل پروا نہیں کرتیں' کچھ رک تو جاتی ہیں لیکن پیچھے سے مسلسل ہارن بجاتی رہتی ہیں۔ اب اس پر غصہ نہ آئے تو کیا آئے۔ وہ اللہ بخش کو حکم دیتا ہے کہ ہارن توڑ دے' لحہ بھر کے لیے سکون مل جاتا ہے۔ دائیں بائیں غلط آنے والی گاڑیوں کی بات ہی نہیں لیکن وہ اکثر اللہ بخش کے ذریعے انہیں ٹریفک قواعد کی کتاب پڑھوا دیتا ہے۔

''یار تم کہاں آ گئے ہو' مجھے نکلواؤ گے اور خود بھی نکلو گے۔''

اس کی عادت ہے کہ انتہائی بائیں طرف آہستہ رفتار میں چلتا ہے لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی گاڑی پیچھے سے ڈپر مارتی رہتی ہے۔ ایسے موقعوں پر اللہ بخش ہی یہ ڈپر توڑتا ہے اور کبھی کبھی تیز رفتار ویگنوں اور سوزوکیوں کے چاروں ٹائر پنچر کر دیتا ہے۔ ایسے لحوں میں اسے بڑا لطف آتا ہے...... ''الو کے پٹھے آگے نکلنا چاہتے ہیں' اب لگاؤ چاروں پہیوں کے پنچر''

دفتر میں بھی اللہ بخش اس کے ساتھ ساتھ ہے۔

بڑا افسر کہتا ہے...... ''یہ نوٹ بنا لاؤ''

وہ کہتا ہے...... ''لیکن سر یہ تو رولز کے خلاف ہے۔''

افسر اعلیٰ کو بڑا غصہ آتا ہے...... ''یار تم کہاں آ گئے ہو' مجھے نکلواؤ گے اور خود بھی نکلو گے۔''

کبھی اس کا موڈ ٹھیک ہو تو کہتا ہے...... ''یار بیٹھ جاؤ...... دیکھو ہم ایک بد دیانت نظام کے پرزے ہیں' اس بڑی مشین میں ہم دوسرے پرزوں کے ساتھ حرکت نہیں کریں گے تو ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔''

پھر ہمدردی سے اسے دیکھتے ہوئے کہتا ہے...... ''بھائی! کتابیں کم پڑھا کرو' یہ کتابیں تمہیں خوابوں کی دنیا میں لے گئی ہیں...... سچ مچ کی دنیا میں آؤ...... اور جاؤ یہ نوٹ بنا کر لاؤ''

اللہ بخش ایسے موقعوں پر اپنا کام دکھا دیتا ہے۔ وہ یا تو افسر اعلیٰ کی انگلیوں پر پیپر ویٹ اٹھا مارتا ہے کہ وہ نوٹ پر دستخط ہی نہ کر سکے یا پھر زیادہ فعال ہو تو غلط کام کروانے والے اصل شخص کی ٹانگیں توڑ دیتا ہے۔ غلط کام کرنے والوں کی ٹانگیں توڑنا تو روز کی بات ہے۔ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا مداوا تو فوراً ہو جاتا اور تھوڑی دیر لڑنے کے بعد نارمل ہو جاتا لیکن کبھی کبھار...... بلکہ اب تو اکثر دوسروں کے ساتھ زیادتی ہوتے دیکھ کر اسے اللہ بخش کو پکارنا پڑتا۔

''اللہ بخش دیکھ یہ شخص بلاوجہ اس غریب آدمی کو ڈانٹ رہا ہے' اسے ذرا کھمبے کے ساتھ لٹکا دو۔''

''جو حکم آقا......'' اللہ بخش جواب دیتا۔

اللہ بخش اس کے حکم پر متعلقہ افسر کی ٹانگیں توڑ آتا۔

سڑک پر اکثر بدمعاش قسم کے گاڑی والے اپنے قصور کے باوجود کسی دوسرے کو آنکھیں دکھاتے تو اللہ بخش اس کے حکم پر ایک لمحہ میں مظلوم کی مدد کو آ جاتا۔

اس کا معمول تھا کہ لنچ ٹائم میں ہلکا پھلکا کھانا' جسے وہ گھر سے لے کر آتا تھا' کھانے کے بعد کچھ دیر کے لیے ٹانگیں لمبی کر کے کرسی سے ٹیک لگا لیتا۔ ایسے میں صبح کی پڑھی ہوئی خبریں ایک ایک کر کے اس کے سامنے حاضر ہوتیں۔

''فلاں محلّہ میں پینے کا پانی ایک ہفتہ سے بند ہے کیونکہ ٹیوب ویل کی موٹر جل گئی ہے۔''

وہ اللہ بخش سے پوچھتا۔ ''موٹر کتنے کی ہے۔ یہ لوگ دو موٹریں کیوں نہیں رکھتے کہ ایک جل جائے تو فوراً دوسری استعمال میں آ جائے' اس کا مطلب ہے انہیں لوگوں کی تکلیف کا احساس ہی نہیں۔''

اللہ بخش اس کے حکم پر متعلقہ افسر کی ٹانگیں توڑ آتا۔

''پینے کے گندے پانی سے اتنی اموات''

وہ اللہ بخش سے پوچھتا...... پورے ملک میں صاف پانی کے پلانٹ لگانے میں کیا خرچ آئے گا ...... میرا خیال ہے اگر صرف ایک سال کوئی سرکاری تقریب نہ ہو تو اس رقم سے پورے ملک میں......

اللہ بخش ذمہ داروں کے تعین کے لیے کچھ دیر کے لیے غائب ہو جاتا۔ آنکھ کھل جاتی...... دفتر کا ڈرائیور اس کے کمرے میں آ کر کچھ دیر سستا لیتا...... صاحب جی تنگ آ گیا ہوں' پہلے صاحب کے بچوں کو سکول چھوڑنا' پھر صاحب کو دفتر لے کر آنا' پھر واپس گھر جا کر کچن کے لیے سودا لانا کہ بیگم صاحبہ کو تازہ سبزی گوشت پسند ہے' پھر انہیں بازار لے کر جانا' شاپنگ کرتی ہیں' اف' ایک ایک دکان سے گھنٹہ گھنٹہ باہر ہی نہیں آتیں' پھر بچوں کو سکول سے واپس لانا' صاحب کو گھر لیجانا' پھر شام کو...... رات ہو جاتی ہے ...... اور سرکاری پٹرول' صاحب پٹرول کتنا مہنگا ہو گیا ہے۔ وہ چپ چاپ سنتا رہتا......

''صاحب تھوڑی سی روٹی تو نہیں بچی۔'' وہ ٹفن اس کی طرف بڑھا دیتا ہے۔ یہ اس کی پرانی عادت ہے' تھوڑا سا کھانا زائد لانا۔ ڈرائیور تشکر سے اس کی طرف دیکھتا ہے...... صاحب اس ملک کا کیا بنے گا' ہماری تو ساری آمدنی ان لوگوں کے پٹرول پر ہی خرچ ہو جاتی ہے...... آج صاحب کے گھر کا سرکاری ٹیلی فون بل جمع کرا کے آیا ہوں چالیس ہزار...... بیگم صاحبہ۔ روزانہ گھنٹوں اپنی ماں سے کراچی بات کرتی ہیں...... صاحب جی۔

اللہ بخش فوراً اس کے حکم پر حرکت میں آ جاتا ہے۔

لیکن اب کچھ دنوں سے وہ محسوس کر رہا ہے کہ اللہ بخش بھی تھک گیا ہے۔ یا پھر یہ کہ اب ہر قدم پر اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ آخر ایک جن ہے' صرف ایک' اور ایک یا دو یا تین' چار' پانچ...... اب کچھ نہیں کر سکتے۔ ڈھلوان پر لڑھکتے ہوئے احساس زیاں کی بجائے قہقہوں اور لذت کی سسکاریاں سنائی دیں تو پھر کوئی کیا کر سکتا ہے...... اس کے پاس تو صرف ایک اللہ بخش ہے...... یہ اللہ بخش اس کے احکام کی تعمیل کر کر کے تھک گیا ہے۔

ایک دن اس نے کہا...... ''آقا! یہاں ہر چیز الٹی ہے' میں انہیں سیدھا نہیں کر سکتا۔''

''ہاں'' اس نے سر ہلایا' ایک سرد آہ بھری اور بولا...... ''یہ ملک' ملک جیسا ہے' یہ حکومت' حکومت جیسی ہے' یہ لوگ' لوگوں جیسے ہیں...... جہاں ہر شے اصل کی بجائے جیسی ہو وہاں کیا کیا جا سکتا ہے۔''

اللہ بخش چپ رہا۔

''آقا! یہاں ہر چیز الٹی ہے' میں انہیں سیدھا نہیں کر سکتا۔''

اس نے پھر سرد آہ بھری اور کہنے لگا...... ''میرے پاس تو اب خواب ہی رہ گئے ہیں' اور اب میرے خوابوں میں بھی یہ سب کچھ ہونے لگا ہے' اللہ بخش! میرے خوابوں کو ٹھیک کردو۔''

اللہ بخش سوچتا رہا' تادیر سوچتا رہا' پھر بولا...... ''آقا! جب خوابوں میں سے لذت چلی جائے اور ان میں دن کی تکرار ہونے لگے تو یہ خواب نہیں ہوتے' ذہنی روگ بن جاتے ہیں' اور جب خواب' خواب نہ رہیں تو دن کی اذیت' رات کی اذیت' اور رات کی اذیت' دن کی اذیت بن جاتی ہے۔''

وہ خاموش رہا' پھر اتنی مدھم آواز میں کہ خود اسے بھی سنائی نہیں دیا' کہنے لگا...... ''اللہ بخش! میری مصیبتوں کا کوئی حل نہیں' کہ ان کا ذمہ دار میں خود ہوں' جب ظلم سہنے میں لذت آنے لگے تو کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کرسکتا' اللہ بخش میں تمہیں آزاد کرتا ہوں!''

اللہ بخش نے کوئی جواب نہ دیا' دونوں کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے!

☆......☆......☆

گلزار جاوید

ایک فاتح اور مفتوح

کبھی کبھی معمولی فائدے کے لیے انسان بڑا نقصان کر بیٹھتا ہے۔ بزرگوں نے اسی بات کے پیش نظر لالچ کو بری بلا سے تعبیر کیا ہے۔ یوں تو ہم بھیڑ بھاڑ اور ہاؤ ہو سے بہت گھبراتے ہیں مگر معاملہ جب ہماری ذہانت و فطانت کی تعریف و توصیف کا ہوتا ہے تو ہم بڑے سے بڑا خطرہ مول لے کر بھی انسانی بھیڑ کو چیر کر اپنی راہ تلاش کر لیتے ہیں۔ آج کے میزبان کو ٹھینگا دینے کی ہم نے بہت کوشش کی۔ وقت کی قلت، کام کی زیادتی، طبیعت کا اضمحلال بھی کچھ ہمارے نہ آنے کے بہانے تھے جو ایک ایک کر کے ہم نے آج کے میزبان پر داغ ڈالے۔ ویسے بھی ایک ہی بلاوے میں آنے کی حامی بھر کے ہم اپنا وزن کم کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ہمارے ترکش میں اور بھی کئی تیر انکار کے عذر میں موجود تھے۔ مثلاً بیگم کی بیماری یا ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ، بچے کا عقیقہ یا سالگرہ وغیرہ، بیرون شہر سے مہمان کی آمد یا روانگی، سرکار دربار کی طرف سے ہنگامی پریس کانفرنس یا بلاوا، غرض دل بے ایمان حجتوں کے ڈھیر کے مصداق ہماری نیت کا فتور نہ جانے کون کون سے عذر تراشنے پر مائل بہ پرواز تھا کہ میزبان نے گزشتہ واقعے کا ذکر کرتے ہوئے ہماری عقل مندی کے غبارے میں ہوا بھرنا شروع کر دی۔

''راجہ منیر کس قدر خوش تھا' میں نے زندگی میں اس شخص کو اس انداز میں خوشی کا اظہار کرتے کبھی نہ دیکھا تھا۔ پڑھا لکھا مہذب آدمی ہو کر بھی کس فراوانی سے مغلظات کی تکرار میں ایک ہی بات دہرائے جا رہا تھا۔ دو سالوں کو نانی یاد آ رہی ہوگی، چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا ہے آج ہم نے بھی، حد ہوتی ہے ہر بات کی حد ہوتی ہے مگر اس مردود نے کسی بھی حد کو پار کرنے اور انسانیت کا خون کرنے میں کبھی دریغ نہیں کیا۔ ہم لوگوں سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ اس نابنجار کو آپ دیکھ لینا' لینے کے دینے پڑ جائیں گے' سالے کو اپنی سلامتی برقرار رکھنا مشکل ہو جائے گی۔ بڑا غرور تھا اس کو اپنی طاقت پر آج ہمارے چند نوجوانوں نے سالے کی ساری طاقت ناک کے ذریعے نکال کر رکھ دی۔ اب میں بھی دیکھوں گا نہ

پڑھا لکھا مہذب آدمی ہو کر بھی کس فراوانی سے مغلظات کی تکرار

یہ دنیا پر کس طرح حکومت کرتا ہے' کس طرح مجبور ولاچاروں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتا ہے......''

راجہ منیر اس وقت جذبات کی جس تیز ناؤ پر سوار تھا اس سے اختلاف کرنا ایک طرح سے اپنی سلامتی کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ پھر بھی بلاارادہ ہمارے منہ سے یہ الفاظ ادا ہو گئے۔''راجہ صاحب یہ جوش کا نہیں ہوش کا وقت ہے۔ دشمنی کے مضبوط قلعے سے چند اینٹیں نکال کر بغلیں بجانا سراسر حماقت ہے۔ یہ ایک سازش بھی ہو سکتی ہے ہمیں جال میں پھانسنے اور ہماری جگہ سے پیچھے دھکیلنے کی۔ ہم لوگ اس واقعے کے ردعمل میں کم و بیش ایک صدی پیچھے چلے جائیں گے۔ ایک مرتبہ پھر اندھیرے ہمارا مقدر بن جائیں گے۔ یہ موقعہ بچوں کی طرح پھل جھڑیاں چلانے والوں کے لیے تالیاں بجانے کا نہیں تدبر سے غور فکر کا ہے۔'' خدا معلوم ہمارے الفاظ میں اعتماد اور تفکر کا ردعمل تھا یا دل سے نکلنے والی صدا تھی راجہ صاحب کچھ کہنے سننے کے بجائے ہمارا منہ تکنے لگے۔ اس وقت انہیں اور بھی صدمہ پہنچا جب سلیمان صاحب' صابر صاحب' یحیٰی صاحب اور اکرام صاحب نے ہمارے خیال کی تائید میں سنجیدگی سے سر ہلا کر فکرمندی کا اظہار کیا۔

ہمارے رام ہونے کی ایک ٹھوس وجہ اور بھی تھی۔

ویسے تو میزبان نے ہماری فتح مندی کا اعلان کر کے ایک طرح سے میدان مار ہی لیا تھا مگر ہمارے رام ہونے کی ایک ٹھوس وجہ اور بھی تھی۔ ہم شروع سے پیٹ کے پتلے واقع ہوئے ہیں یعنی ہمارا شمار آپ خوش خوراک لوگوں میں کر لیں تو کوئی مضائقہ نہیں مگر یہ احتیاط رہے کہ ہم پیٹو یا مفت خور ہرگز نہیں ہیں۔ جب جب جہاں جہاں اچھا اور نفیس کھانا دستیاب ہوتا ہے تب تب ہماری پسلی وہاں جانے کے لیے ضرور پھڑ کنے لگتی ہے۔ جیسے ہی میزبان نے ترکش کے تمام تیر آزما کر ہمیں اطلاع دی کہ آج کی دعوت کا اہتمام ''لذت کام و دہن'' کے ذریعہ کرایا گیا ہے خود بخود انکار کی صلاحیت ہمارے اعصاب سے صلب کر لی گئی۔ کون بد ذوق ہوگا جو''لذت کام ودہن'' کے لذیز کھانوں اور نفیس پیشکش سے انکار کر سکے۔ یوں تو ''لذت کام ودہن'' ہر طرح کے مشرقی و مغربی کھانوں میں یکتا ہیں البتہ سیخ کباب' کڑاہی گوشت' بروسٹ مرغ' اور فرائی مچھلی کے ساتھ مغلئی بریانی اور شاہی تافتان خوشبو' لذت اور ذائقے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ اگر آپ کے ہاں ایک صد مہمانوں کی آمد کا امکان ہے تو آپ کو ایک سو پچاس افراد کے کھانے کا بندوبست کرنا ہوتا ہے کہ ''لذت کام و دہن'' کے کھانوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ آدمی پیٹ کے ساتھ دل بھر کر کھاتا ہے اور اس وقت تک کھائے چلا جاتا ہے جب تک اس کے اندر سے کسی طرح کے خطرے کا الارم نہیں بج اٹھتا۔

سب سے پہلا نقصان ہمیں جسمانی طور پر اس وقت اٹھانا پڑا جب لحیم شحیم میزبان نے اپنا قوی جثہ مصافحہ کے لیے بڑھے ہاتھوں کو نظرانداز کر کے ہماری ناتوانی سے بھڑادیا۔ اضافی طور پر گرمجوشی کے اظہار نے جسم کے بہت سے نادیدہ حصوں کو صدمہ پہنچا کر تکلیف کے ساتھ کوفت میں مبتلا کر دیا۔
''کیا خیال ہے آپ کا؟'' یقیناً آج کے واقعے کی طرف میزبان کا اشارہ تھا' قبل اس کے ہم زبان کھولتے وہ پھر گویا ہوئے۔ ''پچھلے واقعے کی طرح اس واقعے کا بھی کوئی نام ضرور رکھا گیا ہوگا؟''
''سات سات کے علاوہ آج کے دن کو اور کیا نام دیا جا سکتا ہے مگر میں اسے واقعہ نہیں سانحہ کہوں گا'' مختصر اظہار خیال کے بعد ہماری خواہش میزبان سے گلاخلاصی حاصل کر کے محفل میں شریک دیگر لوگوں سے ملنے کی تھی۔ میزبان ہمارے ارادے کو بھانپ گئے تھے یا ان کی چھٹی حس نے ان کو ہمارے فرار کی اطلاع پہنچائی تھی کہ انہوں نے بختی اور بے تکلفی کے باہم امتزاج کو بروئے کار لاتے ہوئے ہمارے ہاتھ کو تھام کر اپنے مہمانوں سے ہمیں ملانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ جیسے ہی ہمارے میزبان نے الف صاحب سے ہمارا تعارف کرانے کی کوشش کی۔ ''ارے صاحب انہیں کون نہیں جانتا یہ تو ہمارے ملک کے تھنک ٹینکس میں شمار ہوتے ہیں۔ بہت اچھا کیا آپ نے انہیں زحمت دی کر' آج کے واقعے کی بابت ان سے بہتر کون روشنی ڈال سکتا ہے۔'' ہم بزرگوں کے اس قول کو مدت سے پلے باندھے ہوئے ہیں کہ بولنے سے زیادہ سننے والا عقل مند ہوا کرتا ہے۔

نہیں صاحب ہرگز نہیں! میں پرانا کھلاڑی نہیں ہوں

ہم نے الٹا الف صاحب کی طرف سوال اچھال دیا۔ ''آپ کے محسوسات کیا ہیں آج کے سانحہ کی بابت'' ''اجی صاحب مشکل میں ڈال دیا ہے آپ نے!'' نظر کے دبیز چشمے کو آنکھوں سے اتار کر صاف کرتے ہوئے الف صاحب نے سلسلہ کلام آگے بڑھایا۔ ''دراصل اسٹاک مارکیٹ میں مندی نے میرے دماغ کو بالکل ماؤف کر دیا ہے۔ مجھے تو اس وقت خسارے کی فکر کھائے جا رہی ہے اگر ان کی محبت (میزبان کی طرف اشارہ) کا خیال نہ ہوتا تو میں آج' دعوت وغیرہ کھانے کی کنڈیشن میں قطعی طور پر نہیں ہوں۔'''' واقعی آج کے سانحہ کی وجہ سے اسٹاک مارکیٹ بہت نیچے آئی ہے' آپ فکر نہ کیجیے چند روز میں بہتر ہو جائے گی۔ آپ تو ویسے بھی پرانے کھلاڑی ہیں اسٹاک مارکیٹ کے اپ اینڈ ڈاؤن سے نپٹنا بخوبی جانتے ہوں گے۔''

ہم نے الف صاحب کے غم پر پھاہار کھنے کی کوشش کی تو وہ پوپلے ہو کر پگھلنے لگے۔ نہیں صاحب ہرگز نہیں! میں پرانا کھلاڑی نہیں ہوں۔ میں تو اچھا بھلا حکومت سے چھ پرسنٹ کی شرح پر سود لے کر ''قومی بچت'' میں چودہ پرسنٹ پر سرمایہ کاری کیا کرتا تھا۔ آٹھ پرسنٹ کی کمائی تھی آدھی اپنی اور آدھی ان کی۔ جب سے مالیاتی اداروں میں منافع کی شرح کم ہوئی ہے تب سے میں سٹاک مارکیٹ میں آیا ہوں۔ پہلے پہل تو مارکیٹ اوپر ہی اوپر جاتی رہی۔ گزشتہ کچھ دنوں سے نیچے کی طرف گرتی چلی جا رہی ہے اور مجھے نقصان کا خوف کھائے جا رہا ہے۔ ہمارے پاس الف صاحب کی دلجوئی کے لیے حوصلے اور تسلی کے سوا کچھ نہ تھا' فیاضی سے چند جملے ان کی نظر کر کے آگے بڑھنے میں عافیت جانی۔

''ان سے ملئے یہ ہمارے ملک کے سب سے بڑے بلڈر اور کالونی آرگنائزر ہیں اور ان کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔'' ب صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میزبان نے ہم دونوں کا تعارف کرایا۔ ''آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی' آج کی دعوت میں آنے کو جی نہ چاہتا تھا' اب آپ مل گئے ہیں تو ضرور آج کے واقعہ کی بابت تفصیل سے جان کر طبیعت ہلکی ہو جائے گی۔'' آپ کیا محسوس کرتے ہیں' کن لوگوں کی کارروائی ہو سکتی ہے یہ۔'' ایک بار پھر ہم نے مدمقابل کے کورٹ میں گیند لڑھکا دی۔

''دیکھئے صاحب! ہم تو اس بات کے قائل ہیں' جس کا کام اسی کو ساجھے' اگر میں آپ سے کہوں کہ آپ ہاؤسنگ سیکٹر پر تبصرہ کیجیے' اس کی ٹیکنیلیٹیز پر روشنی ڈالیے تو آپ کے ساتھ زیادتی ہو گی۔ عمر گزارنے کے بعد بھی ہر روز کوئی نہ کوئی نیا نکتہ' نئی الجھن سر اٹھائے کھڑی ہوتی ہے۔'' کمال کر رہے ہیں صاحب' ہماری معلومات کے مطابق آپ کے پیشے میں' پیسہ سیلابی پانی کی طرح آ رہا ہے۔'' جی ہاں بالکل آ رہا ہے' جا کس طرح رہا ہے یہ بھی تو غور کیجیے نا' بڑے بڑے مل اور فیکٹری اونر اپنے اپنے یونٹ فروخت کر کے ہمارے کاروبار میں انوسٹمنٹ کیے ہوئے ہیں۔ وہ ہر حال میں منافع چاہتے ہیں۔ انہیں اس سے کیا غرض کہ حکومتی ادارے کس طرح سے ہمارا بھرکس نکال رہے ہیں پریس کس طرح ہمارا ناطقہ بند کیے ہوئے ہے۔'' لفظ پریس کی ادائیگی پر ب صاحب تھوڑی دیر کو ٹھٹکے پھر خفت دور کرنے کے لیے بولے ''چھوڑیئے ان جھنجھٹوں کو یہ تو روز کا معمول ہے۔ آج جو کچھ ہوا اس سے طبیعت بڑی فکر مند ہے۔ خدا معلوم حالات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ ٹریڈ اور انڈسٹری پر کیا اثرات پڑیں گے؟'' قبل اس کے ب صاحب شہر کے اندیشے میں مزید ہلکان ہوں' ہم نے فضا میں مصنوعی طریقے پر ہاتھ ہلا کر خیالی دوست سے ہیلو ہائے کرتے ہوئے ب صاحب سے اجازت چاہی۔

آپ ہی بہتر روشنی ڈال سکتے ہیں آج کی دل ہلا دینے والی خبروں پر۔

''آپ کے قلم میں بڑا دم ہے' بڑی قوت ہے آپ کی تحریر میں خود کو پڑھوانے کی۔ آپ ہی بہتر روشنی ڈال سکتے ہیں آج کی دل ہلا دینے والی خبروں پر' بخدا' خبریں سنتے ہی کام' کاج سے جی اچاٹ ہو گیا۔ مجھے پوری امید تھی کہ آپ ضرور تشریف لائیں گے اور کچھ نہ کچھ امید ضرور بندھائیں گے۔'' ج صاحب نے تعارفی کلمات کے بعد ہمیں امتحان سے دو چار کر دیا۔ ان کی دردمندی دیکھتے ہوئے ہمارا جی چاہنے لگا کہ کچھ نہ کچھ اشک شوئی ان بے چاروں کی ضرور کرنا چاہیے۔ ''کیا عرض کروں' (رازداری سے کان کے قریب ہوتے ہوئے) لڑکوں نے دھڑا دھڑ پونڈ کی خریداری شروع کی ہوئی تھی۔ کرنی بھی چاہتے تھی' ہر روز اوپر ہی اوپر چلا جا رہا تھا۔ میاں' ایک ہی ہلے میں نو' دس روپے نیچے آ گیا ہے۔ خدانخواستہ حالات بہتر نہ ہوئے تو میرا کیا ہو گا؟ میں تو مفت میں مارا جاؤں گا' کمائی پانچ' دس پیسے کی اور خسارا نو' دس روپے کا' اللہ ہی کرم کرے گا' توبہ' توبہ میرے مالک' توبہ استغفار۔''

''فرض کر لیجیے! آپ کا استدلال درست بھی ہے پھر بھی آپ کیا کر سکتے ہیں؟'' چ صاحب نے نہایت چابکدستی سے گیند کو ہماری جانب لڑھکا دیا تھا۔ ''حکومت کو کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہو گا۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے خطرے کا مقابلہ تو نہیں ہو سکتا نا!'' ہم نے بھی سینہ تان کر پنلٹی اسٹروک مار دیا۔

''حکومت سے آپ کی مراد اگر بیوروکریسی ہے تو آپ سخت مغالطے میں ہیں! بندہ پرور تیس چالیس ہزار کی تنخواہ لینے والے کے اپنے مسائل اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ وہ کسی اور طرف دیکھ ہی نہیں سکتا۔ ہر طرف کرپشن کرپشن کا شور الگ ستائے رکھتا ہے۔ پلاٹ' پرمٹ' میڈیکل بل' بیرونی دورے کسی زمانے میں کرپشن ہوتے ہوں گے اب تو یہ وقت کی ضرورت ہے اس آدمی سے آپ کس طرح کی لانگ ٹرم پلاننگ کی توقع کر سکتے ہیں جس کے سر پہ ہر وقت تبادلے اور ٹرمینیشن کی تلوار لٹکتی رہتی ہو۔ میں تو سمجھتا ہوں ارباب اختیار نے اگر عقل کے ناخن نہ لیے تو اس طرح کے اور بھی بہت سے خطرات مستقبل قریب میں پیش آ سکتے ہیں۔ مجھے تو وہاں پر موجود نئی نسل کے مستقبل کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ میرا اپنا بیٹا وہاں زیر تعلیم ہے۔ خدا معلوم اس حادثہ کے بعد وہ کس حال میں ہو گا۔ تمام تر کوشش کے باوجود کسی طرح کا رابطہ نہیں ہو پا رہا۔''

'' باب اختیار سے آپ کا روئے سخن کس جانب ہے؟ آپ سے بڑھ کر صاحب اختیار کون ہو گا؟'' ح صاحب نے دخل در معقولات کرتے ہوئے چ صاحب کو کسی قدر مخمصے میں ڈال دیا۔ ''سر میرا مطلب یہ ہے' میں' میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ ہم تو نوکر لوگ ہیں۔ آرڈر اور حکم ماننے والے' پالیسی میکر تو آپ لوگ ہیں نا! عوام کے منتخب نمائندے جو پالیسی آپ لوگ وضع کرتے ہیں ہم لوگ تو اس کی تعمیل پر مامور ہیں سر!'' ''تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہماری غلط پالیسیوں کے نتیجے میں آج کا حادثہ رونما ہوا ہے؟'' ''نہیں سر نہیں! میرے کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا! میں تو یہ کہنا چاہتا تھا......'' ''اگر ہم انصاف

سے کام لیں تو اس وقت ملک میں سب سے زیادہ مظلوم مخلوق وہ لوگ ہیں جنہیں آپ عوام کے منتخب نمائندے کہتے ہیں۔ گلی گلی' محلّہ محلّہ' گاؤں گاؤں' شہر شہر ووٹوں کی بھیک مانگنے والے جس قدر بے بس اور مجبور ہیں اس ملک میں کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا! جن لوگوں کی قسمت میں ہر وقت قصیدہ گوئی لکھ دی گئی ہو جو لوگ ترقیاتی فنڈز کے نام پر الیکشن کے اخراجات کی بھیک مانگ رہے ہوں جس کی حاضری نچلے درجے کے سرکاری اہل کار لگا رہے ہوں وہ بھلا کیا اختیار کے مالک ہوں گے؟ میرے خیال میں سب سے زیادہ مظلوم ہم لوگ ہیں آپ کو ہمارے ساتھ ہمدردی برتنا چاہیے' ہماری امداد کرنا چاہیے......!

''اسی لیے تو ہم لوگ ہر وقت آپ کو ساتھ ملانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔'' خ صاحب بلا اجازت اور بغیر تمہید شریک گفتگو ہو کر باریش لوگوں کی نمائندگی کا فریضہ نبھا رہے تھے۔ میزبان کی توجہ پا کران کی آواز کا زیر و بم اور زیادہ ردھم میں آ گیا تھا۔ جب میزبان نے ان کی توجہ ہماری موجودگی اور گفتگو کا رخ آج کے حادثے کی جانب موڑنے کی کوشش کی تو انہوں نے بہت سی اہم باتوں سے روگردانی کرتے ہوئے ملک کے اندر جاری بے حیائی کی لہر کا ذمہ دار ہمیں اور ہماری برادری کو گردانا شروع کر دیا۔ ہمارے چہرے کا تبسم بھی اس وقت انہیں بہت کھل رہا تھا وہ صاحب ملک کے اندر اور باہر جاری ہر برائی کی جڑ اسلامی تعلیم سے روگردانی میں تلاش کر رہے تھے جب ان سے اسلامی تعلیمات کی تشریح کی بابت دریافت کیا گیا تو وہ اپنے مسلک کی تعلیمات پر زور دے کر کہنے لگے کہ صرف یہ ہی راستہ نجات کا ہے۔

میزبان کی توجہ پا کران کی آواز کا زیر و بم اور زیادہ ردھم میں آ گیا تھا

ح صاحب سے برداشت نہ ہوا تو انہوں نے خ صاحب پر حکومت کی بی ٹیم ہونے کا الزام دھر دیا۔ خ صاحب نے ان پر ملک کے باہر سے ہدایت لینے کا الزام داغ دیا۔ محفل میں شریک ایک نسوانی آواز د صاحبہ نے ازخود شریک گفتگو ہو کر ملک میں انسانی حقوق کی عدم دستیابی اور ان کے لیے جدوجہد کرنے والوں کے حشر سے آج کے حادثہ کو نتھی کر دیا۔ خ صاحب نے جوش جذبات میں د صاحبہ پر بے حیائی اور فحاشی کا الزام جڑ دیا۔ د صاحبہ نے خ صاحب پر فطانیت کا الزام بڑی شد و مد سے لگایا اور آج کے سانحے کا ذمہ داری خ صاحب اور ان کے گروہ کے سر ڈال دی۔ الف۔ ب۔ ج۔ ح۔ خ۔ د وغیرہ ہم آواز ہو کر بولنے لگے۔ ہر کوئی ایک دوسرے کو اپنے نکتہ نظر کا قائل کرنا اور دوسرے کو غلط ٹھہرانا چاہتا تھا۔ میزبان بے بسی کے ساتھ کبھی ایک طرف کبھی دوسری طرف خشمگیں نظروں سے دیکھتے اور چہرہ پر

مصنوعی مسکراہٹ سجا کر ہر کسی کے حق میں اثبات میں سر ہلا کر گلو خلاصی کرنا چاہتے تھے مگر محفل کا مزاج اس قدر گرم ہو چکا تھا کہ کوئی بھی شخص اپنے مقام سے ہٹنے کو تیار نہ تھا اور آج کے واقعہ کا ذمہ دار ایک دوسرے کو ٹھہرایا جا رہا تھا۔ ہم بڑے حیران تھے کہ میزبان کھانا کھول کر اس قصے کو ختم کیوں نہیں کر دیتا!

یکا یک محفل میں شریک سب لوگوں کی آواز آہستہ آہستہ گھٹنا شروع ہو گئی۔ سب کے چہروں کا تناؤ بھی خود بہ خود کم ہونا شروع ہو گیا خدا معلوم نو وارد کی آمد یا اس کی شخصیت کا سحر تھا یا اس کے کاندھوں پر سجے پھولوں کی کشش تھی کہ سب کے سب چہرے ہشاش بشاش دکھائی دینے لگے کسی کو کسی سے کوئی گلہ نہ تھا۔ ہر کوئی نو وارد سے بڑھ کر ملنے اور مل کر اسے خوش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نو وارد نے گلا کھنکار کر بڑے وقار سے میزبان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں کوئی خاص مسئلہ زیر بحث تھا۔'' نہیں سر! ایسی تو کوئی بات نہیں، بس...... وہ...... ذرا...... آج کے حادثے کی بابت اظہار خیال ہو رہا تھا...... اچھا تو یہ بات ہے...... میں سمجھا کوئی اہم مسئلہ درپیش ہے، ویل جنٹلمین! آپ لوگ ہرگز فکر نہ کریں، ہمارے ہوتے ہوئے آپ کو فکر کرنے کی ضرورت کیا ہے، ہم ہیں نا فکر کرنے کے لیے، آپ نے غور نہیں فرمایا، ہم نے کتنے تھوڑے وقت میں غربت، جہالت، صحت، صفائی کے باب میں کتنی بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ دفاعی شعبے میں بھی ہم نے دشمن کو منہ توڑ جواب دیا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر بھی بڑی کامیابیاں ملی ہیں۔ جو لوگ پہلے ہم سے سیدھے منہ بات کرنا پسند نہیں کرتے تھے اب برابری کی سطح پر آ کر معاملات کر رہے ہیں۔ زرمبادلہ کے ذخائر ترقی کی تیز رفتاری بہت جلد ہمیں وہ مقام دلا دے گی جو خطے میں کسی اور کو حاصل نہ ہو گا۔ خوشحالی بہت جلد ہمارے قدم چومنے کو ہے! خوش ہو جائیے، مطمئن رہیے! ہم ہیں نا! آپ کی خدمت کے لیے!

ہم بڑے حیران تھے کہ میزبان کھانا کھول کر
اس قصے کو ختم کیوں نہیں کر دیتا!

تالیوں کی تیز آواز میں، زندہ باد، مبارک باد، بہت عمدہ، بہت خوب اور لاجواب کی لے میں لے ملاتے ہوئے میزبان کھانا تناول فرمانے کی زحمت کے لیے مہمانوں کو پکار رہا ہے۔ تمام مہمان سدھائے ہوئے لے پالکوں کی طرح کھانے پر اس طرح ٹوٹ پڑے ہیں جیسے دشمن کی فوج پر ٹوٹا جاتا ہے۔ چند لمحے قبل نظر آنے والے سیخ کباب، کڑاہی گوشت، بروسٹ چکن، فرائی مچھلی، مغلئی بریانی اور شاہی تافتان کے پہاڑ پسپائی اختیار کر چکے ہیں۔ اب ان کا نشان ڈھونڈنا اسی طرح محال ہے جس طرح گم گشتہ قوموں کی تہذیب، تاریخ اور آثار تواریخ ہوا کرتے ہیں اور کیوں نہ ہو ایک وقت میں ایک فاتح

اور ایک مفتوح ضرور ہوا کرتے ہیں۔ ہماری نظروں کے سامنے ایک سے ایک بڑا فاتح مسرور و مطمئن ہو کر جا رہا ہے اور ہم نو گیارہ کی طرح سات' سات کو ہونے والے واقعے پر نوحہ کناں ہونے کے لیے کسی ہمدرد و غم گسار کی تلاش میں ہیں جس کے بطن سے مستقبل قریب و بعید میں' خدا معلوم کیا کیا افسانے تراشے جائیں گے اور کس کس رنگ میں تراشے جائیں گے......

☆......☆......☆

ڈاکٹر کیول دھیر کا منتخب افسانہ

کیول دھیر کی کہانیوں میں نفسیاتی، رومانی اور سماجی حقائق کی بے حد فنکارانہ انداز میں عکاسی کی گئی ہوتی ہے۔ ان کی تحریروں میں بے پناہ خلوص جھلکتا ہے۔ ان کے خوبصورت انداز نگارش سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں۔

(کرشن چندر)

کیول دھیر ایسے ''ڈاکٹر ادیب'' ہیں جو چیر پھاڑ اور کڑوی دواؤں کے ساتھ انسان کے جسم ہی کو نہیں، دل کو بھی دیکھتے ہیں۔ آلہ سے نہیں، احساس قوت سے۔ خدا ان جیسے ادیب انسان پیدا کرے کہ یہ ملک بڑا بیمار ہے۔

(عصمت چغتائی)

''......کیول دھیر کے افسانے چونک جانے کے لیے مجبور کرتے ہیں اور پھر ایک عجیب سی کسک، تڑپ اور اکساہٹ پیدا کرتے ہیں۔ ان کا انداز تحریر بے حد خوبصورت اور تاثر انگیز ہے۔''

(راجندر سنگھ بیدی)

انتہائی دلکش اور شگفتہ انداز نگارش کیول دھیر کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کی ہر تخلیق تاثر انگیز ہوتی ہے اور ہر تحریر خوبصورت......!

(جاں نثار اختر)

ڈاکٹر کیول دھیر ایک بلند پایہ افسانہ نگار اور عظیم انسان ہیں۔ ان کے چاہنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہے جو ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ اس حلقہ میں میں بھی شامل ہوں۔

(علی سردار جعفری)

ڈاکٹر کیول دھیر کی فعال ادبی شخصیت نے اردو زبان اور ادب کے فروغ کے سلسلے میں جو خدمات انجام دی ہیں ان کا اعتراف ان سب کو ہے جنھیں اس زبان سے محبت ہے۔ مگر ڈاکٹر کیول دھیر نے ایک تخلیق کار ہونے کے ناطے بھی اردو ادب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔

(ڈاکٹر وزیر آغا)

ڈاکٹر دھیر جیسے محنتی اور لگن والے لوگ اتنے کم پیدا ہوتے ہیں کہ ساری قوم کو مدتوں ان کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ میری دعا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اور بھی اردو کے لیے وقف کر دیں۔ اور ہمیں سرحد پار بھی فخر عطا کریں۔ خدا انھیں آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا موقع عطا فرمائے۔

(بانو قدسیہ)

ڈاکٹر کیول دھیر

شناختی کارڈ

شاعروں، ادیبوں، فن کاروں، مصوّروں اور دوسرے تخلیقی کام کرنے والوں کے ایک جلسے کا اہتمام اس مقصد سے کیا گیا کہ ان مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے تمام لوگوں کے مسائل پر غور کیا جائے۔ جلسے میں ملک کے کونے کونے سے بہت بڑی تعداد میں تخلیق کاروں نے شرکت کی۔ زیادہ تر تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو مالی طور پر خستہ حال تھے۔ یہ محض اتفاق نہیں تھا بلکہ جلسے کے اہتمام کا بنیادی مقصد ہی تخلیق کاروں کو زندگی کا بہتر معیار مہیا کرانے کے اقدامات پر غور کرنا تھا۔

طے پایا تھا کہ جلسے میں کسی بھی غیر متعلق فرد کو شرکت کی اجازت نہ دی جائے کیوں کہ اس میں تخلیق کاروں کے ذاتی مسائل پر تبادلہ خیالات کیا جانا تھا۔ یہ بھی طے پایا تھا کہ اس جلسے میں کوئی مہمان خصوصی یا صدر نہیں ہوگا۔ کیوں کہ اندیشہ تھا کہ اس سوال کو لے کر کہیں تخلیق کاروں میں باہمی تکرار اور محاذ آرائی شروع نہ ہو جائے۔ مہمان خصوصی یا صدر عموماً نمایاں اور ممتاز شخصیت کا مالک ہوتا ہے اور تخلیق کاروں میں نمایاں اور ممتاز شخصیت کا انتخاب کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا کیوں کہ ہر تخلیق کار اپنے آپ کو کسی سے کم تصور نہیں کرتا۔ اس خیال سے کہ حساس تخلیق کاروں کا احساس مجروح نہ ہو، جلسہ کسی صدر محترم اور مہمان خصوصی کے بغیر منعقد ہو رہا تھا۔

ایک تخلیق کار کو نظامت کی ذمہ داری سونپی گئی تاکہ مائیک پر وہ باری باری ان لوگوں کے نام پکارتا رہے جن کو تقریر کرنا تھی۔ ناظم پر یہ شرط لگا دی گئی تھی کہ وہ کسی بھی تقریر کرنے والے کا تفصیلی تعارف پیش نہیں کرے گا اور نہ اپنی طرف سے کوئی غیر ضروری بات کہے گا۔

ادب اور فنون کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ایک ایک تخلیق کار پر مشتمل ماہرین کی ایک کمیٹی بنائی گئی تھی تاکہ وہ پیش کی جانے والی مختلف تجویزوں کو نوٹ کرتے رہیں اور بعد میں ایک جامع رپورٹ تیار کر سکیں۔ ناظم کو اجلاس کی کارروائی شروع کرنے سے پہلے ایک تحریری بیان

طے پایا تھا کہ اس جلسے میں کوئی مہمان خصوصی یا صدر نہیں ہوگا

پڑھنے کے لیے دیا گیا جو اس طرح تھا ——

''اس ملک کے عظیم تخلیق کارو! آپ تمام خواتین و حضرات کو آج کے اس اہم جلسے میں شرکت کی دعوت اس لیے دی گئی ہے کہ ہم مل بیٹھ کر اپنے مسائل پر سنجیدگی سے غور کر سکیں اور اس ملک کے تخلیق کاروں کا معیار زندگی بہتر بنانے کے لیے حاکم ملک کی خدمت میں ٹھوس تجاویز پیش کر سکیں۔ یہ ادیبوں، فن کاروں، مصوروں اور شاعروں کے دکھ درد کے اظہار کا جلسہ ہے اس لیے ہر مقرر صرف اپنے دکھ درد بیان کرنے کی زحمت فرمائے۔ فن اور فنکار کے کسی بھی دوسرے پہلو پر بحث اور تنقید کرنا ممنوع ہے۔''

تحریری بیان پڑھنے کے بعد ناظم نے سب سے پہلے ملک کے ایک بزرگ شاعر جناب فلاں صاحب کو تقریر کرنے کی دعوت دی۔ اپنی تقریر میں شاعر محترم نے فرمایا:

''اس ملک کے فن کاروں میں شاعروں کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور ان کی زندگی سب سے زیادہ الم ناک ہے۔ شعری تخلیق کے لیے انھیں زندگی بھر تخلیقی کرب سے گزرنا پڑتا ہے۔ جوانی میں جوان ہونے کے احساس کے درد —— درد کے احساس کے جذباتی ردِ عمل —— اور جذباتی ردِ عمل سے تخلیق ہونے والے شعر سے ایک شاعر کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ شعر میں زندگی کا حسن سمونے اور حسین جذبوں کی تسکین کے لیے کسی پری پیکر محبوب کی ضرورت پیش آتی ہے۔ عموماً حالات ایسے ہوتے ہیں کہ شاعر بے چارہ ایک طرفہ عشق میں مبتلا ہو کر اپنے محبوب کے تصور میں شعر کہتا ہے اور اگر سچ مچ کوئی گل بدن اسے محبت کے قابل سمجھ کر اپنا محبوب بنا لیتی ہے تو بھی شاعر اس کے عشق میں ڈوب کر شعر تخلیق کرتا چلا جاتا ہے۔ عشق یک طرفہ ہو یا دو طرفہ، شاعر کے لیے اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کیونکہ دونوں حالتوں میں اپنی سدھ بدھ کھو کر اسے تخلیقی عمل میں غرق ہونا ہی پڑتا ہے۔ عشق تو محض اس کے لیے محرّک اور روح کی خوراک ہوتا ہے۔

''اس کے بعد دوسرا مرحلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب شاعر کے تصوّر کی محبوبہ اس کی آنکھوں کے سامنے کسی اور کی آغوش میں چلی جاتی ہے اور وہ کم نصیب ہر لمحہ آہیں بھرتا رہتا ہے۔ محبوبہ اگر حقیقی ہو تو بھی ستم زدہ شاعر کو آہیں بھرنا ہی پڑتی ہیں کیوں کہ اکثر حالات میں رسوا ہونے سے پہلے یا نیم رسوائی یا مکمل رسوائی کے بعد محبوبہ اپنے محبوب شاعر کے دلکش الفاظ کے حصار کو توڑ کر جب سماج کی تلخ حقیقت اور شاعری کی مفلسی سے آشنا ہوتی ہے تو کسی اور کی بیوی بن جاتی ہے۔ شاعر کی زندگی کا یہ دور بہت ہی نازک اور اندوہناک ہوتا ہے اور اپنی تمام تر شاعرانہ نزاکتوں، غموں اور خوابوں کو وہ مئے کے پیالوں میں ڈبو دیتا ہے۔ اس طرح موسموں کی طرح شاعر

عشق یک طرفہ ہو یا دو طرفہ، شاعر کے لیے اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا

کی زندگی کے حالات بدلتے ہیں لیکن اس کا تخلیقی عمل برابر جاری رہتا ہے۔

یہ شاعر کی زندگی کا المیہ ہے کہ وہ عمر بھر ہر طرح کی محرومی کا شکار ہوتا رہتا ہے۔ میدان محبت میں، ازدواجی زندگی میں، سماج کے ہر شعبے میں یہی محرومی اس کے لیے سدِ راہ بنی رہتی ہے۔ شطرنج کی طرح شاعری کے میدان میں بھی اپنے ہوشیار اور چالاک حریفوں کی شاطرانہ چالوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے اسے ان ہی محرومیوں کے باعث بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شاعر کی محرومیوں کا سب سے بڑا سبب اس کی خستہ مالی حالت ہے۔ اس لیے شاعروں کو بہتر معیار زندگی فراہم کرنے کے لیے لازم ہے کہ ان کی مالی مفلسی کو ختم کیا جائے۔

زوردار تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے بعد ناظم نے ایک ادیب کو مائیک پر آکر اپنے دکھ درد بیان کرنے کی دعوت دی۔ ادیب نے شاعر محترم کی تقریر میں شامل بعض نہایت اہم باتوں کی تائید کرتے ہوئے مزید فرمایا کہ بہت سے قلم کار بیک وقت ادیب اور شاعر دونوں ہوتے ہیں اس لیے ان کے بہت سے مسائل یکساں نوعیت کے ہوتے ہیں۔ جو لوگ صرف ادیب یعنی افسانہ نگار، ناول نگار، ڈراما نگار، انشائیہ نگار، محقق، تنقید نگار یا ایسے ہی کوئی اور نگار ہوتے ہیں ان کے مسائل میں کسی قدر فرق ہوتا ہے۔ تخلیقی عمل جاری رکھنے کے لیے انھیں زیادہ وقت درکار ہوتا ہے، فراغت اور تنہائی کی ضرورت ہوتی ہے، ایسا ماحول درکار ہوتا ہے جو قدرتی مناظر، اونچے نیچے پہاڑوں، بل کھاتی، بہتی ندیوں، جھیلوں اور جھرنوں سے گھرا ہو، جہاں زندگی کا سارا حسن اور تمام تر رعنائیاں سمٹ آئی ہوں ——— یہی وہ ماحول ہے جو ادیب کے قلم کو تحریک بخشتا ہے لیکن ہمارے ادیبوں کو عموماً ان میں سے کچھ بھی میسر نہیں آتا۔ اس کے برعکس جب کوئی ادیب بڑی مشکل سے اپنے دل و دماغ اور جسم کو سوچ کی ایک لڑی میں باندھ کر لکھنے کا موڈ بناتا ہے تو اس کی بیوی زور زور سے چلا کر کہتی ہے کہ گھر میں آٹا نہیں۔ کرائے، بجلی اور پانی کا بل ابھی ادا نہیں ہوا۔ چنو، منو، ٹینا، مینا کے سکول کی فیس درکار ہے، وغیرہ اور اپنی پیاری بیوی کی اس زوردار چنگھاڑ کی زد میں ادیب کی نازک سوچ ڈر اور سہم کر دبک جاتی ہے۔ یعنی ادیب سے تخلیقی ادب کی توقع اسی صورت میں کی جا سکتی ہے جب اس کی مالی حالت بہتر ہو۔

اب باری ایک مصور کی تھی۔ اس نے بھی محترم شاعر اور ادیب صاحب کی تقریروں کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ مصور کو بھی ایک حسین ماحول چاہیے۔ اس نے مزید شکایت کی کہ فن مصوری میں استعمال ہونے والے کینوس، برش رنگ اور دیگر سامان اس قدر مہنگا ہے کہ مالی بدحالی

بیوی کی اس زوردار چنگھاڑ کی زد میں ادیب کی نازک سوچ ڈر اور سہم کر دبک جاتی ہے

کے باعث مصور اسے آسانی سے خرید نہیں سکتا اور اس کے بغیر فن مصوری میں وہ اپنا کمال نہیں دکھا سکتا۔ تقریر ختم کرتے ہوئے مصور نے بھی فن کارروں کے بہتر معیار زندگی کے لیے بہتر مالی حالات کی پرزور مانگ کی۔

اپنی باری آنے پر محترم موسیقار نے بھی مفلسی کی یہی کہانی دہرائی اور اپنے فن سے وابستہ مختلف مسائل کو نہایت سنجیدگی سے سامعین کے سامنے پیش کیا۔ اس کے بعد چند اور مقرر بھی مائیک پر آئے اور سب نے یک زبان ہو کر ایک ہی مانگ پیش کی کہ تخلیق کاروں کو بہتر معیار زندگی مہیا کرنے کے لیے ان کی مالی پریشانیوں کو دور کیا جائے تاکہ وہ بے فکر اور یک سو ہو کر تخلیقی کام جاری رکھ سکیں۔

جلسے کی صبح کی نشست ختم ہوتے ہی تمام تخلیق کار لنچ کے لیے جانے سے پہلے اپنے اپنے پسندیدہ مشغلوں میں مصروف ہو گئے۔ سگریٹ اور سگار کا دھواں چاروں طرف بادلوں کی طرح منڈلا رہا تھا۔ مئے کی توبہ شکن خوشبوؤں سے ماحول معطر ہو اٹھا تھا۔ پان کی سرخیاں در و دیوار پر بیل بوٹوں کی طرح چسپاں ہو گئی تھیں۔ ایک طرف بہت سے شاعر حضرات چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹے اپنے تازہ ترین اسعار سنا رہے تھے تو دوسری طرف بعض ادیب حضرات کسی ادبی موضوع پر سنجیدہ گفتگو کرتے کرتے آپس میں الجھ رہے تھے۔ ماحول میں کہیں کہیں سنگیت کی دھنیں بھی رقص کر رہی تھیں اور خواتین کے مانند لمبی زلفوں اور درویشوں جیسی ملائم اور طویل داڑھیوں سے سجے کئی لوگ آسمان میں نیلے اور سرمئی بادلوں کی پرچھائیوں پر نظریں جمائے اپنے تصور میں شاید کسی پورٹریٹ کے نقش تلاش کر رہے تھے۔

سب حاضرین نے متفقہ طور پر اس تجویز کی تائید کی

لنچ سے پہلے لنچ کے دوران اور بہت دیر بعد تک ماحول شاعرانہ، ادیبانہ اور فن کارانہ بنا رہا۔ جب سہ پہر کی نشست شروع ہوئی تو ناظم نے ماہرین کی کمیٹی کے ایک رکن کو مائیک پر آکر جلسے کی کارروائی سے نکلنے والے نتیجوں کا احوال بیان کرنے کی دعوت دی۔ انھوں نے فرمایا کہ ماہرین کی کمیٹی تمام نمائندہ تخلیق کاروں کے دکھ درد کی روداد سننے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ہمارے تمام مسائل کی جڑ ہماری خستہ مالی حالت ہے۔ جب تک تخلیق کار مالی پریشانیوں سے آزاد نہیں ہوتا وہ تخلیقی کام سرانجام نہیں دے سکتا اور نہ اس کا معیار زندگی بہتر ہو سکتا ہے۔ اس لیے ماہرین کی کمیٹی نے حاکم ملک کے آگے یہ تجویز پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے کہ ہر تخلیق کار کو ایک شناختی کارڈ جاری کیا جائے جسے دکھا کر وہ اپنی ضرورت کی کوئی بھی شے کہیں سے بلاقیمت حاصل کر سکے۔ ایسے شناختی کارڈ ہی تخلیق کار کے معیار زندگی کی ضمانت ہو سکتے ہیں اور وہ مکمل بے فکری کے

عالم میں ادب اور فن کے مختلف شعبوں میں بہتر تخلیقی کام سرانجام دے سکتا ہے۔
سب حاضرین نے متفقہ طور پر اس تجویز کی تائید کی۔ امیدوں، آرزوؤں اور مچلتی خوابیدہ خواہشوں کی دھڑکنوں کا احساس لیے ہر تخلیق کار ایسا خوش اور مطمئن نظر آتا تھا جیسے بہت جلد ایک حسین بہتر معیاری زندگی اس کی قدم بوسی کی منتظر ہو۔
نمائندہ تخلیق کاروں پر مشتمل ماہرین کی کمیٹی نے اپنی تفصیلی رپورٹ کے ساتھ ایک میمورنڈم تیار کیا اور جلد ہی اسے حاکم ملک کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔

سارے تخلیق کار، ان کی محبوبائیں، بیویاں بچے، دوست احباب بے حد خوش تھے

حاکم ملک بھی ایسے فراخ دل، فنون کے سرپرست یا شاید صرف رحم دل نکلے کہ انھوں نے فوراً تخلیق کاروں کی اس مانگ کو تسلیم کرتے ہوئے ایک اعلان نامہ جاری کر دیا جس میں کہا گیا کہ تخلیق کار کسی بھی ملک وقوم کی ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں۔ ان کی خوش حالی ملک وقوم کی خوش حالی کی ضمانت ہوتی ہے۔ وہ حاکم ملک اور رعایا دونوں کے لیے مشعل راہ ہوتے ہیں۔ ان کا مقام نہایت اعلیٰ اور بلند ہوتا ہے۔ تخلیق کار اپنے تخلیقی عمل سے صحیح طور پر ملک وقوم کی رہ نمائی کرتے ہوئے ایک نئے سماج کی تعمیر کر سکیں، اس کے لیے لازم ہے کہ ان کا معیار زندگی بہتر بنایا جائے اور انھیں مالی پریشانیوں سے نجات دلائی جائے۔ اس عظیم اور مقدس مقصد کے حصول کے لیے حاکم ملک اپنا فرض ادا کرتے ہوئے یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہر تخلیق کار کو ایک خوبصورت گھر، اس کی پسندیدہ سواری اور ایک ایسا شناختی کارڈ جاری کیا جا رہا ہے جسے دکھا کر وہ کہیں سے بھی اور کسی بھی وقت اپنی ضرورت کی کوئی بھی شے مفت حاصل کر سکیں گے۔
حاکم ملک کی طرف سے جاری کیے ہوئے اس اعلان نامے کی تشہیر پورے زور وشور سے کی گئی۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخباروں اور رسالوں کے ذریعہ سارے متعلقہ محکموں کو ہدایت کی گئی کہ وہ اس اعلان نامے پر حرف بہ حرف عمل درآمد کرانے کا بندوبست کریں۔ حکم عدولی کرنے والے کو سخت ترین سزا دی جا سکتی ہے۔
سارے تخلیق کار، ان کی محبوبائیں، بیویاں بچے، دوست احباب بے حد خوش تھے۔ تخلیق کار کو بے فکری میسر ہوئی تھی۔ محبوباؤں کو مسرت کا احساس ہوا تھا۔ بیوی بچے مطمئن تھے کہ ان کی روزی روٹی کا مسئلہ حل ہو گیا۔ دوست احباب کو اطمینان ہوا تھا کہ اب کوئی تخلیق کار ان پر بوجھ نہیں بنے گا۔

اعلان نامہ جاری ہونے کے چند روز بعد ہی حاکم ملک کی طرف سے ایک خصوصی اجلاس منعقد کیا گیا جس میں سارے ملک کے تخلیق کاروں نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں ان تخلیق کاروں کی فہرست جاری ہونا تھی جنھیں حاکم ملک کی طرف سے ساری سہولتوں کے لیے شناختی کارڈ عطا کیے جا رہے تھے۔

حاکم ملک کی طویل تقریر کے بعد تخلیق کاروں کی جو فہرست جاری کی گئی وہ کچھ اس طرح تھی۔۔۔۔

(۱) نمائندہ تخلیق کاروں پر مشتمل ماہرین کی کمیٹی کے ہر رکن کو ایک ایک آراستہ بنگلہ، دو نوکر، ایک کار مع ڈرائیور اور شناختی کارڈ۔

(۲) جناب ۔۔۔۔ (جو حاکم ملک کے ہم زلف کے چچا زاد بھائی ہیں اور جنھیں مختلف شاعروں کے منتخب شعر جمع کرنے کا شوق ہے)

ان میں سے کسی کا بھی نام اس فہرست میں شامل نہیں تھا

(۳) جناب ۔۔۔۔ (جو حاکم ملک کے پرائیویٹ سکریٹری کے جگری دوست اور ایک مقامی اخبار کے مالک ہیں اور اپنے ماتحت تخلیق کاروں سے افسانے لکھوا کر اپنے نام سے شائع کرانے کا شوق رکھتے ہیں)

(۴) محترمہ ۔۔۔۔ (جو فن مصوری کے نیم سرکاری ادارے کے سربراہ کی اہلیہ ہیں اور اپنے شوہر کے رسوخ کے سہارے ماتحت اور غیر معروف کلاکاروں کی بنائی ہوئی تصویریں اپنے نام سے منسوب کر لیتی ہیں۔

(۵) جناب ۔۔۔۔ (جن کو سیاست میں گہری دلچسپی ہے اور اس کے علاوہ وہ ہارمونیم، طبلہ، سارنگی وغیرہ بنانے کی فیکٹری کے مالک ہیں)

نام سنائے جاتے رہے اور ہال میں نمائندہ تخلیق کاروں پر مشتمل ماہرین کی کمیٹی کے اراکین، ان کے خاندان کے افراد، حاکم ملک کے منظور نظر اور ان نام نہاد تخلیق کاروں کی تالیوں کی آواز بلند ہوتی رہی جن کے ناموں کا اعلان کیا جا چکا تھا یا کیا جانے والا تھا اور اجلاس میں حاضر تخلیق کاروں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں کیوں کہ ان میں سے کسی کا بھی نام اس فہرست میں شامل نہیں تھا۔

●●●●●●●●●●●●●●●

مقصود الٰہی شیخ

برسو رے نینوا مورے......

صبح کی بوندا باندی بھی مجھے باز نہ رکھ سکی۔ میں سیر کے لیے نکل گیا۔ مانوس منظر آج نیا لگ رہا تھا۔ فضا میں خنکی کے علاوہ بھیگے پن کا احساس رچا تھا۔ پہاڑ پر کہر چھا رہی تھی۔ درختوں سے بارش کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ ایک طرف کے مکانوں کی چھتوں کی کھپریلیں، دوسری طرف کے مکانوں کی بالائی منزل کی آدھی آدھی کھڑکیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ جب سورج نکلا تو کئی رنگ آسمان پر بکھر گئے یہ اور بھی اچھا لگا۔ مجھ میں تازگی سی بھر گئی۔

سیر سے لوٹا، دروازہ کھولا، فرش پر دو لفافے پڑے تھے۔ ہوائی ڈاک سے آنے والے یہ خط، زبیر کے علاوہ اور کس کے ہو سکتے تھے؟ میں نے چاہت سے لفافے اٹھائے، ایک ہفتے کے وقفے سے لندن سے ڈاک میں ڈالے جانے والے یہ دونوں خط ایک ساتھ پہنچے تھے۔ ایک لفافہ ذرا بھاری تھا...... میں فیصلہ نہ کر پا رہا تھا کہ پہلے کون سا خط پڑھوں؟

زبیر میرا داماد ہے، دراز قد چھریرا بدن، کھلی پیشانی، گھنے سیاہ گھنگھرالے بال، صاف رنگ، بڑی بڑی ذہین آنکھوں والا من کو بھا جانے والا، خوش اطوار نوجوان۔ ہمارے درمیان اس رشتے کے علاوہ دوسرا رشتہ باہمی پسندیدگی کا ہے۔ وہ میرا احترام کرتا ہے مگر بے تکلف بھی ہے اور میں...... اگر میرا کوئی بیٹا ہوتا...... زبیر مجھے ویسا ہی پیارا ہے۔

ڈاک خانے کی مہر دیکھ کر پہلے پوسٹ کیے جانے والے خط کو پہلے پڑھنے کا سوچتا ہوں، مگر مجھے کرید ہے ایک ہفتے کے دوران ایسی کیا بات ہوئی ہوگی کہ زبیر نے دوسرا خط بھی لکھا؟ کوئی کرید سی کرید ہے؟ سچی بات ہے دوسرے ہلکے لفافے میں "کیا لکھا ہے؟" پڑھنے کا تجسس ہوا، اتنی جلدی جلدی وہ خط نہیں لکھا کرتا۔

زبیر سے میری پہلی ملاقات یاد آگئی۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ عینا کا ہاتھ مانگنے آیا تھا، میری بیٹی کی ہونے والی ساس کا رویہ بڑا جارحانہ تھا، شاید عینا کو یہ سب معلوم تھا، وہ مجھ سے

ایک ہفتے کے دوران ایسی کیا بات ہوئی ہوگی کہ زبیر نے دوسرا خط بھی لکھا

کترائی کترائی تھی۔ میں نے ہی اسے پالا پوسا تھا۔ بڑی پیاری تھی، پھر بھی میرے دل میں تھوڑا غصہ گھس بیٹھا کہ یہ سب اس نے پہلے کیوں نہ بتایا؟ وہ تو مجھ سے کچھ چھپاتی نہیں تھی۔

عینا چار سال کی تھی جب اس کی ماں اللہ کو پیاری ہوئی، مجھ سے یہ وعدہ لینے کے بعد کہ میں بچی کو ماں بن کر پالوں گا۔ نشاط نے عینا کو بلانا چھوڑ دیا تھا۔ کہتی تھی اب اس کو ہسپتال نہ لایا کرو۔ اس کے دو روز بعد ہی ہونی پوری ہوگئی۔ میں سامنے بیٹھا تھا، بائیں پھیپھڑے کا (کارسی نوما) کینسر اسے دو سال کے اندر ہی کھا گیا تھا۔ وہ سوکھ کر کانٹا سی بن گئی تھی۔ اٹھا بیٹھا نہ جاتا تھا۔ آخر میں بال غائب ہو گئے تھے، مگر پھر بھی حسین لگتی تھی۔ دیکھنے والے حیران ہوتے پر تکتے رہتے کہ وہ اس حالت میں بھی کیوں کر سب کو اچھی لگتی ہے۔ نرسیں تک بہانے سے آس پاس منڈلایا کرتیں۔ دوسرے مریضوں کے پرسان حال آ بیٹھتے اور بور نہ ہوتے اور میں ...... میں تو اس کا دیوانہ تھا ہی۔ آج بھی روتا ہوں ...... جب اس نے آخری بار میرا ہاتھ پکڑا، پپوٹے اٹھا کر بھرپور

اور میں ...... میں تو اس کا دیوانہ تھا ہی۔ آج بھی روتا ہوں

نظر ڈالی تو میرے دل میں ترازو ہوگئی۔ میں پورا چھد گیا۔ اس کی نظر کہہ رہی تھی، جانا نہیں چاہتی، دو چار لمبے سانس لیے اور دم دے دیا۔ اس کے ہاتھ کی یونہی سی مگر مکمل اور مضبوط گرفت میرے داہنے ہاتھ پر آج بھی ثبت ہے۔ اس کی وہ آخری نگاہ میں کبھی ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھلا سکا ہوں۔ جب نشاط کا دم اُکھڑا، گلے کا گھنگھرو بجنے لگا تو اس میں بھی ایک پرسحر نغمگی تھی کیسے بتاؤں ...... کیا تھا؟ دائمی جدائی کا منظر، سدا کے لیے میری آنکھوں، میرے احساس، میرے قلب و جگر، میرے ذہن کے گوشے گوشے میں اٹل حقیقت کی طرح گڑ گیا۔ آج بھی ویسا ہی زندہ ہے، ہمیشہ رہے گا۔ ساری زندگی بتا دی اس کی تصویر ہنوز آنکھوں میں بسی ہے۔

نشاط اور میرا پہلی نظر کا عشق تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے پر جی جان سے مر مٹے تھے۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ ہوگیا...... میں نہ مرا نہ مٹا ویسے ہی قائم ہوں وہ چل بسی !!!

عینا کو میں نے ماں بن کر بھی پالا اور باپ بن کر زمانے کے سرد گرم سے بچائے بھی رکھا۔ ہماری سنگت اور یگانگت کی انتہا تھی کہ گفتگو کے بغیر منشا جان لیتے تھے۔ گویا ایک دوسرے کا ذہن کھلا ہے جب جی چاہے پڑھ لو۔ پر...... اب کے ...... میں مات کھا گیا...... !

زبیر کے والدین، مسٹر اور مسز کمال کی اچانک آمد پر مبہوت تھا۔ مسز کمال نے بڑے منہ پھٹ انداز سے کہا تھا: ''بھائی صاحب سوچنا کیسا؟ کیسی مہلت؟ وقت ہی کہاں ہے؟ فیصلہ تو ہو چکا ہے!'' زبیر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ وہ اپنی ماں کے چبھتے لفظوں پر کھسیانہ ہو رہا تھا۔ کمال صاحب نے پردہ ڈالا: ''اب تو چلتے ہیں، کل تک سوچ کر ٹیلی فون کر دیجیے گا...... زبیر آپ ہی کا بچہ ہے۔''

مہمانوں کے جانے کے بعد عینا نے پوری اپنائیت اور بھروسے مگر خلوص میں ڈبک کر اور شاید پہلی بار باپ سمجھ کر ڈرتے ڈرتے مجھ سے کہا تھا: ''پپّا! پروگرام تھا میں زبیر کو چھٹی کے روز لاؤں گی مگر آج کالج میں زبیر نے بتایا کہ اسے فوری طور پر لندن جانا ہوگا۔''

عینا نے بات مکمل کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ میں سب کچھ جان گیا۔ وہ مجھے ہمیشہ ایسی ہی لگی، کوئی تبدیلی نہ آئی تھی، بلکہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ اچھی لگی۔ میں نے کبھی بیٹی پر پوری نظر نہ ڈالی تھی۔ ایک حجاب ہوتا ہے باپ بیٹی میں، پھر وہ تو نشاط کی ہو بہو تصویر تھی۔ دیکھنے کی ہمت ہی کہاں تھی۔ دودھیا رنگت، ویسا ہی بوٹا سا قد، اسی کی مانند دبلی پتلی، نازک نازک، چہرے پر طمانیت اور اعتماد کا نور، بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ذہانت کی چمک۔ اس کے حسن میں وجاہت و وقار کا دبدبہ آمیز تھا۔ آواز کی مٹھاس بالکل جدا اور انوکھی کہ بس سنتے رہو۔ عینا کے بال بھی اپنی ماما کی طرح بے حد گھنے تھے، بہت لمبے اور سیاہ۔ اس پر خوب پھبتے تھے مگر میں نے بچپن ہی میں اس لیے ترشوا دیے تھے کہ مجھ سے اس کا سر نہیں دھویا جاتا تھا اور بڑا ہونے پر خود اس کو عادت نہ رہی......!

عینا کو میں نے ماں بن کر بھی پالا اور باپ بن کر زمانے کے سرد گرم سے بچائے بھی رکھا

کسی بھی گھر میں اچانک رشتہ کے لیے لوگ آ جائیں تو بوکھلاہٹ یقینی ہوتی ہے پھر اس پر زبیر کی امی کا رویہ بڑا پریشان کن تھا۔ انکار کیسے کرتا؟ جان گیا تھا کہ زبیر اور عینا میں محبت ہے۔ ان کی چاہت مسز کمال کے الجھاووں سے بے نیاز ہے۔ اگر وہ اپنے خول سے نکل آئیں تو دوسروں کی طرح کھلی آنکھوں اقرار کریں گی ایسا جوڑ تو مدتوں میں ہوتا ہے کہ جو دیکھے دیکھتا ہی رہ جائے۔ ایک دوسرے کا جواب، ایک جان دو قالب اور دونوں لاجواب۔ آخر وہ کیوں بھنائی ہوئی تھیں۔ وہ زیادہ دولت مند ہوں گی، مگر ہم بھی تو انسان ہی تھے ...... عینا نے جتنا مناسب سمجھا، بتایا، وہ جھجک رہی تھی اور مجھے اطمینان ہو گیا تھا کہ اس نے غلط فیصلہ نہیں کیا، سو ٹیلی فون اٹھایا دوسرے روز کا منہ نہ دیکھا اور کمال صاحب سے کہہ دیا: ''جب دل چاہے، بارات لے آئیں......'' مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ عینا اور زبیر کی شادی تو پہلے ہی آسمانوں میں طے پا چکی تھی!!

زبیر لندن چلا گیا۔

پھر......

دو ہفتے کے وقفے سے عینا بھی اس کے پاس پہنچ گئی۔

میرا گھر خالی ہوگیا۔ جب اس کا خط آتا میں یہی جانتا، یہی سامان میرے غریب خانے

میں اکٹھا ہو رہا ہے میں پھولا نہ سماتا۔ اس کے خط گھر بیٹھے لندن کی سیر کرا دیتے ہاں یہ خیال بھی آتا...... زبیر کبھی خط نہیں لکھتا پتہ نہیں وہ اپنے امی ابو کو بھی خط لکھتا ہے؟

میں تنہا ہو گیا تھا۔ سوچا ان کی شادی کی سالگرہ پر لندن چلا جاؤں گا۔ پاس اثاثہ نہ تھا پنشن ہی کتنی تھی۔ جز وقتی کام کر کے کرایہ جوڑنے لگا۔

وہ بڑے خوبصورت دن تھے۔ میں لمبی سیر پر نکل جاتا۔ سوتے جاگتے لندن جانے کے خواب دیکھتا۔ اپنی بیٹی سے ملنے کی چاہ میں، ان دنوں میں نے نشاط کو بھی یاد کرنا کم کر دیا تھا۔ کیسا باؤلا ہو رہا تھا جب خواب تعبیر میں بدلتا نظر آنے لگا تو امڈ امڈ کر خواہش اٹھتی کسی کو تو یہ خوشیوں بھری خبر سناؤں، مگر کس کو؟ بس ایسے ہی جذبوں میں لتھڑا لپٹا ایک روز کمال صاحب اور مسز کمال سے ملنے چلا گیا۔ کمال صاحب خندہ پیشانی سے ملے۔ مسز کمال کی تو تیوری مجھے دیکھتے ہی چڑھ گئی

اپنی بیٹی سے ملنے کی چاہ میں، ان دنوں میں نے نشاط کو بھی یاد کرنا کم کر دیا تھا

تھی، بیٹا ہو یا بیٹی اپنے سے ذرا بھی اونچے خاندان میں نہ دینا چاہیے۔ اگر یہ اقدام ہو جائے تو پھر مسز کمال کے سلوک کو بھگتو، چپ کر کے بھگتو، سو میں بھی چپ سادھ گیا۔ چائے پر بات چلانے کے لیے شیلف پر پڑے ایئر میل لفافوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا: ''تو زبیر میاں باقاعدگی سے خیریت کی اطلاع دیتے ہیں؟'' کمال صاحب نے خوش دلی سے کہا: ''کمال کے خط آتے ہیں لندن کی سیر یہاں بیٹھے کر رہے ہیں!!'' مسز کمال نے کاٹ کھانے والے لہجے میں کہا: ''آپ کی صاحبزادی ہی لکھتی ہیں، زبیر کو تو وقت ہی نہیں۔ اپنی ٹریننگ سے آیا تو پارٹ ٹائم جاب پر نکل گیا۔ آخر یوں جوکھم میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی، شادی بعد میں ہو جاتی!''

مجھے خوشی ہوئی کہ زبیر مجھے نہیں تو ادھر بھی خط نہیں لکھتا...... انسان کتنا تھڑ دلا اور کمینہ ہے۔ عقدہ کھل گیا۔ ساس بہو میں سمدھنوں میں کیوں نوک جھونک ہوتی ہے؟ بیٹے کی ماں بیٹے سے اپنی محبت میں بہو کی یا بہو کے گھر والوں کی شراکت کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اگر وہ کھلے دل کی نہ ہو......!!

واپسی پر میں نے پختہ ارادہ کر لیا ایک لمبی مدت تک پھر اس طرف نہ آؤں گا۔

اب عینا کے خط نہیں آتے۔ زبیر کے خط آتے ہیں۔ جانے وہ اپنے گھر بھی خط لکھتا ہے یا نہیں؟

سامنے دو بند لفافے پڑے تھے اور میں فیصلہ نہیں کر پایا تھا ایک ہفتے کے وقفے سے پوسٹ ہونے والے خط جو یہاں ایک ساتھ ملے ہیں تو میں ان میں سے کون سا خط پہلے کھولوں؟

ایک روز صبح کی سیر کر کے لوٹا، ابھی دروازے سے تھوڑی دور تھا کہ گھر کے اندر ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی سنائی دی۔ تیزی سے بڑھا مگر گھر میں داخل ہوتے ہوتے فون بند ہوگیا۔ ذرا وقفے بعد پھر ٹیلی فون بجا۔

''پپّا!''

میں آواز پہچان گیا۔ میرے خواب و خیال میں نہ تھا کہ اس وقت لندن سے ٹیلی فون آئے گا۔

پپّا! آپ کا سانس پھول رہا ہے؟ آپ ٹھیک تو ہیں؟ عینا بولتی چلی گئی۔

''میں ٹھیک ہوں، گھنٹی سن کر دوڑا آیا۔ سانس پھول گیا، تم کیسی ہو؟''

''آپ کی دعا چاہیے۔''

عینا کے لہجے کی سنگینی میرے اندر تشویش بھر گئی۔ ایک دو ساعتیں چپ چپاتے گزر گئیں۔

''پپّا! ایک بات کہوں؟''

''کہو......!''

''آپ وعدہ کریں...... مانیں گے!''

میں پگھل سا گیا...... ''جلدی کہو۔ خیریت تو ہے؟'' میں نے گھبرا کے پوچھا۔

''آپ فوراً آجائیے۔''

کیا خبر کوئی خوش خبری ہو۔ میں مغالطے میں پڑ گیا۔ تصور میں رجائیت آجائے تو بڑی سہانی اور خوبصورت ہوتی ہے۔ مگر میرے تن بدن میں ساتھ ساتھ خطرے کے کئی الارم جھن جھن کر کے جاگ اٹھے ''بات تو بتاؤ...... زبیر کہاں ہے؟''

''......تو آپ آرہے ہیں!''

''زبیر سے بات کراؤ!''

''یہیں کھڑے ہیں، آپ سے بات نہیں کریں گے۔'' عینا کے لہجے میں شوخی آگئی۔ اس نے خود ہی فیصلہ کر دیا۔ ''تو آرہے ہیں آپ...... بس ایک دو روز میں پہنچ جائیے۔''

عینا بیٹا کی آواز کی موسیقی نے مجھے پھر مغالطوں میں ڈال دیا۔ تشویش کم ہوئی یا بڑھی؟

میں پگھل سا گیا...... ''جلدی کہو۔ خیریت تو ہے؟'' میں نے گھبرا کے پوچھا

کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔

میں ناشتے کے بعد اپنے پچھلے فیصلے کے برعکس مسٹر اور مسز کمال کے یہاں چلا گیا۔

کاش میں نہ جاتا......

ان سے ملے بغیر چلا گیا ہوتا تو لندن پہنچنے تک آرزو اور آزار کے بین بین سے گزارتا تب بھی گھاٹے کا سودا نہیں تھا بے خبری اپنی جگہ بڑی نعمت ہے۔ وہاں جا کر تو میں لُٹ پُٹ ہی گیا۔ ان کی اطلاع تھی، عینا کینسر کے آخری لمحوں سے گزر رہی ہے۔

مسز کمال مجھے دیکھتے ہی اپنے نصیبوں کو کوسنے لگیں کہ ان کا ماتھا تو پہلے ہی ٹھنک گیا تھا! میری تو دنیا ہی اندھیر ہوگئی۔ اپنے تئیں سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ بھلی عورت کو اتنا خیال نہ آیا، مجھ پر کیا بیت رہی ہوگی۔ کینسر نے دوسری بار میرے گھر پر ڈاکہ ڈالا تھا!!''

میں ریزہ ریزہ ہو کر گھر پلٹا۔ جانے کیسے پہنچا۔ اسی وقت ٹیلی فون پر اولیں حاصل نشست محفوظ کرائی۔ بیچ میں پانچ دن تھے۔ گھر کا سامان برائے فروخت لگا دیا۔ کمال صاحب ہمدردی سے پیش آئے۔ انھوں نے رقم پیش کرنی چاہی، میں نے انکار کر دیا۔ انھوں نے مشورہ دیا مکان فروخت نہ کیجیے گا۔ آنے والے کل کی گود میں کون جانے کیا ہے؟ مخلصانہ مشورہ میں مان گیا۔

اپنے لختِ جگر کو ایک نظر دیکھنے کی آرزو، اتنی شدت سے کب کسی کو ملی ہوگی۔ جہاز نہیں، میں اڑ رہا تھا۔ دورانِ سفر نہ کچھ دیکھا نہ سنا۔ یہ میری زندگی کا سیاہ ترین سفر تھا۔ جب لندن پہنچا تو مجھے زبیر لینے آیا ہوا تھا۔ عینا ہسپتال میں تھی......!

...... ہسپتال میں عینا کو، عینا کی پرچھائیں دیکھ کر میں یاسیت میں گہرا گڑ گیا۔ نمعلوم کیوں...... گر کر ڈھیر کیوں نہ ہو گیا؟

عینا سو رہی تھی۔ میں پاس بیٹھ گیا۔ زبیر نے بتایا چھ ہفتے سے یہی ہو رہا ہے۔ گھر پھر ہسپتال پھر گھر ہسپتال۔ مرض کی تشخیص ہوئی تو حد سے گزر چکا تھا۔

بیتے دن ایک ایک کر کے نگاہوں میں پھرتے پھرتے گئے۔ شاید سفر کی تکان تھی، میں اونگھ گیا۔ آنکھ کھلی تو زبیر اپنے کام پر جا کر آ گیا تھا۔ دونو میاں بیوی دھیرے دھیرے بول رہے تھے۔ عینا میں تازہ آئی توانائی مجھے محسوس ہوئی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پہ رونق آ گئی تھی۔

کچھ دنوں بعد عینا گھر آ گئی۔ اب وہ بہتر تھی۔

یوں روزانہ ''ہوم ہیلپ'' بھی آیا کرتی مگر عینا گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں مصروف رہتی۔ فرصت ملتی، میرے پاس آ بیٹھتی۔ بہت باتیں کرنے لگی تھی۔ کہتی اس چھواں بیماری نے

میں ناشتے کے بعد اپنے پچھلے فیصلے کے برعکس مسٹر اور مسز کمال کے یہاں چلا گیا

ظاہر ہوتے ہی اتنا وقت کھالیا کتنے ہی کام رہ گئے۔ کالج کے کئی اسائنمنٹ دھرے ہیں۔ شادی کی سالگرہ میں صرف ایک ماہ گیارہ دن رہ گئے ہیں۔ پپّا! یہ سالگرہ یوں منائیں گے کہ دنیا یاد کرے گی۔ پھر آپ بھی تو آگئے ہیں۔ میں جانتی تھی آپ آئیں گے۔ بچی پپّا! سالگرہ کی تقریب میں جو شامل ہوگا، شریک ہوگا سدا یاد کرتا رہے گا۔

وہ میری زندگی کے بڑے نایاب، بڑے قیمتی دن تھے۔ ہر دم دعا مانگا کرتا میری بچی کو اپنی شادی کی سالگرہ کا دن دیکھنا نصیب ہو۔

آج لگتا ہے وہ میری زندگی کے واقعی ناقابل فراموش دن تھے۔ دن میں میں عینا کو ایک پل کو بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔ رات میں مقامی کونسل سے لیا ترجمہ کا کام کرتا اور دعائیں مانگتا۔ میں نے آنکھوں سے عینا اور زبیر کی چاہت کا رچاؤ دیکھ لیا۔ سر پر کھڑی گھڑی سے بے نیاز وہ عینا کی چاہت میں جیتا تھا اور عینا اس کے لیے زندہ رہنا چاہتی تھی۔ میری تمنا تھی میری زندگی بھی ان دونوں کو لگ جائے!

وہ میری زندگی کے بڑے نایاب، بڑے قیمتی دن تھے

وہ یادگار تقریب تھی۔ بڑی شاندار شادی کی سالگرہ۔ سبھی دکھ بھول گئے۔ ساری خوشیاں آسمانوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر وہاں موجود ہر کسی کی گود میں آبراجی تھیں۔ لیکن وہی رات میری بچی کی، اپنے گھر میں آخری رات تھی......

دوسرے روز دوپہر میں عینا کی طبیعت بگڑ گئی۔ فوراً ہسپتال لے جانا پڑا جہاں سات روز کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے ہر روگ سے نجات پاگئی۔ ہاں کچھ لوگ جوانی میں مر جاتے ہیں۔

میں غم کا مارا اپنی آنکھوں پر ہاتھ کی انگلیوں کی پوریں رکھ کر ان کو نچوڑنے کی کوشش کرتا مگر وہ آنکھیں تو ضبط غم کی ایسی جھیلیں بن گئی تھیں جو کناروں سے اندر تک سوکھ چکی ہوتی ہیں۔

زبیر کی حالت اور بھی ابتر تھی۔ وہ شروع میں میرے سینے سے لگ کر رویا پھر چھپ چھپ کر روتا۔ میرا جو غم تھا کم نہ تھا، مجھے اس کا بھی غم تھا۔ ہم دونوں ہم غم تھے۔

اور مجھے لندن میں اپنی وہ آخری شب بھی یاد آتی ہے۔ میں سو رہا تھا، آدھی رات گزری ہوگی۔ بلا کا سناٹا تھا۔ ٹریفک بھی تھم چکا تھا۔ اچانک سوتے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لگا میری پشت پر نشاط اور سامنے عینا بیٹھی ہے میرا دل بھاری ہے اور ذہن خالی۔ پھر صبح تک جاگتا رہا یہ احساس چھایا رہا۔ پیچھے نشاط بیٹھی ہے میرے سامنے عینا بیٹھی ہے۔ نہ کوئی بولتا ہے نہ کوئی بے چین ہے جیسے ہم سب ہیں، سو ہیں کہنے، سننے کو کچھ نہیں تھا۔

پھر لندن میں ٹھہرنے کی سکت سے کلی طور پر محروم ہوگیا۔

اگلے دو تین روز میں میں نے کام نمٹائے۔ زبیر کو بتایا میں واپس جا رہا ہوں۔ میری بات اسے گھونسے کی طرح لگی۔ گم سم ہو گیا۔ جب وہ اپنے آپ میں واپس آیا تو میں نے ساتوں جہاں کا خلوص اور پیار اکٹھا کر کے کہا۔ تمھارے اور عینا کے بیچ جو پیار تھا، میں یہ کہہ کر مجھے اپنی بیوی سے اتنا ہی پیار تھا، تم دونوں کی محبت کی توہین نہیں کروں گا۔ پر اتنا ضرور کہوں گا کہ دل سے مجبور ہو کر میں نے ساری زندگی اپنا سارا جیون مرنے والی کی یاد میں تنہا گزار دیا، مگر تمھیں کہوں گا کہ زندگی کے ہر موڑ پر ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اکیلے زندگی دوبھر ہوتی ہے۔ جب اچھی لڑکی ملے، شادی کر لینا مجھے بلواؤ گے، میں آؤں گا۔ دیکھنا عینا بھی مبارک باد دینے آئے گی۔ اس کی شرکت تم محسوس کرو گے۔

میرا جو غم تھا کم نہ تھا، مجھے اس کا بھی غم تھا۔ ہم دونوں ہم غم تھے

زبیر نے پوری بات سن کر میری طرف دیکھا، وہ کچھ بھی نہیں بولا، میرے کانوں نے سنا، اس نے مٹھی بھر غم کا گھونٹ بھرا۔ اس کی ڈبڈبائی آنکھوں سے ایک ایک قطرہ ڈھلکا اور بڑی جھیلیں خشک ہو گئیں......

میں نے وارفتگی سے زبیر کو گلے لگا لیا۔ بالکل اسی طرح، جب عینا کو رخصت کرتے وقت دونوں کو فرط جذبات سے بازوؤں میں بھر کر اپنے دل کی دھڑکن دے دی تھی!!

میں نے کینسر انسٹیٹیوٹ کو لکھا ہے۔ اس مرض کے خلاف لڑنے والوں میں میرا بھی نام لکھ لیں۔ میں نے جیب میں ڈونر کارڈ رکھ لیا ہے۔ شاید میرے نصیب میں ایسا کوئی حادثہ آ ہی جائے جب میں کسی کے لیے مداوہ بن کر پھر سے جی اٹھوں!!

اب لندن سے مجھے عینا کے خط نہیں آئیں گے، زبیر کے آتے ہیں۔ وہ باقاعدگی سے خط لکھنے لگا ہے، وہ سمجھتا ہے میرا غم بٹا رہا ہے میں جانتا ہوں وہ اپنا دل ہلکا کر رہا ہے۔ اس کے خط کئی کئی صفحات پر پھیلے ہوتے ہیں میں بار بار پڑھتا ہوں اور پڑھ کر جواب میں یہی بات پوچھتا ہوں...... "مجھے کب مدعو کرو گے؟"

آج زبیر کے دو خط ایک ساتھ ملے ہیں، ایک لفافہ بھاری ہے، دوسرا ہلکا، میں فیصلہ نہیں کر پا رہا پہلے کون سا لفافہ کھولوں؟

●●●●●●●●●●●●●●●●

ترنم ریاض (نئی دہلی)

ٹیڈی بیئر

سیاہ چشمے کی بائیں جانب کے کھلے حصے میں سے وہ اسے چپکے چپکے دیکھ رہی تھی' جو خود میں گم گا رہا تھا اور گٹار بھی بجا رہا تھا۔ گاڑی کے بلکوروں کے ساتھ اس کے ماتھے پر آگے کو لا کر پیچھے کی طرف سجائے گئے بال بھی جھول جاتے۔ اس نے قلمیں بڑھا رکھی تھیں جو کم عمری کے سبب گو زیادہ گھنی نہ تھیں مگر کسی نہ کسی طرح اس کے پسندیدہ اور بیسویں صدی کے سب سے بڑے مغربی گلوکار کے بالوں کے اسٹائل سے ملتی تھیں کہ اسٹیج پر ایک کردار کی ادائیگی کے لیے اسے بال اس کی طرح رکھنا تھے۔ شہر کے اسکولوں میں وہ سب سے خوش گلو فنکار چنا گیا تھا۔

مقابلے کی تیاریوں کے دوران اس نے ایک دن ماں کو اس گانے کی وجہ تسمیہ بتائی تھی کہ ایک ہوٹل میں کسی نامعلوم نوجوان نے ایک پرزے پر ایک سطر لکھ چھوڑی تھی' میں ایک تنہا راستے کا مسافر ہوں۔ کسی نے اس حادثے سے متاثر ہو کر یہ گانا لکھا تھا۔

''دیکھیے ناماما...... کس طرح ایک نامعلوم نوجوان اتنے بڑے Master Piece کی بنیاد بن گیا۔ کیا ہوا ہوگا اسے...... میں کبھی کبھی سوچتا ہوں...... کیوں کی ہوگی اس نے خودکشی...... وہ کیوں تھا اکیلا...... کیا اسے...... کوئی سمجھتا نہیں ہوگا...... یا پھر......''

راحیل کی لمبی لمبی انگلیاں گٹار کے تاروں پر ٹھہر گئی تھیں۔

''نہیں بیٹا...... کبھی کبھی انسان کسی شدید جذباتی دباؤ کے زیر اثر سوچ نہیں پاتا اچھی طرح...... اور اس کمزور پل میں اس طرح کی حرکت...... کر گزرتا ہے......''

نائلہ کا ممتا بھرا دل پل بھر کو کانپ سا گیا تھا۔

''تو وہ لمحہ...... انسان باہمت ہو تو...... ٹال سکتا ہے...... اور اگر ٹل جائے...... تو ایسا حادثہ کبھی نہ ہو......''

تمہیں تو میں سمجھتی ہوں میرے بچے...... کوئی سمجھے نہ سمجھے...... میں تو تمہارے ساتھ ہوں......

نائلہ کا ممتا بھرا دل پل بھر کو کانپ سا گیا تھا۔

گاڑی میں بیٹھی نائلہ چپ رہی اور آہستہ سے گردن بائیں جانب موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ راحیل نے بے رنگ چشمہ پہن رکھا تھا۔ اس میں سے اس کی بند آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ چہرے کے تاثرات میں گردوپیش سے بے خبری کا عالم تھا...... مگر دونوں ہاتھوں کی محتاط انگلیاں نہایت ماہرانہ انداز میں گٹار کے سخت تاروں کو کچھ ایسی نرمی سے چھو رہی تھیں کہ سر بادلوں کی طرح فضاء میں تیر رہے تھے۔ اس نے بیحد سریلا نغمہ چھیڑ رکھا تھا۔ اسے پریکٹس کے لیے اپنے گروپ کے باقی ساتھیوں سے ملنے ایک دوست کے ہاں جانا تھا۔ نائلہ کو بھی راستے میں ایک جگہ اترنا تھا۔ وہ اس کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھی اس کے گیتوں سے محظوظ ہو رہی تھی۔ لمحے بھر بعد اس نے ایک تیز دھن والا گانا شروع کیا۔

وہ بالکل مغربی انداز میں کبھی بے حد اونچے سر میں تان کھینچتا اور کبھی ٹھوڑی حلق سے لگا کر بھاری سی غراہٹ نما آواز میں گا کر منہ بڑا سا کھول دیتا اور کبھی ایک دم دہانہ چوڑا کر کے تمام دانتوں کو نمایاں کرتا ہوا زوردار آواز میں نعرہ سا لگا کر کچھ پل خاموش ہو کر دائیں بائیں دیکھتا اور پھر یکلخت دوبارہ دھیمے سر سے شروع کر کے اونچے سر تک جا پہنچتا۔

اس عمل کا مشاہدہ نائلہ کے لیے نہایت دلچسپ عمل تھا۔ جب وہ چہرے کے سارے پٹھے تان کر دانتوں کی نمائش کر کے ماتھے پر بہت سے آڑے بل ڈال کر کوئی سر ادا کرتا تو اسے بے تحاشا ہنسی آ جاتی جسے وہ کمال ضبط سے چھپا لیتی۔

Put a chain around my neck

And lead me everywhere

So let me be your teddy bear

کیا گا رہا ہے...... میرا ٹیڈی بیئر......

ابھی کل تک گول مٹول سا ٹیڈی بیئر جیسا تھا

نائلہ کا دل کرتا اس سے کہے...... ابھی کل تک گول مٹول سا ٹیڈی بیئر جیسا تھا' وہ سوچتی...... دبلا پتلا' لمبا ہو گیا...... ساری جان گانے کی ادائیگی میں لگانے سے اس کی گردن پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگتیں۔ حالانکہ گاڑی کے اندر ٹھنڈک تھی۔ نائلہ کا جی چاہتا کہ پرس میں سے رومال نکال کر اس کے چہرے اور گلے پر سے پسینہ پونچھ لے۔ اس سے پہلے کہ نائلہ کی منزل آ جائے' سرخ ٹی شرٹ میں چھپے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اس کا لمس اپنی ہتھیلی میں محفوظ کر لے۔ مگر اس کے پاس ایسا کوئی بہانہ نہ تھا

کہ اسے چھو لیتی۔

کہ وہ ناراض تھا اس سے...... شاید...... مگر اتنے دنوں...... کیوں...... آخر۔

کیا وہ خود بھی اس جیسی تھی......

نائلہ سوچنے لگتی۔ راحیل کی ثابت قدمی پر اسے خوشی ہوتی۔

نائلہ کو تصویریں بنانے کا شوق تھا۔

''اف اف...... گناہ...... گناہ کبیرہ......'' اماں سر پر آنچل درست کرتی جانے کب آ کر اس کے عقب میں کھڑی ہو جاتیں۔

''ایک تو پڑھائی نہیں کرتی...... دوسرا...... یہ...... شکلیں...... اللہ...... یہ اولاد...... جہنم رسید کروائے گی......'' چوری پکڑے جانے سے وہ شرمندہ سی ہو کر رہ جاتی۔

''اپنی باجی کو دیکھو...... اول آتی ہے اکثر ہی...... ورنہ دوئم تو ضرور ہی......اور تم...... پڑھو گی نہیں تو فیل ہو جاؤ گی...... میں نے ہی بگاڑا ہے شاید تمہیں......''

''اماں...... یہ تو...... ڈرائنگ ہے...... اسکول میں......''

''جھوٹ تو نہیں بولتی......؟ تمہارے ابا سچ کہتے ہیں...... کہ میرا ہی قصور ہے...... تمہاری ہر بات مان لیتی ہوں......''

''جھوٹ ہی تو بولا جا رہا ہے...... یقیناً......'' ابا کی آواز پتھر کی طرح کان کے پردے پر پڑتی ...... نائلہ پتھر سی دیکھا کرتی۔

> ''یہ شریف لڑکیوں کا چلن نہیں ہے......''

''کہاں لے جائیں گی یہ لکیریں...... یہ تصویریں تم کو......؟''

ابا جانے کیسے اسی وقت گھر میں داخل ہوتے۔

''یہ شریف لڑکیوں کا چلن نہیں ہے......'' وہ چہرہ اس کی طرف اور نظریں دوسری جانب کر کے کہتے اور چلے جاتے اور اماں پاؤں پٹختی ہوئی ان کے پیچھے۔ ایسے میں کتنا غصہ آتا تھا...... اسے دونوں پر۔ جیومیٹری کی کاپی کے سادہ ورق پر بنے رنگ برنگے چہرے پر اس کے دو آنسو ٹپ سے گرتے۔ پانی کا رنگ (Water Colour) پانی میں گھل کر بے رنگ ہونے لگتا۔ رونے کی خواہش گلے کے اندر پھندا سا ڈال دیتی۔

اتنی محنت سے...... میں نے...... خراب ہو گئی تصویر...... یہ ابا...... یہ ابا...... آخر یہیں ہی کیوں......

سب کچھ تو ہوتا ہے اماں کے پاس...... کھانا...... جیب خرچ...... کتابوں کے پیسے...... کاپیوں کے......
کاپیوں کے پیسے...... اتنے سارے...... پھر ابا بھلا کیوں...... رعب جمانے کے لیے...... اللہ کرے......
اللہ کرے...... اللہ کرے...... کہ......

آرٹ فائل مہینے میں دوبار باقاعدگی کے ساتھ گم ہو جایا کرتی......

اللہ نہ کرے...... ایسا سوچتا ہے کوئی اپنے ابا کے لیے......

جانے یہ کس کی آواز تھی...... آواز تھی بھی یا......

تصویریں بنانا جاری رہا...... آرٹ فائل مہینے میں دوبار باقاعدگی کے ساتھ گم ہو جایا کرتی......
رنگ سکول کے ساتھی استعمال کر لیتے تو بے چاری نائلہ کیا کرتی...... جواز معقول ہوا کرتا...... اور امی کی تھوڑی سی ڈانٹ اور تنبیہہ کے عوض ایک نئی آرٹ فائل...... سودا مہنگا نہیں تھا۔ بلکہ کبھی کبھی تو کس قدر فائدہ مند......

پیلے رنگ کے پتلے ٹین کے مستطیل ڈبے میں بارہ خانے مختلف رنگوں کے...... اور ساتھ میں نرم و نازک سنہری بالوں والا موقلم...... تصور میں ایسی ہزار شبیہات...... کمرے کی تنہائی...... اب جنت میں بھی کیا ہوتا ہوگا۔

اس کے سارے رنگ، راز اور تصور طشت از بام ہو گئے۔

زندگی جنت سے بھی حسین تھی۔ مگر دنیا کی ہر جنت کی طرح عارضی...... کہ اس کے سارے رنگ، راز اور تصور طشت از بام ہو گئے۔ اسے آج بھی کتنا دکھ ہوتا ہے یاد کر کے......

گاڑی رک گئی تھی۔ نائلہ نے ٹھنڈی آہ بھری اور ونڈو کے باہر دیکھنے لگی۔ سرخ روشنی پر لکھے Relax کے دائرے میں باجی کا چہرہ نظر آیا...... اس کا دل جیسے کہ خود کلامی کرنے لگا ہفتے کا دن تھا۔ اسکول میں آدھے دن کے بعد چھٹی ہوا کرتی تھی۔

باجی دو دن سے کہہ رہی تھیں کہ ان کو ہفتے اور اتوار کی دو دن کی چھٹی ہے اور وہ اماں کے ساتھ مل کر میرا کمرا صاف کروائیں گی۔

''میرا کمرہ صاف ہے بالکل۔'' میں نے باجی کی آنکھوں میں جانے کون سی چمک سے نظریں چرا کر کہا تھا۔

''تم کیا جانو...... اپنے پاؤں کے تلوے دیکھو کتنے میلے ہیں...... میں جانتی ہوں کیا صحیح ہے......'' انہوں نے میں پر زور دیا تھا۔ آخر کو مجھ سے پانچ' چھ برس بڑی تھیں۔

''رہنے دیجیے نا باجی...... اگلے ہفتے کرلیں گے...... یا اتوار کو میری بھی چھٹی ہوگی نا...... تو......''

''مجھے اپنے کام نہیں ہیں کیا اتوار کو......؟'' باجی گردن مٹکاتیں۔

''ٹھیک کہتی ہیں باجی...... تم زیادہ دخل مت دو۔'' اماں کو جب باجی پر زیادہ پیار آتا تو اسے باجی بلایا کرتی تھیں...... اماں کی یہ بات مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی تھی۔

''اچھا چلو...... اتوار کو ہی کرلیں گے......'' انھوں نے نہایت حاکمانہ انداز میں جیسے کہ رحم کھا کر کہا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیں......

مگر ایسا نہیں ہوا...... باجی...... دھوکے باز باجی......

میں کسی ٹکٹ یافتہ مجرم کی طرح بیٹھک کے دروازے سے لگی تھی۔ تھانے کی دیواروں پر چسپاں جرائم پیشہ افراد کی تصویروں کی طرح میز پر میری چار آرٹ فائلوں کے موٹے موٹے ورق بکھرے تھے۔ بے شمار چہرے لیے ہوئے...... کہیں بڑے...... کہیں چھوٹے...... کوئی بزرگ...... کوئی بچہ۔ نرم تاثرات لیے ہوئے' دودھ پہنچانے والے حاجی صاحب گوالے کا چہرہ...... میری حساب کی سنگدل ٹیچر کا ناراض چہرہ...... بڑے دانتوں والے چوکیدار بابا کا چہرہ...... روتی ہوئی چھوٹی سی لڑکی کا بسورتا ہوا...... کوئی مسکراتا...... کوئی غصہ ور...... کوئی گنجا...... کہیں لمبے لمبے بالوں والی عورت کا...... گورا...... کالا...... ہر چہرہ مجھے اپنے چہرے کی طرح عزیز تھا۔

''یہ سب کیا ہے......؟'' ابا کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔ انہوں نے میز پر اپنا بڑا بازو ایک جھٹکے سے جھاڑو کی طرح پھیر دیا۔ لمبے سے فراک کے اندر میرے گھٹنے کانپ کانپ کر ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراتے رہے۔

چہرے لہراتے لڑھکتے فرش پر بکھر گئے اور بعد میں باجی کے قبضے میں چلے گئے۔

اماں نے مجھ سے بات کرنا ترک کر دیا۔

ماسٹر جی کے پیلے دانتوں پر ہر وقت رالیں جمع رہتیں

حساب کے پرچوں میں بمشکل تمام پاس ہونے کی بجائے...... میں فیل ہوگئی......اور تعجب کی بات یہ کہ باجی کو پہلے ہی پتہ تھا کہ جو سوال وہ مجھے کروا رہی تھیں امتحان میں ویسے سوالات غلط کر کے میں فیل ہو جاؤں گی۔

مجھے دوبارہ باجی کی تحویل میں دینے سے پہلے ابا نے ایک نہایت تجربہ کار اور سینئر قسم کے حساب داں استاد کا انتظام کیا کہ باجی کے خود امتحان سر پر تھے۔

حساب کے استاد گھر آنے لگے۔

ماسٹر جی کے پیلے دانتوں پر ہر وقت رالیں جمع رہتیں۔ منہ سے ریشم کے کچھوں ایسے نئے نویلے چوزوں کے درمیان جوں کے توں پڑے رہ جانے والے انڈے کی سی بد بو آتی۔ جنہیں باجی مجھے سنگھانے کے بعد پیٹ پکڑ کر دوہری ہو کے ہنسا کرتی تھیں اور جیسے چوزوں کے استقبال کے لیے ٹوکری کے گرد کوٹھری میں کھڑی میں اماں کے چہرے پر لاتعلق سی مسکراہٹ دیکھ کر بجھ جایا کرتی۔ اس سے کہیں زیادہ تکلیف مجھے ماسٹر جی کے پاس قیامت جیسا ایک گھنٹہ گزارنے میں ہوتی۔

اکثر سر پر سے شملے والا صافہ اتار کر ماسٹر جی دونوں ہاتھوں کے میلے ناخنوں سے اپنا گنجا سر کھجاتے ہوئے منہ کھول کھول کر جمائیاں لیتے اور الجبراء کے زبانی یاد فارمولے دوہراتے ہوئے آنکھیں بند کر کے سمجھایا کرتے۔

جیسے تیسے مڈل اسکول ہوا۔

باجی نے گھر میں مشورہ دیا کہ اگر آرٹس پڑھوں گی تو ڈرائنگ تو کرنا ہی ہوگی......اور سارا وقت میں ڈرائنگ کرتی رہوں گی تو پڑھوں گی کہاں......اس لیے نویں درجے میں میڈیکل پڑھایا جائے اور یہ کہ وہ مجھے خود گائیڈ کریں گی......کہ آخر ان کی میڈیکل کی پڑھائی کس دن کام آئے گی......کہ......کہ روز Good یا Excellent ملتا تھا انہیں پریکٹیکل کاپی پر۔

گھر میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ جس دن باجی نے میری رف کاپی پر ماسٹر جی کا جمائی لیتا سر کھجاتے ہاتھ والا چہرہ دیکھا تھا۔ اسی دن یہ معاہدہ ہوا تھا کہ اگر میں ان کی سائنس کی ڈائیگرامز بنایا کروں تو وہ کسی سے نہیں کہیں گی کہ میں نے چہرے بنانے میں دوبارہ وقت ضائع کرنا شروع کر دیا ہے۔

''یہ تو...... بالکل......لگتا ہے ابھی ہاتھ نیچے کر کے آنکھیں کھولیں گے اور سوال چیک کریں گے......تمہاری کاپی پر......''

باجی کئی لمحوں تک تصویر کو دیکھتی رہی تھیں......

''اب تو تم بالکل اصلی صورت جیسا......خیر......یہ کوئی اچھی بات تو ہے نہیں......اماں تو تمہیں کوئی کام تک نہیں بتاتیں کہ وقت نہ ضائع ہو......ویسے......میری ڈائیگرامز میں ایسا کوئی وقت نہیں لگے

وہ میری استاد مقرر ہوئیں تو ان کا مجھے بلاوجہ پیٹنا بھی جائز ہو گیا....

گا......اور پھر میں ان سے کچھ......کہوں گی بھی نہیں۔"

بہر حال......

میری ہمدرد باجی ...... میں Maths میں Physics,Nil کے Problems کیسے solve کروں گی۔

مجھے سائنس سے ذرا دلچسپی نہیں...... میں کیا پڑھوں گی۔

مگر باجی جو تھیں پڑھانے والی۔

وہ میری استاد مقرر ہوئیں تو ان کا مجھے بلاوجہ پیٹنا بھی جائز ہو گیا......

چہرے جانے کہاں چلے گئے......اماں کا چہرہ ناراض......ابا کا چہرہ مجھے دیکھتے ہی رنگ بدلتا......

باجی کا چہرہ......فاتح سے تاثرات لیے......اور میرا چہرہ...... آئینے میں نظر ہی نہ آتا......

تمہیں تمہاری شخصیت مبارک ہو......

نائلہ نے پہلو میں بیٹھے راحیل کو کنکھیوں سے دیکھا۔

موسیقی میں گم گردوپیش سے بے خبر یہ چہرہ مبارک ہو......

اس نے ڈرائیونگ سیٹ کے سامنے اوپر کی جانب لگے چھوٹے سے آئینے میں راحیل کی بند آنکھیں دیکھ کر دل ہی دل میں کہا۔

نواں درجہ کسی طرح ہو ہی گیا تھا۔

نائلہ سوچنے لگی......Physiology کے Diagrams نے کہانی کی طرح مجھے انسانی نظام کی Description میں بہت مدد دی۔ ریاضی اور فزکس میں فیل...... باقی تمام میں اول...... یہ تھا دسویں جماعت کے ششماہی امتحان کا نتیجہ اور بورڈ کے امتحانات میں شامل ہونے کے لیے ان سب میں پاس ہونا ضروری تھا۔ بڑی مشکل سے ان پرچوں میں دوبارہ امتحان دینے کی اجازت ملی اور پاس کر لیے مگر بورڈز میں اگر ایک بھی مضمون میں فیل ہوں تو پورے امتحان میں فیل ہونا لازمی تھا اور پھر سال ضائع ہو جانا طے تھا۔

اور میں تین سال لگاتار پرائیویٹ امتحان دیتی اور فیل ہوتی گئی۔

نئی نئی لیکچرر ہوئی باجی کو جب لڑکے کی اماں اور خالہ دیکھنے آئیں تو چھوٹے صاحبزادے کے لیے جو پڑھائی چھوڑ کر بھائی کی دکان میں خاصا کام سنبھال لیتے تھے، مجھے پر غور ہوا۔

باجی کے سسرال جانے کے بعد کی آزادی کے تصور میں مگن اور مسرور میں اماں کا پیازی رنگ کا

کامدانی دوپٹہ اوڑھے خشک میوے کی طشتری لیے اندر داخل ہوئی تو دونوں بزرگ خواتین نے مجھے باری باری چونک کر دیکھا تھا۔

دونوں بزرگ خواتین نے مجھے باری باری چونک کر دیکھا تھا۔

فیصلہ یہ ہوا کہ ایک کند ذہن لڑکی کو پڑھانے کی کوشش میں مزید وقت ضائع کرنا حماقت ہوگا۔ رشتے کو قدرت کی طرف سے اشارہ سمجھ کر قبول کرلیا جائے۔

سارے چہرے روٹھ گئے مجھ سے......

زندگی کے افق پر ایک نیا چہرہ ابھرا۔ اس کا گھر سنبھالنے میں سارا آرٹ خوب کام آیا اور پھر نکھر نکلی میں...... کہ جیٹھ جی کی پروفیسر بیوی کی غیر موجودگی میں مجھے گھر کا ہر کام خوش اسلوبی سے نبھانے کی ہدایت تھی اور وہ کبھی کبھی بہ آواز بلند خدا کا شکر کرتیں کہ کم از کم یہ ذرا سا سلیقہ تو پیدا ہوا مجھ میں...... جو میں نے انھی کی صحبت میں سیکھا تھا...... کیونکہ پڑھنے میں مصروف و مشغول ہونے کے باعث انھیں مجھے ہی کام کاج سمجھانا پڑا تھا مائیکہ میں......

اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔ کیونکہ جب میری ہی دلچسپی تعلیم میں نہیں تھی تو پھر انہوں نے مجھے گھر سنبھالنے کے لائق بنانے میں محنت کی۔

رات کے کھانے کی میز پر پھولی ہوئی گرم گرم چتکبری روٹیاں میرے ہاتھ سے لیتے وقت ان سب باتوں کا انہوں نے کئی دفعہ کھلے دل سے اعتراف کیا تھا۔

کھلے دل والی باجی......

راحیل نے دوبارہ وہی سریلا نغمہ چھیڑا تو نائلہ پھولی ہوئی روٹی چھوڑ کر گاڑی کی پچھلی نشست پر لوٹ آئی۔

Since my baby left me

I found out a place to dwell

Its, down at the end of a lonely street

Of heart break hotel

بالکل ایلوس پریسلے کی طرح سر ہلا رہا تھا۔ دھن بھی دل میں اترے جاتی تھی...... آج راحیل کی آواز میں نائلہ نے درد محسوس کیا تھا۔ گانے کا اس کے بعد کا حصہ نائلہ کو اور اداس کرے گا...... وہ

جانتی تھی اور شاید راحیل بھی جانتا تھا۔ اس نے آواز ذرا دھیمی کر لی۔ یہ گانا اسے بہت پسند تھا اور اسے اسٹیج پر بھی گاتا تھا۔ اسے گاتے وقت اداس ہو جانا بھی اچھا لگتا تھا۔

You make me so lonely baby

I get so lonely

You make me so lonely

I could die

نائلہ رنجیدہ نظر آ رہی تھی......

خدا نہ کرے......میرے فنکار......آخری لائن سن کر اس نے دل میں کہا۔

میں ماں ہوں...... کہ دشمن......
شرم نہیں آئی مجھے۔

آج بہت اداس ہے راحیل......وہ سوچنے لگی۔

اس کا باپ اس سے بہت خفا ہے اور باپ کی ہاں میں ہاں اگر نہ ملائی جائے تو بچے خراب ہو جاتے ہیں۔ باجی نے کہا۔

میں نے اسے گٹار کیوں لے کر دی۔

میں نے اسے میوزک اسکول کیوں بھیجا۔

ہر شام بورن ویٹا والا دودھ ہاتھ میں لیے اس کے کمرے کے دروازے کے قریب کھڑے ہو کے اس کا گٹار سن سن کر اس کی حوصلہ افزائی کیوں کی۔

میں ماں ہوں......کہ دشمن......شرم نہیں آئی مجھے۔

اپنا انجام بھول گئی......میں......

باجی راحیل کے نویں جماعت کے ششماہی امتحان میں ریاضی کے 100 میں 34 نمبر دیکھ کر اونچی آواز میں سمجھا رہی تھیں۔ آوازیں سن کر گھر کے دوسرے لوگ بھی آ گئے تو مارے ہمدردی کے باجی کی آواز گلوگیر ہو گئی تھی۔

"O shut up." وہ چیخا تھا۔ یہ ماما کا زمانہ نہیں ہے......شاید اس کی نظروں میں میرا اس کی کاپی کے کور پر پنسل سے کھنچا ہوا اس کا گٹار بجاتا اسکیچ گھوم گیا تھا۔ جو دو سال سے اس نے اپنی میز کی

دراز میں سنبھال رکھا تھا۔

"Just do'nt interfere in my life" وہ اسکول سے ملا رپورٹ کارڈ لے کر کمرے سے جانے لگا تو اس کے باپ نے اس کے چہرے پر ایک زور کا تھپڑ مارا۔

''بڑوں سے زبان لڑاتے ہو؟'' میں نے فوراً کہا۔

اس نے میری طرف زخمی نظروں سے دیکھا...... شفاف رخسار پر پانچ سرخ لکیریں چھالوں کی طرح ابھر آئی تھیں۔

کئی دن مجھ سے نظر ملا کر بات نہیں کی تھی۔ میں نے سمجھانا چاہا تو کمرے میں گھس کر دروازہ پٹخ کر بند کر دیا۔

نائلہ نے تصور میں اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

اسکول کی طرف سے جب والدین کے اجازت نامے پر دستخط کی باری آئی تو...... میں نے چپکے سے دستخط کر دیئے اور کسی کو پتہ نہ چلا۔

اب میرے ٹیڈی بیئر کو مجھ سے ناراض نہیں رہنا چاہیے۔

نائلہ سوچنے لگی۔

آج وہ اسی ریہرسل کے لیے جا رہا تھا۔ اپنے پسندیدہ گلوکار کے گائے سب سے پسندیدہ گانے کی ریہرسل...... وہ اس کے گانے گاتے ہوئے اکثر سوچوں میں گم ہو جاتا۔

''قابل لوگ زیادہ دیر جیتے ہی نہیں...... کیوں مام؟''

ایک دن جب اس نے نائلہ کو ایلوس پریسلے کے کئی گانے گا کر اور بجا کر سنائے تھے' وہ ایسے ہی اداس تھا۔

جب اسٹیج پر تھرکتا تو دلوں کی دھڑکن اس کی تال پر تھرکتی

ایلوس پریسلے نوجوانی میں ہی انتقال کر گیا تھا۔ بے حد خوش شکل نوجوان تھا وہ...... بیضوی چہرہ...... اونچا قد...... تندرست' چست بدن' سرخ و سفید رنگت' بالوں کا رنگ سیاہ کرتا تھا وہ اور پوشاک اپنے وضع کردہ انداز کی جاپانی شہزادوں کی بڑے کالروں والی جیسی کچھ۔ جس سے شانے اور وجیہہ معلوم ہوتے۔ چمکیلے رنگوں والی۔ بہت سے رنگ برنگے بٹنوں والی۔ مختلف ڈیزائن کے ہیرے جڑی کمر بند والی۔ گاتے ہوئے جب اسٹیج پر تھرکتا تو دلوں کی دھڑکن اس کی تال پر تھرکتی۔ یہ باتیں نائلہ کو

راحیل نے بتائیں تھیں۔

نائلہ یاد کر رہی تھی کہ ایک بار اس نے کسی شو کے دوران اپنا پسینہ خشک کر کے رومال تماشائیوں کی طرف اچھالا تھا تو لوگوں نے اس رومال کو حاصل کرنے کے لیے کسی نایاب نعمت کی طرح انگنت ہاتھ بڑھائے تھے۔

ٹیلی ویژن پر دیکھا تھا نائلہ نے۔

''موت تو اللہ کے اختیار میں ہے بیٹا..... ایسا تو نہیں ہے..... بہت سے قابل لوگ برسوں جیتے ہیں..... بہت سے عام لوگ کم جیتے ہیں یا اس کا الٹ بھی ہوتا ہے.....''

''مگر مما..... میں کیوں اس شدت سے محسوس کرتا ہوں..... اس کے بارے میں اتنا زیادہ..... میں دیکھیے..... اس کی موت کے تیس سال بعد پیدا ہوا..... پھر بھی..... King تھا وہ Music کا..... Rock-n-Roll کا..... I Just adore him mom

''کیوں کہ آپ کی نظر میں وہ سب سے اہم آدمی ہے..... آپ موسیقی کو جاننے سمجھنے والے ہیں..... اور وہ ایک پیدائشی موسیقار تھا۔''

''ہاں..... ایک مکمل فنکار تھا وہ..... اس گمنام شخص کا درد کیسے محسوس کیا اس نے..... کہ درد کو گانے میں تبدیل کر کے امر کر دیا..... کتنا مشہور ہو گیا Heart Break Hotel کے نام سے وہ مغربی ہوٹل..... جب اس نے گانے کے ساتھ ڈانس کر کے لوگوں کا دل جیت لیا تھا جب تک گاتے ہوئے کوئی ناچا نہیں کرتا تھا اسٹیج پر..... وہ ایک دردمند..... ایک دردمند دل تھا اس کے پاس..... امریکن ہو کر بھی وہ افریقیوں کے دکھ بانٹتا تھا۔

گورا ہو کر بھی اس کے اندر سے افریقیوں کی آواز آتی تھی..... انسان کو ایسا ہی سچا اور ایماندار ہونا چاہیے..... ہے نا..... ہے نا مام.....

نائلہ کو اچھا سامع پا کر وہ دل کی باتیں کہتا.....

''ہاں..... میری جان..... میرا بچہ کتنا عقل مند ہے.....''

وہ اس کا شانہ تھپتھپا دیتی.....

بال سہلا دیتی.....

ماتھا چوم لیتی.....

''مما..... دیکھیے گا..... سارے سکولز میں سے ہمارا گروپ ہی فرسٹ آئے گا..... اس بار بھی۔ فائنل میں پرفارم کرنے کے لیے..... ہم سب بہت Dedicated ہیں.....''

''انشاءاللہ.....'' نائلہ دعا دیتی۔

آج وہ ضرور مجھ سے بات کرے گا۔
میرا شکریہ ادا کرے گا۔

انشاءاللہ...... گاڑی میں بیٹھی نائلہ نے دھیرے سے گردن اس کی طرف موڑی۔
آج وہ ضرور مجھ سے بات کرے گا۔ میرا شکریہ ادا کرے گا۔ میری گود میں سر رکھ کر مجھے منائے گا...... معافی مانگے گا مجھ سے۔
نائلہ سوچتی رہی...... وہ اپنی دھن میں گاتا بجاتا رہا۔
نائلہ کی منزل قریب آ رہی تھی۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے کامیابی کی دعائیں دینا چاہتی تھی۔ بہت دنوں سے اس نے اس کا سر نہیں چھوا تھا۔ مگر وہ بالکل بے خبر گا رہا تھا۔
یہ مجھ سے ایسے نہیں روٹھ سکتا۔ اس چہرے میں تو میں نے آرٹ فائلز کے سبھی چہرے جوڑ رکھے تھے۔ اس کے معصوم ہاتھوں کی ماہرانہ جنبش سے چھیڑے جانے والے نغموں کو سنتے ہوئے میں پیلے رنگ کے ٹین کے نازک سے مستطیل ڈبے کے سب رنگ اور ان رنگوں سے مزید بنے والے ان گنت رنگ دیکھ لیتی تھی۔
نائلہ نے نہایت اداسی سے پوچھا۔
میں نے کچھ غلط کہہ دیا ہوگا...... مگر اس میں بسے فنکار کے ساتھ کچھ برا نہیں ہونے دیا۔
اس کے اس concert کی منظوری دینے کے لیے جانے کیسے کیسے جواب دہ ہونا ہوگا مجھے......
وہ ایک آہ بھر کر رہ گئی۔ اس کی آنکھیں آخر کار بھیگ ہی گئیں۔ کون سمجھے گا مجھے...... آخر...... اس کے بوجھل دل میں خیال ابھرا......
گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رکی۔ اس نے تھکے ہارے سے قدم گاڑی سے باہر رکھے ہی تھے کہ راحیل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
''یہ سب...... آپ ہی کی وجہ سے ممکن ہو پایا ہے مام...... مجھے کامیابی کی دعا دیجیے...... My sweet mom...... آپ کو جانے کیا جھیلنا پڑے گا نا......؟ مگر میں آپ کے ساتھ ہوں مما......

''یہ سب...... آپ ہی کی وجہ سے
ممکن ہو پایا ہے مام......

آپ گھبرائیے گا نہیں۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''صرف آپ...... آپ مجھ سے ناراض مت رہیے گا کبھی...... میں غلط نہیں ہوں نا مما......؟''

. تم کبھی غلط نہیں تھے' میرے فنکار...... نائلہ اسے دیکھتی رہی...... پھر سر ہلکے سے نفی میں ہلا کر اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور مسکراتی ہوئی باہر آ گئی۔

☆......☆......☆

اختر حیات

نصیبوں والے

اسمبلی کا اجلاس جاری تھا۔ ممبران کا زورِ خطابت دیدنی تھا۔
''ہم غریبوں کی تقدیر بدل دیں گے۔''
''بے روزگاری ختم کر دیں گے۔''
''عام آدمی کو سر چھپانے کے لیے مکان بنا کر دیں گے۔''

اجلاس کی کارروائی اگلے دن تک کے لیے ملتوی ہوئی۔ اخباری رپورٹر حمید نے قلم اور نوٹ پیڈ جیب میں ڈالے اور دفتر جانے کے لیے پارکنگ سٹینڈ کی طرف چل دیا جہاں اس کی پھٹیچر سی موٹر سائیکل کھڑی تھی مگر اسمبلی کے باہر چوک میں ایک اور خبر نے اس کا راستہ روک لیا تھا۔ کلرک اپنے مطالبات کے حق میں ننگے پنڈے احتجاجی مظاہرہ کر رہے تھے۔ ''ہماری تنخواہوں میں اضافہ کرو......''

''شدید مہنگائی نے ہمارے چولہے ٹھنڈے کر دیے ہیں۔'' مظاہرین میں سے بعض سینہ کوبی بھی کر رہے تھے۔ مسلح پولیس اہلکار انھیں اسمبلی کی جانب بڑھنے سے روک رہے تھے لیکن مظاہرین نعرے لگاتے اسمبلی کی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ پھر اچانک آنسو گیس کے شیل چلنے لگے۔ اندھا کر دینے اور سانس روک دینے والی گیس نے مظاہرین کو منتشر ہونے پر مجبور کر دیا۔

حمید کی آنکھیں بھی گیس کی چبھن سے نمناک ہو کر سرخ ہو گئی تھیں۔ اس نے جلدی سے موٹر سائیکل سٹارٹ کی دفتر پہنچ کر اسمبلی اور مظاہرے کی خبریں فائل کر دیں۔

اگلے دن اخبار کی سپر لیڈ ''اس سال کے آخر تک عوام کا معیار زندگی بلند ہو جائے گا۔'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ کلرکوں کے احتجاجی مظاہرے کی خبر اخبار کے اندرونی صفحے پر دوسری خبروں کے انبار تلے دب کر سنگل کالم تک سکڑ گئی تھی۔

حمید اپنا کام نمٹا کر رات گئے گھر پہنچا تو گلی میں ایک قیامت سی برپا تھی۔ محلے کی عورتوں اور مردوں کا ایک جمگھٹا لگا تھا۔ حمید کا دل دہل گیا۔ اس کے نوجوان ہمسائے راشد نے زہر کھا کر اپنی

حمید اپنا کام نمٹا کر رات گئے گھر پہنچا تو گلی میں ایک قیامت سی برپا تھی

زندگی کا خاتمہ کرلیا تھا۔ جوان لاش کی چارپائی کے گرد عورتوں کے بین، سننے والوں کا کلیجہ شق کیے دے رہے تھے، خودکشی کرنے والا گریجویٹ راشد بے روزگار تھا...... رات کا آخری پہر تھا جب اخبار پریس میں تیزی سے چھپ رہا ہوتا ہے اس لیے خبر فائل نہیں کی جاسکتی تھی۔

اسمبلی کا اجلاس دوسرے روز بھی جاری تھا۔ حمید کوریج کے لیے جس وقت پریس گیلری میں پہنچا، ممبران ملک سے بے روزگاری ختم کرنے کے منصوبوں پر لچھے دار تقریریں کر رہے تھے۔

"ہماری بے پناہ کارکردگی سے کوئی پڑھا لکھا نوجوان بے روزگار نہیں رہے گا۔"

"ہماری کامیاب پالیسیاں بے روزگاری کا جن، روزگار کی بوتل میں بند کر دیں گی۔"

ایک ممبر نے نکتہ اعتراض پر کھڑے ہو کر کہا۔ "بے روزگاری ختم کرنا حکومت کا کام نہیں، نجی شعبے کو بھی اس کے خاتمے کے لیے آگے آنا چاہیے۔"

ایک دوسرے ممبر نے کہا۔ "ہمارا ملک مملکت خداداد ہے ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی منشا کے بغیر پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ اگر کوئی بے روزگار یا غریب ہے تو یہ اس کا اپنا نصیب بھی ہوسکتا ہے۔ اس میں حکومت کا کیا قصور!"

ہماری کامیاب پالیسیاں بے روزگاری کا جن، روزگار کی بوتل میں بند کر دیں گی

اس فقرے پر ایوان کے کئی ممبروں نے ڈیسک بجا کر داد دی۔

حمید اسمبلی سے باہر نکلا تو چوک میں ایک اور مظاہرہ ہو رہا تھا۔ مظاہرین خودکشی کرنے والے راشد کی میت اٹھائے "بے روزگاری ختم کرو۔" "راشد کی موت کا ذمہ دار کون؟" کے نعرے لگا رہے تھے۔ مظاہرین میں شامل خواتین اپنے دوپٹے اور چادریں پھیلا کر آسمان پر نظریں گاڑے کچھ بڑبڑا رہی تھیں۔

اسمبلی کے تیسرے دن کے اجلاس میں راشد کی خودکشی زیر بحث تھی۔

کئی ارکان خودکشیوں کے اسباب کا سراغ لگانے کی ضرورت پر زور دے رہے تھے۔ ایک وزیر کا کہنا تھا انھوں نے خودکشی کے اس واقعہ کی ذمہ دار ایجنسیوں سے انکوائری کرائی ہے جن کی رپورٹ کے مطابق راشد نے خودکشی بے روزگاری کی وجہ سے نہیں کی بلکہ اپنی بیوی سے اَن بن ہونے کی بنا پر کی ہے...... اس پر ایوان کا ایک بڑا حصہ داد و تحسین کے ڈونگرے برسانے لگا۔

صبح کے اخبارات نے راشد کی خودکشی کو اسمبلی میں وزیر کے بیان کے بعد متنازع قرار دے دیا تھا......

ایک روز شہر کی کچی آبادی کے مکینوں نے مالکانہ حقوق کے لیے جلوس نکالا۔ یہ جلوس بھی ارکان اسمبلی تک اپنا مدعا پہنچانا چاہتا تھا لیکن پولیس بار بار لاٹھی چارج کر کے انھیں اسمبلی کی عمارت سے پرے کرتی رہی۔ کچی آبادی والوں کے مظاہرے کی خبر اسمبلی کے اندر پہنچی تو ایک اہم ممبر باہر نکلے۔ انھوں نے پولیس کو ڈانٹ پلاتے ہوئے مظاہرین کو اپنے قریب بلا لیا اور اسمبلی کی سیڑھیوں پر میگا فون پر مخاطب ہوئے۔

''کچی آبادی کے مکینو! تم ہماری طاقت ہو، ہم تمھارے ہی ووٹوں سے منتخب ہو کر یہاں پہنچے ہیں۔ اس عمارت کے اندر ہم تمھارے ہی مسئلے حل کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ تمھیں اسی مہینے مالکانہ حقوق مل جائیں گے ..... جس کے بعد تمھاری گلیاں پختہ کر دی جائیں گی۔ تمھارے گھروں تک سوئی گیس اور پینے کے صاف پانی کے پائپ بچھا دیے جائیں گے۔''

''کچی آبادیاں پکی کر دی جائیں گی۔ تم فکر مت کرو..... ہم تمھارے ہیں اور تم ہمارے ہو۔''

کچی آبادی کے مظاہرین یہ سن کر نہال ہو گئے۔ ان کے لیڈروں نے ممبر کے حق میں زوردار نعرے لگوائے ان کا شکریہ ادا کیا اور جلوس پر امن طور پر منتشر ہو گیا۔

حمید نے دفتر جا کر مالکانہ حقوق کے کاغذات کی اصلیت کی خبر فائل کر دی

حمید نے یہ خبر بھی پوری تفصیلات کے ساتھ شائع کر دی۔ اسمبلی کے اجلاس کے دن ابھی پورے نہیں ہوئے تھے۔ وہ صبح اجلاس کی کارروائی نوٹ کرتا اور پھر سہ پہر کے وقت دیگر خبروں کی تلاش میں مختلف سرکاری و غیر سرکاری دفاتر کے چکر لگاتا..... سیاستدانوں سے انٹرویو کرتا۔ درون خانہ پکنے والی سیاسی کھچڑی کے اجزائے ترکیبی کا کھوج لگاتا اور بڑے اعتماد سے خبریں فائل کر کے گھر لوٹ جاتا۔

ایک صبح وہ اسمبلی گیا تو وہاں کچی آبادی کے مکینوں کو مالکانہ حقوق دینے کا معاملہ زیر بحث تھا..... بالآخر یہ طے پایا کہ اگلے ماہ کے وسط تک کچی آبادی کے مکینوں کو مالکانہ حقوق دے دیے جائیں گے اور ایک اہم سیاسی شخصیت کچی آبادی میں جلسہ عام کے دوران ملکیت کے کاغذات تقسیم کرے گی۔

مقررہ دن کچی آبادی میں جلسہ منعقد ہوا۔ سیاسی شخصیت نے کچی آبادی کے مکینوں میں مالکانہ حقوق کے کاغذات تقسیم کیے..... کاغذات وصول پاتے ہوئے کچی آبادی کے مکینوں کے چہرے بے پایاں خوشی سے کھلے ہوئے تھے۔

حمید رپورٹنگ کے لیے موجود تھا۔ جب جلسے کی کارروائی ختم ہوئی مہمان چلے گئے تو اس نے

کچی آبادی کے ایک مکین سے مالکانہ حقوق کے کاغذات دکھانے کو کہا۔ لفافے میں صرف ایک سرٹیفکیٹ نما کاغذ بند تھا جس پر ایک ماہ کے اندر اندر زمین کی مارکیٹ کے مطابق محکمہ مال میں قیمت جمع کرا کے اپنے گھر کے مالک بن جاؤ۔“ لکھا تھا۔

حمید نے دفتر جا کر مالکانہ حقوق کے کاغذات کی اصلیت کی خبر فائل کر دی۔ اگلے دن یہ خبر نمایاں انداز میں شائع ہوئی۔ نیوز ایڈیٹر نے اس خبر پر اسے شاباش دی جس سے حمید نے اپنے اندر بھرپور توانائی اور قلم میں روانی محسوس کی۔

صبح اسمبلی کے اجلاس میں نکتہ اعتراض پر ممبران حمید کی خبر پر ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے۔ سرکاری بنچوں کا موقف تھا کہ جس اخبار نے کچی آبادی کے مکینوں کو دیئے جانے والے مالکانہ حقوق کو بوگس قرار دیا اس کے خلاف قرار داد مذمت منظور کی جائے اور متعلقہ رپورٹر کو استحقاق کمیٹی کے روبرو پیش ہونے کا حکم دیا جائے۔

حزب اختلاف کے ارکان بضد تھے کہ کچی آبادی کے مکینوں کو صحیح ملکیتی کاغذات دیئے جائیں ان کا کہنا تھا کہ کچی آبادی کے مکین سالہا سال سے مالکانہ حقوق سے محروم رکھے جا رہے ہیں۔

چوبیس گھنٹے پہلے ایک دوسرے پر سنگین الزامات لگانے والے خوشی سے بغل گیر ہو رہے تھے

اس پر سرکاری بنچوں کے ارکان اٹھ کھڑے ہوئے جس کے بعد فریقین نے ایک دوسرے پر تند و تیز جملوں کی بوچھاڑ شروع کر دی...... مخالف ممبروں نے بڑھتی مہنگائی اور کم تنخواہوں کے معاملے پر بھی کھل کر تنقید کی۔ بجلی، پٹرول اور گیس کی قیمتوں میں اضافے کو عوام پر ظلم گردانا گیا۔ ایوان میں ہنگامہ ہوتے دیکھ کر سپیکر نے اجلاس وقت سے پہلے ہی اگلی صبح تک کے لیے ملتوی کر دیا۔

حمید نے اسمبلی کے اس سیشن کی بھرپور رپورٹنگ کی۔ خبر کے بعد اس نے اخبار کے لیے ڈائری بھی لکھی جس میں حکومت مخالف ارکان اسمبلی کے غریب عوام کے حق میں بیانات کو سراہتے ہوئے اسے عوام کے دل کی آواز کہا گیا۔

اس رات حمید کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ صبح کا اجلاس خاصا ہنگامہ خیز ہوگا۔ ممبران اسمبلی سرکار پر خاصا دباؤ ڈالیں گے جس کے نتیجے میں عوام کے مسائل حل ہو سکیں گے۔

صبح وہ اجلاس شروع ہونے سے کم از کم ڈیڑھ گھنٹے پہلے پریس گیلری میں جا پہنچا۔ وہاں پہلے ہی کئی اخبار نویس موجود تھے۔

اجلاس کا وقت ہو چکا تھا مگر ایوان میں صرف پچاس ساٹھ ممبر موجود تھے۔ کورم پورا نہیں تھا۔

گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ وقت مقررہ سے پون گھنٹہ بعد ایوان ممبران سے کھچا کھچ بھر گیا...... اچانک ایک وزیر اپنی نشست پر کھڑے ہوئے۔ انھوں نے سپیکر سے ایک قرارداد پیش کرنے کی اجازت طلب کی۔ اجازت ملنے پر انھوں نے لکھی ہوئی قرارداد پڑھنا شروع کر دی۔ "یہ ایوان جو ایک جمہوری ادارہ ہے اور جسے عوام نے منتخب کیا ہے، اس کے تمام فاضل ممبر قابل احترام ہیں۔ یہ منتخب نمائندے بھی آخر انسان ہیں مہنگائی کے اثرات ان پر بھی مرتب ہو رہے ہیں۔ لہٰذا یہ ایوان مطالبہ کرتا ہے کہ ایوان کے تمام ارکان کی تنخواہوں اور الاؤنسز میں پانچ سو فی صد اضافہ کیا جائے۔"

سپیکر نے ابھی اس قرارداد پر رائے بھی نہیں مانگی تھی کہ ایوان میں موجود تمام ممبروں نے قرارداد کے حق میں ہاتھ کھڑے کر دیے...... قرارداد متفقہ طور پر منظور کر لی گئی چوبیس گھنٹے پہلے ایک دوسرے پر سنگین الزامات لگانے والے خوشی سے بغل گیر ہو رہے تھے۔

حمید سمیت تمام رپورٹر پریس گیلری سے اٹھ آئے۔ باہر چوک میں مزدور مہنگائی کا سیاپا کر رہے تھے اور پولیس ان پر بری طرح لاٹھیاں برسا رہی تھی۔

●●●●●●●●●●●●●●●●●●

عذرا اصغر

مسافتوں کی تھکن

قسط 3

''بقول ہنری لو پر- انسان میں علم کے تین سرچشمے ہیں- عقل- ادراک اور تفکر...... لیکن یہ سب اصطلاحات ہیں- حقیقت میں صرف ایک ہی چیز وجود رکھتی ہے اور وہ ہے ذاتی احساس...... یا شعور- یعنی کوئی شے مجھ پر کس طرح اثر انداز ہو رہی ہے اور میں اسے کیسے شناخت کر رہا ہوں- صورت یہ نہیں ہے کہ عقل کا فتویٰ کچھ اور ہے اور میرا احساس کچھ اور کہہ رہا ہے- اس بات کو ذرا وضاحت سے یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہر شخص کی عقل کا معیار مختلف ہے اور ہر شخص اپنی عقل کے پیمانے سے اس دنیا- یہاں تک کہ مادی اشیاء اور ان کے رنگوں کا مشاہدہ کرتا ہے- کسی شخص کی عقل دوسروں کی عقل سے کلی طور پر مطابقت نہیں رکھتی- نتیجہ یہ ہے کہ کسی شخص کی نگاہ عقل میں کسی شے کا جو رنگ ہے وہ اس سے مطابقت نہیں رکھتا جو دوسروں کی نگاہ عقل میں اس شے کا رنگ ہوگا- بات یہ ہے کہ ہم دنیا کو اس طرح نہیں دیکھتے جیسی کہ واقعی دنیا ہے- بلکہ ہم دنیا کو اس طرح دیکھتے ہیں جیسے کہ ہم خود ہیں-''

اس نے کتاب بند کی اور اسے گود میں رکھے دیر تک خلاؤں میں گھورتا رہا- کھلے دریچے سے باہر رات آہستہ آہستہ گہری ہوتی جاتی تھی- چاند پوری آب و تاب سے آسمان کے بیچوں بیچ کسی سنہری قندیل کی مانند چمک رہا تھا- فضا نقرئی روشنی میں نہائی بے حد دلکش رکھتی تھی اور ماحول پر ایک فسوں طاری تھا-

''اچھا تو یہ ہے فلسفہ حیات......؟ یہ رات جو دھیرے دھیرے گزرتی جاتی ہے اور میں اپنے کمرے کے مخصوص اس حصے سے اسے گزرتا دیکھتا ہوں ہوسکتا ہے آنے والی اگلی کسی رات میں یہ سب یوں نہ ہو- اس سے پہلے یہ دودھیا چاندنی مجھ پر اثر انداز ہوتی رہی ہے لیکن آج اس رات کی کیفیت مختلف ہے- میرے جذبات غیر منظم ہیں ان کی ترتیب بے ترتیب ہے- ان میں ہلچل ہے- ہوسکتا ہے صبح نو کی پہلی کرن حالات کا رخ موڑ چکی ہو- یہ زندگی ہے جو لمحہ لمحہ سرکتی جا رہی ہے اور ہم گرفت کی

قدرت خود میں نہیں پاتے - یہ ایک تیز رو' خود سر گھوڑے کی مانند ہے اور رخشندہ بیگم تم......؟ تم اس وقت جانے کیا خواب دیکھ رہی ہو گی اور تم ہرگز نہیں جانتیں کیا ہونے جا رہا ہے ...... کیا ہو گا ...... کیا ہو گا......؟'' اس نے کتاب کھولی اور نظریں پھر سے اس پر جما دیں۔

''یہ ذاتی شعور ایک ایسی ضرورت ہے جو انسان کی ذات کا جزو ہے - اس حقیقت کی نہایت عمیق اور دقیق تشریح فلسفہ خلقت آدم علیہ السلام میں موجود ہے - صورت یہ ہے کہ وہ انسان کہ جسے ہر نعمت حاصل تھی -- جس کی ہر ضرورت پوری ہو رہی تھی - جسے کسی قسم کی احتیاج یا کمی کا احساس نہ تھا' جو ہر سطح کے رنج و غم سے بے نیاز تھا - اسے یہ حکم دیا گیا کہ وہ ''شجر ممنوعہ'' کا پھل نہ کھائے - لیکن شیطان کے فریب میں مبتلا ہو کے اس نے ''میوہ ممنوعہ'' کھا لیا اور اس کا جو پہلا ردعمل اس پر مرتب ہوا اس کے متعلق ہم پوری وضاحت سے جانتے ہیں - بعض یہودی اور مسلم مفسرین اس بحث میں الجھے ہوئے ہیں کہ ''میوہ ممنوعہ'' کیا تھا - یعنی انگور تھا' گندم تھا' یا کچھ اور ...... ان بحثوں سے قطع نظر ہمیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ اس ''ممنوعہ پھل'' کے کھانے کا نتیجہ کیا ہوا -

توریت میں اس قصے کو کچھ اس طرح نقل کیا گیا ہے کہ جب آدم علیہ السلام ''شجر ممنوعہ'' کا پھل کھا چکے اور خدا ان سے ملاقات کے لیے آیا تو وہ اس کے سامنے نہ گئے - خدا نے انہیں آواز دی تو انہوں نے جواب دیا کہ ہمیں اپنی عریانی کے سبب شرم آتی ہے - اس جواب کو سن کر خدا نے جان لیا کہ انہوں نے ''شجر ممنوعہ'' کا پھل کھا لیا ہے - اس کا مطلب یہ ہے کہ پھل کھانے سے پہلے ان کو اپنی حالت کا احساس نہ تھا - ان پر ان کی عریانی' بدصورتی اور بے شرمی ظاہر نہ تھی - وہ وضع اور حالات سے بے خبر تھے اور یہی بے خبری ان کی خوش بختی کا سبب تھی - اور یہی وہ زندگی کی حالت تھی جسے بہشت سے تعبیر کیا گیا ہے - توریت نے اس ''ممنوعہ پھل'' کو نہایت واضح طور پر بینائی اور آگہی سے تعبیر کیا ہے' ''قرآن بھی اس مفہوم کی تائید کرتا ہے -''

کتاب میں اس کی دلچسپی بڑھتی گئی اور وقتی طور پر وہ بھول گیا کہ اسے کیا سنگین مسئلہ درپیش تھا - وہ جو لمحہ پہلے زندگی سے بے زار تھا' نہایت شوق سے کتاب پڑھنے میں مشغول تھا - جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا جاتا اس کا دل طمانیت پاتا جاتا - وہ مضبوط ہو رہا تھا - سنبھل رہا تھا - اس نے پھر پڑھنا شروع کیا -

''صورت یہ ہے کہ جیسے ہی ''ممنوعہ پھل'' آدم علیہ السلام کے حلق سے نیچے اترا' ان کے چشم و احساس میں بہشت ایک ایسی دنیا سے بدل گئی جو رنج و آلام سے پر ہے اور جو انسان اور اس کی تمناؤں اور خواہشات سے کمتر ہے - میرے خیال میں سقوط و ہبوط آدم علیہ السلام کے یہی معنی ہیں - یہ شعور کی حالت بدلنے سے عبارت ہے - چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو شخص اس شجر ممنوعہ (آگاہی و بصیرت) سے

جس قدر پھل کھاتا ہے اس کے لیے یہ دنیا اسی قدر رنج و مصیبت کا گھر بن جاتی ہے اور وہ اسی قدر زیادہ تنگی، گھٹن اور تلخی کا شکار ہو جاتا ہے اور جو اس پھل کو جس قدر کم استعمال کرتا ہے وہ اسی حد تک آرام و سکون سے زندہ رہتا ہے- اس کے لیے یہ دنیا اسی قدر زیادہ بہشت بن جاتی ہے- ایسے لوگوں کی تمام ضرورتیں صرف ایک لاٹری ٹکٹ جیتنے سے پوری ہو جاتی ہیں...... یہ صورت حال جو ہمیں آج نظر آتی ہے ہمیشہ سے اسی طرح ہے- یعنی خود آگہی اور بصیرت جس قدر زیادہ بڑھتی ہے اسی قدر انسان کے لیے دنیا دار المحن بنتی چلی جاتی ہے-''

''تو قصہ یہ ہے-'' اس نے گہرے رنج سے سوچا- ''میر لاٹری ٹکٹ ہوں اور یہ میرے پاپا ہیں جو میرے لیے بصیرت کا مجسمہ تھے- علم کا منبع- میں نے ہمیشہ امی سے زیادہ پاپا کو مقدم جانا ہے اور اب ......اب......؟''

رات کے آخری پہر کے اس سرے پر اس کا نام فضا میں گونجا' اللہ اکبر- اللہ اکبر- اللہ سب سے بڑا ہے- اللہ سب سے عظیم ہے- وہ ہماری شہ رگ سے بھی قریب ہے- چاندنی مدھم تھی- سوگواری کا شدید احساس لیے- اور چاند پیلا ہو کر آسمان کے مغربی کنارے پر جھک آیا تھا- اس کا چہرہ بے نور تھا- اترا ہوا- بیمار اور بوڑھا- راشد نے ایک تھکی سی انگڑائی لی- کھڑکی کے پردے برابر کیے اور بستر پر دراز ہو گیا- تب بہت جلد نیند اس پر غالب آ گئی اور وہ بے نام...... غیر واضح سے خوابوں کے جزیرے میں اتر گیا-

❖❖❖

''اوفوہ! تو یہ سب یوں ہے- یونہی ہوتا چلا آ رہا ہے- جانے کب سے- زندگی اپنی مخصوص رفتار سے بے نیازی کے ساتھ چلتی چلی جاتی ہے- کبھی تیز اور کبھی تیز تر...... دکھ سکھ' ہر بات غیر متوقع...... سوچ و خیال سے ماورا؟- اور یہ جو میں ہوں......؟ کہاں سے چلی ہوں......؟ سوچو بھلا میں کون ہوں......؟ دنیا کے اس اتنے بڑے سمندر میں تیرتا ایک معمولی سا تنکا......! اتنی تیز روانی میں حقیر تنکا...... کیا حیثیت رکھتا ہے-؟ ارے یہ تو کسی کو نظر بھی نہیں آ سکتا- بپھری ہوئی موجیں کہاں سے کہاں اچھال دیتی ہیں...... غرقاب ہو جاتا ہے لہروں میں...... اور اس دن...... ہاں اس دن نہ کوئی رویا نہ چلایا...... نہ کسی نے کسی کو برا بھلا کہا- گھر کے سربراہ...... انیس احمد سید تو ایسے چپ ہوئے کہ جیسے سدا کے گونگے تھے- معمول کی گفتگو بھی ہوں' ہاں تک محدود ہو گئی اور عصمت آرا بیگم پلنگ پہ ایسی لیٹیں کہ مر کر ہی اٹھیں- وہ رخشندہ بیگم اپنا غم کس کے آگے بیان کرتیں؟ بس خاموشی کی زبان میں خدا کے آگے فریاد کرتی رہیں- لیکن اب تو جو ہونا تھا' ہو چکا تھا- دعائیں حالات کی مہاریں کیسے موڑتیں...... چپ اور صبر کے سوا کوئی بھی تو رستہ نہ تھا...... انہوں نے اسپر پھینک دی- مگر انہیں یقین نہ آیا- انھوں نے سوچا-

''یہ فیصلہ کیا راشد کا ہو سکتا ہے؟''

''ناقابل یقین...... ناممکن-''

''مگر کیا پتہ...... انسان کو بدلتے کیا دیر لگتی ہے-؟ زمانہ اور زمانے کا چلن تغیر پذیر ہے-''

''شاید اسے بہت مجبور کر دیا گیا ہو؟ مگر وہ مجبور ہونے والوں میں سے تو نہیں تھا- شاید وہ گھر سے بھاگ کھڑا ہوا ہو-؟'' ایک خواہش موہوم ان کے اندر پیدا ہوتی - مدتوں وہ اس کا انتظار کرتی رہیں- ہر آہٹ ہر دستک پر وہ چونک اٹھتیں- مگر نہ راشد آیا اور نہ اس کا کوئی پیغام ملا...... وقت گزرتا چلا گیا- یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل تھی کہ فرحت علی سید اپنے بردار نسبتی کو تحریری طور پر نہایت مودبانہ مطلع کر چکے تھے کہ ''بھائی ہم آپ سے از حد شرمندہ ہیں کہ ناگزیر وجوہات کی بنا پر عزیزی راشد علی کی نسبت ماہین بنت منور حسن سے طے کر دی گئی ہے اور اگلے چاند کی بارہ تاریخ کو نکاح و رخصتی قرار پائی ہے- امید ہے آپ ہماری مجبوری کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمیں معذرت خواہ جانیں گے اور عزیزی نور چشمی رخشندہ کا رشتہ کسی مناسب جگہ طے کر دیں گے- کوشش کروں گا کہ اس سلسلے میں آپ کی مدد کر سکوں-''

اور ہاں بر سبیل تذکرہ عرض کرتا ہوں کہ برادرم منور حسن صاحب عرصہ دراز سے ملیشیا میں آباد ہیں اور ماشاءاللہ جزیرے قسم کی جائیداد کے مالک ہیں- والسلام- عصمت آرا بیگم کے لیے یہ خط کسی ایٹم بم سے کم نہ تھا مگر عزت کی خاطر یا شرمندگی کے سبب انہوں نے اس بات کو کسی پوشیدہ مرض کی طرح چھپا لیا لیکن دونوں خاندانوں کے بیچ غیر محسوس طریقے پر اجنبیت کی ایک دیوار حائل ہوگئی- ان کے گھر میں زمانی بیگم کے خاندان کا تذکرہ ممنوع تھا- عزیز رشتہ داروں سے نہ پوچھا جاتا اور نہ کوئی خود سے کچھ بتانے کی کوشش کرتا- بس سب مہر بہ لب تھے- رخشندہ کے لیے پیغام آنا تو بند ہو ہی چکے تھے- سب جانتے تھے کہ وہ اپنی پھوپی کے گھر منسوب ہے- اب وہ کیسے کسی کو بتاتے کہ لڑکی کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے- لوگ کیا کہتے؟ کیا سوچتے؟ طرح طرح کی باتیں نکلتیں- نئے نئے سوالات اٹھائے جاتے- وہ شرمسار تھے- مجبور تھے اور رخشندہ......؟ وہ چپ تھیں اور منتظر...... وہ جو مشرقی طور طریقوں کی پابند تھیں- مشرقی تہذیب نے ان کے منہ پر تالا ڈال دیا تھا- مگر دل تھا کہ کسی طور قرار نہ پاتا تھا- اپنے دل کا حال وہ کسی سے کہہ نہ پاتیں- بہنیں اگرچہ ان سے چھوٹی تھیں مگر سب تقریباً بیاہی جا چکی تھیں- یوں بھی بے تکلفی کے باوجود انہوں نے کب کسی کے سامنے تسلیم کیا تھا کہ وہ راشد سے محبت بھی کرتی ہیں- یہی نہیں کہ وہ راشد سے منسوب تھیں بلکہ اسے چاہتی بھی تھیں اور اب راشد کی بیوفائی ناقابل بیان تھی- گریجویشن کرنے کے بعد انہوں نے کالج چھوڑ دیا تھا- گھر کے کام کاج سے انہیں زیادہ رغبت نہیں تھی- ان کی واحد دلچسپی گھر سجانا اور کتابیں پڑھنا تھا اور کتابیں پڑھنے کا شوق بھی جو تھا وہ راشد کے سبب سے ہی زیادہ پیدا ہوا تھا- وہ کوئی نئی کتاب پڑھتا تو فوراً رخشندہ کو بتاتا یا کتاب خرید کر بھیجتا- اسے کتابوں سے

والہانہ عشق تھا اور کتابوں کی محبت میں رخشندہ کو شاید راشد سے قربت کا احساس ہوتا تھا- جب کبھی وہ سب اکٹھے ہوتے تو آپس میں کتابوں پر ہی تبادلہ خیال کرتے - کونسی کتاب کسی نے کب پڑھی یا نہیں پڑھی - اور پڑھی تو کیسی لگی - کس مصنف کی کونسی کتاب چھپی ہے راشد کو تو پیرے کے پیرے زبانی یاد ہو جاتے تھے - اس کا حافظہ کمال کا تھا - اب اگرچہ وہ کسی سے کچھ نہ کہتیں لیکن ان کے جذبات کا اندازہ تو سب کو تھا - کوئی دانستہ تذکرہ نہ کرتا مگر وہ سوچتی رہتیں-

''کیا راشد میں تمھارے حافظے سے بالکل محو ہو چکی ہوں؟ بندہ خدا - کبھی دو لفظ لکھ کر معذرت ہی کر لیتے - میں شاید تمھارے عذر لنگ سے مطمئن ہو جاتی اور تمھیں معاف کر دیتی تمھاری مجبوریوں کا ادراک کر کے شاید میرا بیقرار دل قرار پا جاتا مگر تم نے تو کسی معذرت کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی - تم اپنی نئی زندگی میں' جو بھی تم نے اپنائی' اس میں اتنے خوش اور مطمئن ہو تو پھر بھلا معذرت کیوں کرو گے؟ یہ بات شاید صحیح ہے کہ حالات کے تحت انسان کے خیالات و نظریات بدلتے رہتے ہیں - لیکن راشد ذرا غور کرو وہ لڑکی جس نے آنکھ کھولتے ہی تمھیں اپنے قریب پایا ہو اور شعور پکڑتے ہی تمھارا نام اپنے نام کے ساتھ سنا ہو اور وہ لڑکی اپنا سب کچھ تمھیں مان چکی ہو' بتاؤ ایسے حالات میں وہ کیا کرے؟ میں کوشش کرتی ہوں مگر صبر کا دامن ہر بار ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے - کمرے کی تنہائیاں اور رات کی خاموشی میرے آنسوؤں کی گواہ ہے اور راشد چھت کی وہ سونی منڈیریں بھی میرے حال پر آنسو بہاتی ہیں جو ہماری رفاقت کی شاہد ہیں اور یہ بھی اچھا ہی ہے راشد کہ میری آنکھیں میرا بھرم نہیں کھولتیں' وہ میرے آنسوؤں کی چغلی نہیں کھاتیں...... امی بہت گہری نظروں سے مسلسل مجھے دیکھتی رہتی ہیں - شاید وہ میرے جذبات جاننا چاہتی ہیں جنھیں میں نے بہت ضبط سے چھپا رکھا ہے - امی کو تو جیسے اس واقعہ کے بعد چپ ہی لگ گئی ہے - اس غم اور ہتک کا گھن انہیں اندر ہی اندر کھاتا رہا اور بابا نے تو دل کا روگ پال لیا-''

وہ سوچتی رہتیں اور اس واقعہ کے ایک مدت بعد یہ پہلا موقع تھا جب بہت سے رشتہ داران کے گھر جمع ہوئے تھے اور ان میں سے اکثر متعجب تھے کہ پھوپھی بن بیاہی بیٹھی ہے اور بھتیجی بیاہی جا رہی ہے اور تبھی کسی کے بتانے پر انہیں پتہ چلا کہ راشد نے شادی سے انکار کر دیا تھا اور وہ چپکے سے گھر چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا - گھر والوں نے پہلے چپکے چپکے اسے ڈھونڈا پھر اخبارات میں اشتہار بھی دیے مگر اس کا کچھ بھی پتہ نہ چل سکا اور تب راشد کی طرف سے مایوس ہو کر ماہین کو ناصر علی کی دلہن بنا لیا گیا ہے- زمانی بیگم زندہ ضرور ہیں مگر مردوں سے بدتر ہیں-

یہ خبر عصمت آرا کے لیے ہی حیران کن نہ تھی' پورے گھرانے کے واسطے انتہائی سنسنی خیز اور حیرت ناک خبر تھی اور رخشندہ بیگم کو خود عصمت آرا نے یہ خبر سنائی رخشندہ سکتے کے عالم میں بیٹھی پہلے تو ان کا منہ

تکتی رہیں پھر بے ساختہ ہنسیں اور پھر ماں کے کندھے پر سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں ماں نے فرط جذبات سے بیٹی کو اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ ان کا جسم شاخ پہ اٹکے کمزور پتلے کی طرح لرزنے لگا اور ان کے آنسو ماں کے آنسوؤں میں گھل مل گئے۔ اس وقت عصمت آرا لمحہ بھر کو بھول گئیں کہ بعض رشتہ دار عورتوں نے ان سے کیسے کیسے کٹیلے، چبھتے ہوئے طنزیہ جملے کہے تھے اور اب صورتحال مختلف تھی۔

''راشد نے شادی نہیں کی۔''

''راشد روپوش ہے۔''

''کیا وہ زندہ بھی ہے یا......؟''

''کیا وہ کبھی آ نکلے گا؟'' کم از کم رخشندہ بیگم نے انتظار کا پھندا اپنے گلے میں ڈال لیا تھا......

اور ان سب کو یہ اطمینان ہوا تھا کہ راشد کے گھر چھوڑ جانے سے اس کے والدین اور بالخصوص فرحت علی کو ذلت اٹھانا پڑی اور جوان بیٹے کی جدائی کا دکھ سہنا پڑا۔ وہ بھی کرب سے گزرے۔ ان کا سکون بھی تباہ ہوا۔ مگر ان سب کو زمانی بیگم کا خیال ستایا کہ وہ بیچاری تو پہلے ہی ستم رسیدہ تھیں۔ انہیں کاہے کی سزا ملی۔ فرحت علی نے تو کبھی انہیں سر اٹھا کر جینے ہی نہ دیا تھا۔ ان کی منصوبہ بندی میں واحد خواہش اور امید تھی کہ رخشندہ کو بہو بنا کر وہ مضبوط ہو سکیں گی اور اب راشد ہی ان سے بچھڑ گیا تھا ان کا منصوبہ ہی ناکام نہیں ہوا تھا وہ جیتے جی مر گئی تھیں اور یہ سوچیں ان سب کے لیے سوہان روح تھیں۔ پریشان کن تھیں......تکلیف دہ تھیں......مگر وہ خود کو بے بس پاتے تھے۔ کچھ کر نہ سکتے تھے۔ ان کے اور زمانی بیگم کے خاندان میں جو خلیج پیدا ہو گئی تھی۔ اسے پاٹنا......عبور کرنا ممکن نہ تھا۔ جانے راشد کہاں ہو گا؟ ہو گا بھی کہ نہیں؟ جانے اس نے کچھ کر نہ لیا ہو؟ کیا کیا وسوسے ان کے دلوں میں پلتے تھے اور جانے زمانی بیگم پر کیا بیت رہی ہو گی؟ وہ سب ان سب باتوں سے بے خبر تھے اور لاعلم اور ان کے ہاں روشنا کی شادی کی تقریب جاری تھی۔ عصمت آرا اور رخشندہ کو ڈھولک کی ہر تھاپ افسردگی میں ڈوبی محسوس ہوتی تھی مگر وہ اپنے دکھ کا اظہار کسی سے کر نہ سکتی تھیں۔ عصمت آرا کو خیال تھا کہ بہو اور بیٹے کو ان کی عدم دلچسپی کا احساس نہ ہو۔ بات تو یہ بھی اپنی جگہ بہت خوشی کی تھی کہ ان کی پہلی پہلی پوتی اپنا گھر بسانے جا رہی تھی مگر جوان جہان بیٹی نامعلوم مستقبل کے ساتھ گھر بیٹھی تھی اور ان کی زندگی کا چراغ باد مخالف کی زد پر تھا کون جانے کب بجھ جائے!

رخشندہ لوک لاج کی اسیر......بھرپور تندہی اور مسرت سے کاموں میں مصروف تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ کسی کو بھی کسی طرح کی غلط فہمی ہو۔ وہ جانتی تھیں، سب رشتہ داروں کی نگاہیں ان پر جمی ہیں اور وہ یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتی تھیں کہ لوگ ان کے بارے میں باتیں بنائیں اور ان پر ترس کھائیں۔

اور جب رات کے آخری پہر روشنا شہنائی کی گونج میں وداع ہو کر چلی گئی اور شامیانہ اجڑا اجڑا

سارہ گیا اور قمقموں کی روشنیاں مدھم پڑ گئیں تو خالی اسٹیج کے کونے پر بیٹھ کر روتی نوری کے پاس بیٹھ کر رخشندہ نے انہیں گلے سے لگا کر کہا۔

''بھابی نہ روئیے۔ اٹھارہ برس پہلے آپ بھی تو اپنا گھر چھوڑ کے ہمارے ہاں چلی آئی تھیں؟ بیٹیاں تو بھابی اپنے ہی گھر میں سجتی ہیں۔ اگر وہ باپ کی دہلیز پر بیٹھی رہ جائیں تو مائیں اپنی راتیں جاگ کر کاٹتی ہیں۔ نہ روئیے بھابی کہ آپ بروقت ایک بڑے فرض سے نمٹ گئیں۔'' نوری نے سر اٹھا کے انہیں دیکھا اور رخشندہ کے گلے میں باہیں ڈال کے ہچکیاں لینے لگیں۔

فرحت علی نے چیخ چیخ کے گھر سر پر اٹھالیا............

''یہ سب تمہارے بے جالاڈ پیار کا نتیجہ ہے۔ اس کی یہ مجال کہ میرے حکم سے سرتابی کرے؟'' وہ بپھرے ہوئے خونی بھیڑیے کی طرح پھنکارتے تھے۔ گھر پر سکوت طاری تھا۔ زمانی بیگم ڈولتے پتے کی مانند کانپتی، کلیجہ پکڑے، تسبیح ہاتھ میں لیے دوپٹے کے پلو میں آنسو جمع کرتی رہیں۔ اب وہ کس سے اپنا درد کہیں؟ جوان بیٹا...... امیدوں کا سہارا۔ آنکھوں کا تارا۔ جانے کہاں ہوگا۔ کس حال میں ہوگا۔ کہیں خود کو نقصان نہ پہنچالے؟ ایک دھڑکا تھا۔ ہول اٹھتے تھے۔ بھائی بھاوج سے بھی بری بنی اور چھوٹ بھی گئی۔ ساری عمر ان کی شکلوں کو ترسوں گی۔ جوان جہان بیٹا گنوایا اور میں، کہ جس کی تذلیل کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی گئی۔

سائرہ ماں سے چھپ چھپ کے بھائی کے لیے روتی تھی اور ماں کو دلاسہ دیتی تھی۔

''آپ پریشان نہ ہوں امی۔ بھائی غصہ اترتے ہی گھر آجائیں گے۔''

مگر نہ وہ آیا نہ اس کی کوئی خیر خبر ملی۔ اس کے سب دوست لاعلم تھے۔ وہ کسی سے نہیں ملا تھا۔ کسی کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ دفتر سے غیر حاضر تھا۔ اتنا پتہ چلا کہ اس نے بنک سے کچھ رقم نکلوائی ہے۔ گھر سے اس نے صرف چند جوڑے کپڑے لیے تھے اور بس...... اس کا کمرہ ویسا ہی تھا جیسے ابھی سو کر اٹھا ہو اور واش روم گیا ہو۔ ابھی نہا دھو کر باہر نکلے گا۔ لباس تبدیل کرے گا اور ماں کو خدا حافظ کہتا دفتر سدھار جائے گا۔ اس کے رات کے پہننے والے کپڑے، نائٹ سوٹ بستر پر الجھا پڑا تھا۔ حالانکہ یہ اس کا معمول نہیں تھا۔ وہ بڑا قرینے کا نفاست پسند لڑکا تھا۔ ماں نے کمرے پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ چھلکتی، برستی آنکھوں کو دوپٹے کے پلو سے پونچھا اور اس کی قمیض اٹھا کر آنکھوں سے لگائی اس کی خوشبو کو محسوس کر کے قمیض چومی اور سینے سے لگا کے وہیں بیٹھ رہیں قمیض میں اس کے جسم کی مہک بسی ہوئی تھی۔

کئی طویل دنوں تک تمام گھر پر خاموشی طاری رہی۔ صرف فرحت علی تھے جو نوں فوں کرتے پھرتے تھے۔ باقی گھر کے سب افراد سکتے کے عالم میں تھے۔ فرحت علی کے تمام غصے کی مرکز زمانی بیگم تھیں۔

پھر کچھ کچھ بادل چھٹنا شروع ہوئے - واقعات ملے تلے رہنے لگے - فرحت علی پچھتاتے تھے اپنی جلد بازی پر نادم تھے مگر اپنی ندامت کا اظہار ان کی انا کے خلاف تھا لیکن وہ یہ سوچ کے پشیمانی کا شکار ہو رہے تھے کہ آخر اس معاملے کو انہوں نے اتنا معمولی کیوں سمجھا اور ابھی تو انہوں نے راشد کی صرف رائے لی تھی - ان کا اندازہ تحکمانہ ضرور تھا مگر وہ اکڑ جاتا' ضد کرتا' آخر وہ میرا بیٹا ہے - کیا میں اتنا بے حس ہو سکتا تھا؟ وہ بار بار سوچتے تھے اور کڑھتے تھے - یوں وہ اپنے خاندانی دبدبے کے پیش نظر یہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ ان کا بیٹا اس حد تک سرکشی پر اتر آئے گا اور اس قدر بغاوت کرے گا کہ گھر چھوڑ کر چلا جائے گا - ان کے اندر پچھتاوا غصے کی صورت ابل رہا تھا اور ابال کی گرم چھینٹوں سے زمانی بیگم کا وجود آبلہ آبلہ ہو رہا تھا -

فرحت علی اپنی جگہ رنجیدہ تھے' حیرت زدہ تھے - راشد ان کا بیحد فرمانبردار' لائق' بیٹا تھا - ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز تھا - ''ارے اسے کیا پتہ کہ میں تو اسے دیکھ دیکھ کر جیتا تھا - اس کے وجود سے مجھے توانائی ملتی تھی - میں تو اسی کے سکھ کے لیے یہ سب کچھ کر رہا تھا - میں کیا جانتا تھا کہ محبت دولت پر فتح پالے گی -'' وہ خود سے کہتے تھے لیکن اب صورت یہ تھی کہ تیر کمان سے نکل چکا تھا - اب تو سوچنا یہ تھا کہ اس خاندان کی گرتی ہوئی ساکھ کو کیسے بچایا جائے؟ کس طرح بھرم رکھا جائے - بیشک اپنی کشمکش اور الجھن وہ کسی پر ظاہر نہ کرتے تھے - لیکن سبھی ان کی کیفیت کو سمجھتے تھے - مگر ان کے سامنے کسی کو دم مارنے کی ہمت نہ تھی -

انیس احمد کو وہ راشد سے پوچھنے سے ہی پہلے انکار میں خط لکھ چکے تھے اور یہ ان کی ایک دیرینہ خواہش تھی جسے وہ موقع ملتے ہی بہت عجلت میں انجام دے بیٹھے تھے اگرچہ اس کی منصوبہ بندی وہ بہت پہلے سے کرتے آئے تھے مگر ظاہر نہ ہونے دیتے تھے - انہیں اپنی بیوی کے خاندان کے قدم اپنے گھر میں مضبوط کرنا گوارا نہ تھا - پہلے ہی دن سے انہوں نے اپنے دل کے کسی گوشے میں انیس احمد کے لیے ایک انجانی سی خلش محسوس کی تھی - ایک نامعلوم سی نفرت اور جب ان کی نئی نویلی شریک حیات نے اپنے اکلوتے' چہیتے بھائی کے اوصاف تذکرۂ میاں کے سامنے بیان کیے تو وہ سچ مچ چراغ پا ہو گئے تھے -

''یہ کیا تم ہر دم اپنے بھائی کے نام کا وظیفہ پڑھتی رہتی ہو - مجھے ہرگز یہ پسند نہیں - یہ میرا گھر ہے اور اپنا گھر اب تم چھوڑ آئی ہو - وہاں کا ذکر یہاں میرے گھر میں نہیں ہوگا - اسے ممنوع جانو -''

''تو کیا یہ میرا گھر نہیں ہے؟'' انہوں نے حیرت سے میاں کی طرف دیکھ کر پوچھا تھا -

''نہیں ...... ہرگز نہیں ...... یہ میرا اور صرف میرا گھر ہے اور یہاں وہی ہوگا جو میں چاہوں گا -''

پتہ نہیں فرحت علی کے لہجے میں کیا تحکمانہ اثر تھا کہ زمانی بیگم سہم کے رہ گئیں - بھائی کا نام بھی لیتے ڈرنے

لگیں اور جب رخشندہ پیدا ہوئی تو بے ساختگی سے انہوں نے اسے راشد کے لیے مانگ لیا۔ فرحت علی نے بھی اس لمحے برہمی کا یا مخالفت کا اظہار نہیں کیا اور پھر آہستہ آہستہ ان کے رویے میں نرمی آتی گئی۔ سالے بہنوئی میں اگرچہ مثالی بے تکلفی نہ تھی مگر زیادہ کھچاؤ بھی نہ رہا تھا۔ لیکن راشد اور ماہین کے رشتے کی بات نے حالات کو یکسر اور یک لخت بدل دیا تھا اور عصمت آرا نے سوچا تھا تو غلط نہ سوچا تھا۔

''راشد بغاوت بھی تو کر سکتا تھا؟''

بغاوت تو راشد نے کی تھی مگر پھوپھی کے پاس جا کر یا رخشندہ کو اپنا کر نہیں اور اس کے گھر چھوڑ دینے کی خبر تب ان تک نہیں پہنچ پائی تھی۔ وہ ان تمام حالات سے لاعلم تھے اور انہوں نے خود سے کچھ جاننے کی ہرگز کوشش بھی نہیں کی تھی۔ یہ صدمہ ان سب کے لیے اتنا گہرا ثابت ہوا تھا کہ انیس احمد دل کے مریض بن گئے تھے اور عصمت آرا......؟ وہ تو جیسے مفلوج ہو کے رہ گئی تھیں۔ جیتوں میں تھیں نہ مروں میں وقت کا کام ہے اپنی رفتار سے چلتے چلے جانا' سو وہ چلتا گیا اور وہ زخم جو راشد کی گمشدگی نے دونوں خاندانوں کو لگائے تھے رفتہ رفتہ ان پر کھرنڈ جم گئے اور پھر روشنا کی شادی ہوتے ہی انیس احمد اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے اور ابھی سال بھی نہ گزرا تھا کہ عصمت آرا نے بھی میاں کی پیروی کی۔ رخشندہ کے لیے پے در پے صدمے سہنا محال ہو گئے تھے۔ عصمت آرا نے آخری وقت میں بہو کا ہاتھ پکڑ کر آخری لفظ رخشندہ کے بارے میں ہی کہے تھے۔

''نوری میری بچی کا خیال رکھنا۔ میں اسے تمہارے سپرد کرتی ہوں۔''

اور یہ بھی عجیب مسئلہ تھا۔ راشد کی گمشدگی کے بعد رخشندہ بیگم کے جتنے بھی رشتے آئے بہنوں اور بہنوئیوں نے کسی نہ کسی بہانے رد کرا دیے۔ ان کی بہتری اور فائدہ رخشندہ بیگم کے بن بیاہے پن میں ہی تھا۔ وہ کنواری تھیں۔ کوئی ذمہ داری نہ تھی۔ جس بہن کو ضرورت پڑتی رخشندہ بیگم کی خدمات حاصل کر لی جاتیں اور انہیں تو پیشکش کی نوبت ہی نہ آتی کہ کہہ دیا جاتا۔

''ارے آپا جان جو ہیں۔''

بہنیں آپا جان کے اخلاق و محبت کی گرویدہ تھیں۔ آپا جان کے قصیدے پڑھتے نہ تھکتی تھیں۔ آپا جان ان کے بچے پال رہی تھیں۔ ان کے چھلے بھگتا رہی تھیں۔ بہنوں کے بچوں کی اصل ماں آپا جان ہی تھیں۔ ایسے ہی موقع پر ان کی قربت فراط سے پیدا ہوئی اور بڑھتی گئی۔ رخشندہ بیگم کی سپاٹ سی زندگی میں ایک وقتی سی دلکشی پیدا ہو گئی۔ زندگی کا بوجھل پن تو دے ملکا ہو گیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا اور چشم پوشی اختیار کی رخشندہ کی شادی کا خیال کبھی کسی کے دل میں نہ آیا۔ آتا بھی کیوں بھلا؟ بہنوں کی ڈھیر ساری ذمہ داری پھر کون نبھائے گا۔ اس خیال سے وہ ڈرتی تھیں اور ان کے شوہر اسی لیے رخشندہ کے لیے آئے ہوئے ہر رشتے میں ہزاروں خامیاں پل بھر میں نکال کے رکھ دیتے تھے اور اب شیر علی بھی یہ

مناسب نہیں سمجھتے تھے کہ ان کی بہن ان سے دور ہو- وہ برملا کہتے-

''مجھ پر اپنی بہن کی دو روٹیاں بھاری نہیں ہیں-''

اور ایک دن جب نوری نے کہا-

''سنئے! مسز علیم نے رخشندہ کے لیے ایک رشتہ بتایا ہے- کیا خیال ہے آپ کا- ہمیں دیکھ لینا چاہیے نا-'' تو وہ جھنجھلا کے ترشی سے بولے-

''تم کچھ پاگل ہوگئی ہو کیا؟''

''کیوں بھلا...... اس میں کیا پاگل پن ہے؟''

''رخشندہ کی یہ عمر ہے شادی کی؟'' انہوں نے خود کو سنبھال کے رسان سے کہا- ''بھئی رخشندہ کونسی پچاس برس کی ہوگئی ہیں؟ اور وہ صاحب ان کے لیے مناسب ہیں شیر- اگر وہ آپ کی عمر کے نہیں ہوں گے تو کچھ تھوڑا بہت بڑے یا چھوٹے ہوں گے- رخشندہ اپنے گھر کی ہو جائیں گی تو امی کی روح کو سکون ملے گا-'' نوری نے تاویل پیش کی-

''تم فکر نہ کرو- امی کی روح کو ابھی بھی سکون ہوگا- کیا تکلیف ہے بھلا رخشندہ کو جو امی کی روح بیکل ہوتی پھرے گی-'' بے نیازی سے وہ ہنس کر بولے-

''مجھے تو آپ کی منطق سمجھ میں نہیں آتی-'' نوری بڑبڑائی- ''جوان جہان بہن کو بھلا کب تک گھر میں بٹھائے رکھیے گا- ویسے بھی بیٹیاں اپنے ہی گھر میں اچھی لگتی ہیں-''

''دراصل میں نے سوچا ہے......'' شیر علی سوچتے ہوئے بولے اور چپ ہو گئے-

''کیا سوچا ہے؟''

''یہ کہ رخشندہ کو روشنا کے پاس بھیج دوں-'' وہ نہایت سکون سے بولے-

''مگر کیوں؟''

بھئی روشنا کے پاس اس موقع پر کسی کو جانا تو پڑے گا نا- تم جاؤ گی تو زیادہ سے زیادہ مہینہ' پندرہ دن بیٹھ سکو گی- رخشندہ چلی جائیں گی تو وقت کا تعین ضروری نہیں رہے گا- جب تک اس کا ہونے والا بچہ تھوڑا بڑا ہو یہ وہاں رہ سکتی ہیں- اس کی بھی آؤ ٹنگ رہے گی اور ہمارا کام بھی ہو جائے گا-''

شیر علی نے بات ختم کر کے داد طلب نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا-

''واہ بھئی شیر علی صاحب-'' نوری طنزیہ بولی- ''یعنی بندر کی بلا طویلے کے سر خود غرضی کو آپ نے کیا رنگ دیا ہے-''

''ارے تم عجیب عورت ہو- ہم تمہارے لیے سہولت پیدا کر رہے ہیں اور تم ہمیں خود غرض ثابت کر رہی ہو-''

''بہر حال یہ انصاف نہیں ہے۔'' وہ بدستور اپنے موقف پر ڈٹی رہی۔

''ایک اور بھی وجہ ہے۔''

''کا ہے کی؟''

''رخشندہ کو نہ بیاہنے کی۔'' شیر علی سوچتے ہوئے بولے۔

''وہ کیا...... وہ بھی فرمادیں۔'' وہ ہمہ تن گوش ہوئی۔

''بابا اپنا اتنا بڑا محل جیسا گھر رخشندہ کے نام لکھ گئے ہیں۔''

''تو......؟''

''تو بات صاف ہے۔ رخشندہ اب صرف میرے یا میرے بچوں کے پاس رہے گی۔''

شیر علی کی بات سن کے نوری صرف ان کا منہ تکتی رہ گئی۔ وہ حیرت زدہ تھی پیسہ' جائیداد محبتوں کو' رشتوں کو کیسے کھا جاتے ہیں۔

❖❖❖

ماہن بنت منصور حسن کا گھونگھٹ اس رات جس شخص نے اٹھایا وہ...... وہ گندمی رنگت اور بڑی بڑی روشن آنکھوں والا نوجوان ہرگز نہیں تھا جسے اس نے اس روز پارک میں ایک پتھر کے بنچ پر بیٹھے اپنی اور تکتے پایا تھا اور جسے غیر متوقع اپنے گھر میں دیکھ کر اس کے قدم ڈرائنگ روم کی دہلیز پر جم سے گئے تھے اور اسے حیرت ہوئی تھی کہ اس کا جذبہ اتنا قوی ہے کہ وہ کھنچتا چلا آیا ہے۔

حالات و واقعات کتنے موافق تھے اور وہ اپنی خوش بختی پہ نازاں تھی۔ مگر...... مگر یہ موافق حالات یک بیک غیر موافق ہو گئے اور وہ حیرت زدہ ہوئی یہ جان کر کہ اس شہزادے نے اسے ٹھکرا دیا ہے۔ وہ......؟ جو متمول باپ کی خوش شکل...... تعلیم یافتہ بیٹی تھی اور جس کے حصول کے لیے ہر نوجوان تمنائی ہو سکتا تھا۔ مگر وہ تمنا کر بیٹھی تھی اس بے نیاز سے' گندمی رنگت والے اس لڑکے کی جس کی بڑی بڑی آنکھوں سے نکلی روشنی کی کرنیں اس کے دل میں اندر تک اتر گئی تھیں۔ لیکن اب...... اب وہی گھر تھا مگر اس کا بھائی اس کے گھونگھٹ کے پٹ اٹھائے کہہ رہا تھا۔

''شاید آپ یقین نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ نادر علی صاحب کے ڈرائنگ روم کے در پر آپ کو ٹھٹکتے دیکھ کر میں خود ٹھٹک گیا تھا اور میں نے اس لمحے خدا سے تمنا کی تھی کہ یارب یہ نازنین مجھے عطا کر دے اور جب پاپا نے بتایا کہ وہ بھائی کے لیے آپ کا انتخاب کر چکے ہیں تو مجھے دھچکا لگا اور میں اندر سے کچھ ٹوٹ سا گیا۔ مگر میں نے خود کو سمجھا لیا۔ مگر اب جس انداز میں آپ مجھے ملی ہیں ایسا میں نے تصور بھی نہ کیا تھا۔ کاش! میرا پیارا بھائی گھر چھوڑ کر نہ جاتا اور کاش پاپا اپنے فیصلے میں اتنے ریجڈ (Reged) نہ ہو جاتے۔ وہ سختی نہ کرتے تو حالات پر قابو رکھا جا سکتا تھا۔ بھائی کو ان کا گوہر

مقصود مل جاتا اور میرا مجھے...... تو یہ گھریوں برباد نہ ہوتا-''اس نے گھونگھٹ چھوڑ دیا اور ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا- پھر بولا-

''کیا آپ ایک لفظ بھی نہ کہیں گی-؟ میں آپ کو پا کر جتنا خوش ہوں اس سے کہیں زیادہ اپنے بھائی کے لیے آزردہ ہوں-''

وہ کسمسائی اور اپنے چہرے تک آئے آنچل کو پیچھے کھسکا کر دھیرے سے بولی-

''مجھے افسوس ہے کہ آپ کے بھائی کو میری وجہ سے گھر چھوڑنا پڑا- میں خود کو مجرم تصور کرتی ہوں- حالانکہ اس میں میرا قطعی کوئی قصور نہیں ہے-''

''ماہین! یہ آپ کی بڑائی ہے ورنہ قصور آپ کا کب میں نے بتایا ہے؟''اور تب اس کے دل میں لگی پھانس شدت سے کھٹکنے لگی اور اس نے اپنی آنکھوں میں امڈتے آنسو ضبط کے آنچل میں جذب کر لیے اور اس نے اپنے آپ سے کہا-

''ناصر علی سید تم کبھی نہ جان سکو گے کہ اصل مجرم واقعتاً میں ہی ہوں- میں نے تمہارے بھائی کو چاہا تھا- اس کی تمنا کی تھی اور اس کے نام کی منظوری دی تھی- اور ناصر علی سید! میں اب تمام عمر اس گھر میں رہوں گی- اس شخص کی بھاوج بن کے جسے میں نے پسند کیا تھا اور جس کے لیے چاہت کی دستک میں نے اپنے دل دروازے پر سنی تھی- اور اس گھر کی ہر ہر چیز مجھے ہمیشہ اس کی یاد دلاتی رہے گی- ناصر علی سید تم اپنے بھائی کو یاد کرو گے- اس کا نام پکارو گے- اس کا تذکرہ کھلے بندوں کرو گے مگر میں...... میں تو کچھ کہہ بھی نہ سکوں گی- میں تو کھل کر اسے یاد بھی نہ کر سکوں گی-''

اور وہ رات...... جوان کی سہاگ رات تھی...... وہ رات ان دونوں نے راشد کی باتیں کر کے گزاری- ناصر کرسی پر بیٹھا سگریٹیں پھونکتا رہا اور ماہین کو اپنے دھیمے دھیمے لہجے میں راشد کی باتیں سناتا رہا- اس کی عادتیں- اس کی محبتیں- بچپن کے قصے- اور ماہین توجہ سے سنتی رہی اور اپنے آنسو پیتی رہی- ناصر اپنے خیالوں میں بہتا رہا- وہ سب کچھ بھولا ہوا تھا- اپنی نئی نویلی دلہن...... اپنی سہاگ رات...... اسے صرف راشد یاد تھا-

''جانے وہ کہاں ہو گا-؟''

تب وہ پلنگ سے اٹھی اور اپنا عروسی جوڑا سنبھالتی ہوئی اس کے برابر جا کھڑی ہوئی-

''کیا آپ لوگوں نے انہیں تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی؟''اس نے اپنا حنائی ہاتھ ناصر کے کندھوں پر آہستہ سے رکھ کر پوچھا-

کیوں نہیں کیا...... بہت کیا...... اخباروں میں اشتہارات بھی دیے-''اس نے ایک آہ بھری-

''کچھ پتہ نہ چلا...... کچھ بھی...... جانے کہاں گیا وہ-''

''ناصر......؟'' ماہین نے اسے پکارا۔

''ماہین۔'' اس نے گردن پھرا کر اس کی سمت دیکھا جو غم کی تصویر بنی اس کے پیچھے کھڑی تھی۔ ناصر نے اپنے کندھے پہ رکھا اس کا مہندی سے رچا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں تھاما اور اسے اپنی سمت کھینچا۔ وہ تیزی سے جھٹکا کھا کر اس کے سامنے پلنگ پہ بیٹھ گئی۔

''کیا ہم ساری زندگی اس بے کیف رات کو یاد کرسکیں گے ماہین؟'' ناصر نے آہستہ سے کہا۔

''یہ رات...... جو گزرتی جا رہی ہے...... ایک انوکھی رات ہے۔ ہم کیسے اس رات کو بھول سکتے ہیں۔ ناصر...... لیکن یہ ہمارے دکھ ہیں...... اور یہ دکھ بھی ہمیں عزیز ہیں کہ یہ ہمارے بہت اپنوں کے دکھ ہیں...... بہت پیاروں کے۔''

''ماہین......!'' وہ کرسی سے اٹھ کر اس کے برابر آ بیٹھا۔

''ناصر...... میں آپ کے دکھ شیئر کروں گی اور آپ کی خوشیاں بھی۔'' ناصر نے وفور جذبات سے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا اور تب مؤذن کی آواز فضاء میں گونجی۔ اللہ اکبر...... اللہ اکبر۔

ناصر نے ماہین کا ہاتھ پکڑا اور کھڑا ہو کر بولا۔

''آؤ ہم مل کر دعا کرتے ہیں راشد بھائی کے لیے۔ ان کی سلامتی کے لیے اور ان کی خوشیوں کے لیے۔''

❖❖❖

دن اور تاریخ' سب اس کے ذہن سے محو ہو چکے تھے۔ کل رات ہی وہ واپس نیچے آیا تھا۔ پچھلی رات اس نے پہاڑ کی چوٹی پر ایک عارضی ہوٹل کے خیمے میں گزاری تھی۔ جہاں تمام رات آگ جلتی رہی تھی اور آگ خود سردی سے ٹھٹھرتی تھی اور گودا اس کی ہڈیوں میں جما جاتا تھا اور نیند پلکوں تک آ کر منجمد ہوتی تھی اور وہ بوسیدہ بستروں کے ڈھیر میں مقامی لوگوں کے ساتھ گٹھڑی بنا لیٹا تھا۔ یا بیٹھا ہوا تھا۔ سوتا تھا یا جاگتا تھا۔ سانس اس کے سینے میں گھٹتا ہوا چلتا تھا اور کھینچ کے لینا پڑتا تھا۔ سطح سمندر سے سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر اسے آکسیجن کی شدید کمی کا احساس ہوتا تھا۔ اس بلند ترین پہاڑ کی چوٹی کا قطر ساٹھ سو مربع میل ہے۔ جہاں اونچے ترین برف سے ڈھکے پہاڑ اس سطح زمین کے برابر ہیں اور یوں لگتا ہے چھلانگ لگا کے ایک چوٹی سے دوسری چوٹی پر آسانی سے پہنچا جا سکتا ہے۔ ہاتھ بڑھا کر بادل پکڑا جا سکتا ہے۔ آسمان ایک سرپوش کی طرح اس زمین پر ڈھکا ہوا تھا۔ ہمالہ کی برف پوش چوٹیاں نگہبانوں کی مانند اس کے اطراف میں پھیلی اپنے جگمگاتے' برفیلے سفید لباس میں چمکتی' آنکھوں کو خیرہ کرتی تھیں اور جن پر پڑتی سورج کی کرنیں مختلف رنگوں کی آمیزش سے قوس قزح کا منظر پیش کرتی تھیں۔ کہیں کہیں سے پگھلی ہوئی برف میں سیاہ دراڑیں جھانکتی تھیں اور پہاڑوں کی ہیبت انسان کے دل میں پیدا کرتی

تھیں- یہ ایسی عجیب زمین تھی جہاں پیروں میں گھاس کی بجائے پھول اگتے تھے اور نہایت خوشنما' حیرت انگیز فرش بچھا تھا- مختلف نوع کے رنگ برنگے پھول- ایسے پھول اس سے پہلے اس نے کبھی نہ دیکھے تھے جن کو اگانے میں انسان کے ہاتھ کی مطلق کاوش نہ تھی- نہ کھاد نہ پانی اور نہ گدائی...... اور بغیر کسی کوشش یا خواہش کے میلوں تک پھولوں کا فرش بچھا تھا- چلتے ہوئے وہ دقت محسوس کرتا تھا- وہ پھولوں کو روندنا نہیں چاہتا تھا مگر پھولوں نے پیر دھرنے کو جگہ ہی نہ چھوڑی تھی اور فضاء انجانی خوشبو سے مہکتی تھی- وہ ایڑیوں اور کبھی پنجوں کے بل اپنے تئیں بچ بچ کے چلتا گیا اور تب اسے پھولوں کے بیچ کسی ننھی سی زندگی کا احساس ہوا- اس نے جھک کر دیکھا- پھولوں کے کنج میں چھوٹا سا گھونسلہ تھا- سوکھے تنکوں اور خشک پتوں سے بنا اور گھونسلے میں دو بچے سسک سسک کر سانس لیتے تھے- بیحد ننھے- تازہ تازہ انڈوں سے نکلے- بال و پر سے آزاد- وہ بالکل نوزائیدہ تھے اور چونچیں کھولے چوگے کے منتظر تھے- فطری جبلت- بھوک- اور چڑیا' ان کی ماں- دال کا دانہ ڈھونڈنے گئی ہوئی تھی- اس نے آہستہ سے گھونسلہ دوبارہ زمین پر پھولوں کے اندر رکھ دیا اور انہیں پھولوں کے تختے پر بیٹھ کر قدرت کا نظارہ کرنے لگا- جہاں وہ بیٹھا تھا اس سے چند گز کے فاصلے پر ہلکے سے نشیب میں دریا بہتا تھا اور مڑتا مڑاتا' بل کھاتا دور تک چلا جاتا تھا- جہاں جا کر وہ بڑے پانی سے ملتا تھا-

یہ دیوسائی تھا- جس کا ذکر اس نے کسی سفرنامے میں پڑھا تھا اور آج اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا- اپنے حواس کے ساتھ محسوس کر رہا تھا اور حیرت زدہ تھا قدرت کی اس بے مثال کاریگری پر- یہاں کی فضاء میں بے نام- انجانے پھولوں کی ایسی خوشبو تھی جسے کسی جانی پہچانی خوشبو سے تشبیہ دینا ممکن نہ تھا- اور ہر سمت لہریں بہتی دریائی سڑکوں کا جال سا بچھا تھا- دریا کا پانی اتنی ہمواری سے بہتا تھا کہ کناروں سے باہر نہ نکلتا تھا اور گزرنے کو راستہ دیتا تھا-

''یہ پانی کناروں تک کیسے محدود ہوا؟ اور اس نے کناروں کا تعین کیونکر کیا؟

وہ حیرت سے بیٹھا سوچتا رہا تھا اور اوپر خدا تھا جو اسے سمجھاتا تھا-

''یہ میرا نظام ہے میں قادر ہوں- یہ وہ طاقت ہے جو میری شہ رگ سے بھی قریب ہے اور مجھے زندہ رکھے ہوئے ہے- توانائی بخشتا ہے- وہ' وہی ہے- جس نے مجھے یہاں تک پہنچایا کہ اس کی قدرت کا اس کی صناعی کا مشاہدہ کر سکوں- ورنہ میرا تو نہ کوئی ارادہ تھا نہ پروگرام- بس اس لمحے میں نے چاہا تھا کہیں نکل جاؤں- کسی دور مقام پر...... کسی ایسی جگہ جہاں کوئی مجھ تک نہ پہنچ سکے- مجھے تلاش نہ کر سکے-'' وہ جانے کب تک یونہی بیٹھا سوچتا رہا- بے ربط خیالات اس کے ذہن میں جالا بنتے تھے- پھر وہ پھولوں کے بستر پر لیٹ گیا- وقت کا احساس اس کے اندر ختم ہو چکا تھا- لیٹے لیٹے وہ شاید سو گیا تھا اور جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے محسوس کیا کہ دن ڈھل رہا ہے- وہ کاہلی سے اٹھا- کپڑوں کو عادتاً جھاڑا

اور واپسی کے سفر پر مڑ گیا۔ مزید آگے جانے کی اس میں ہمت باقی نہ رہی تھی۔ تاریکی گہری ہونے سے پہلے بالا آخر وہ اس عارضی ہوٹل تک پہنچ چکا تھا جہاں شدید سردی سے ٹھٹھرتا مقامی لوگوں کے درمیان گندے مندے بستر کی ایک گٹھڑی میں ڈھیر ہوا پڑا تھا۔ نیند کا غلبہ اس کی آنکھیں بند کرتا تھا اور سردی کی شدت سونے نہیں دیتی تھی۔ اس سوتی جاگتی رات کی صبح بڑی دلکش اور حسین تھی۔ ٹینٹ کی درزوں سے اندر آتی روشنی کی ہلکی سی لکیر سے اس نے جانا کہ صبح ہو رہی ہے۔ کاہلی سے لحاف کے اندر سے اس نے اپنا ہاتھ باہر نکال کر کلائی پہ بندھی گھڑی میں وقت دیکھنا چاہا مگر اندھیرے میں سوئیوں کی سمت دکھائی نہ دے سکی۔ کتنی دیر وہ یونہی ساکت پڑا رہا پھر اس کے کانوں نے پرندوں کی آوازیں سنیں اور وہ آہستہ آہستہ بستر سے باہر نکل آیا۔ اس کے سب ساتھی خیمے میں اوندھے پڑے بے خبر سوتے تھے۔ اس نے پردہ ہٹایا اور خیمے سے باہر آ گیا۔ سورج ابھی سامنے نہیں آیا تھا مگر اس کی سرخی مشرق کی سمت کا تعین کرتی تھی۔ منجمد کر دینے والی ٹھنڈ سے کپکپا کر اس نے اوورکوٹ کے کالر کھڑے کر لیے اور مفلر کو سلیقے سے چہرے اور سر کے گرد لپیٹ لیا۔ صرف اس کی آنکھیں مفلر سے باہر تھیں اور پہاڑ کی اس صبح کا نظارہ کرتی تھیں۔ ارد گرد کوئی اونچا درخت نظر نہ آتا تھا لیکن چڑیوں کی آوازیں اس پہاڑی صحرا میں الوہی گیتوں کی دھن الاپتی تھیں۔

''اس خطے کی چڑیاں بھی یقیناً یہاں کے پھولوں کی طرح مختلف ہوں گی۔ رنگ برنگے پروں اور انوکھی چونچوں والی۔ تب اس نے کھوج کی مگر چڑیاں اسے نظر نہ آ سکیں۔ سورج کا لال طباق پہاڑ کی ایک مشرقی چوٹی پر آ کے ٹک گیا اور اس کی کرنوں سے پہاڑوں پر ٹھہری برف سے رنگوں کی پھوار برسنے لگی۔ اسے معاً خیال آیا۔

''جنت یہی تو ہے اور میں شاید زہریر میں رکھا گیا ہوں..... کیا میں زندہ ہوں یا مر چکا ہوں؟''
اس نے اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو چھوا۔ لمس کے احساس پر وہ ہنسا..... ''اگر یہ جنت نہیں ہے تو پھر جنت کیا ہوگی؟''

اور اسی دن کی سہ پہر کو وہ صد پارہ جھیل کے کنارے تلی ہوئی تازہ مچھلی کھاتے ہوئے دنوں کا حساب کرتا تھا۔

''وہ گھر سے کب نکلا تھا؟'' اس نے ذہن پر زور ڈالا۔

''جانے یہ کونسا مہینہ ہے؟'' تقریباً چار پانچ مہینے سے وہ پہاڑوں، وادیوں اور صحراؤں کی خاک چھانتا پھر رہا تھا۔ تب اس نے عالم تصور میں اس لمحے کو اپنے روبرو پایا۔

وہ اکڑوں امی کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔

''جی امی۔ کہیے۔ کیا کہنا ہے؟''

''ماہین تمہیں کیسی لگی؟'' امی کے ہونٹوں سے لفظ بدقت نکل سکے تھے۔

''مگر مجھ سے آپ یہ کیوں پوچھتی ہیں؟'' اس نے حیران ہو کر کہا تھا۔

''میں تمہارے باپ کا فرمان لے کر آئی ہوں۔'' امی کے کہے جملے اس کے کانوں میں گونجے اور اسے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ اس نے کیا سنا اور کیا کہا۔ وہ دن' وہ دوسری رات کیسے گزری اور پھر وہ اپنی اس جنونی خواہش کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے گھر سے نکل کر دفتر تک آیا تھا۔ جہاں اپنے کمرے میں بیٹھ کر اس نے لمبی چھٹی کے لیے درخواست ٹائپ کروائی تھی اور خود جا کر ایم ڈی سے منظور کرائی تھی۔ انہوں نے درخواست پر دستخط کرتے ہوئے ہنس کر پوچھا تھا۔

''کدھر کا ارادہ ہے مسٹر راشد؟ کیا شادی وادی کا چکر ہے؟''

وہ جواب گول کر گیا تھا۔ پھر اس نے بنک سے معقول رقم نکلوائی تھی اور کتنی دیر بیٹھ کر سوچتا رہا تھا۔'' کہاں جائے؟ اور اس دوران اس نے گھر میں کسی سے کوئی بھی بات نہ کی۔

تب اس کے ذہن میں شمالی علاقہ جات کا خیال آیا۔۔ وہ دیر تک مختلف علاقوں اور شہروں کے بارے میں سوچتا رہا۔ اپنے سامنے میز پر نقشے پھیلا کر وہ انہیں نشان زد کرتا رہا۔ فاصلوں کا تعین کرتا رہا۔ جہاز سے جانے کی بجائے اس نے بذریعہ بس سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ سب سے دور اور دشوار گزار سفر پر روانہ ہونا چاہتا تھا جہاں آسانی سے کسی کا پہنچنا ممکن نہ ہو۔ بس سے جانا اگرچہ بیحد دقت طلب تھا مگر جہاز سے جانے میں خطرہ تھا۔ اس کا سراغ لگایا جا سکتا تھا یا پھر وہ اپنے نام سے سفر نہ کرتا بس اور وہ چاہتا تھا کسی کو پتہ نہ چلے وہ کہاں ہے۔ اس کے دل میں غصہ تھا۔ رنج تھا۔ وہ سب سے ناراض تھا یا شاید وہ خود سے بھی ناراض تھا۔ وہ کس کو سزا دینا چاہتا تھا؟ خود کو؟ پاپا کو؟ وہ جلد از جلد شہر چھوڑ دینا چاہتا تھا۔

تب وہ بس میں سوار ہو کر اسلام آباد پہنچ گیا تھا اور سارا دن ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا تھا اس نے شمالی علاقہ جات کے کچھ کتابچے اور نقشے حاصل کیے اور درمیانہ درجے کے ایک ہوٹل میں قیام کیا اور تب وہ بھول گیا کہ گھر واپس نہ پہنچنے پر کس کس کو کیا کیا تشویش ہوئی ہوگی۔ وہ رات گئے تک ان نقشوں اور کتابچوں میں محو رہا اور اگلی صبح وہ بس میں سوار' لمبے اور نامعلوم سفر پر رواں دواں تھا۔ ایبٹ آباد کو تقریباً چھوتے ہوئے کوسٹر شاہراہ ریشم پر مڑ گئی اور وہ بلندی پر چڑھتے چلے گئے۔ زمین گھائیوں میں ڈھلتی گئی اور پہاڑوں کی بڑی چھوٹی' اونچی نیچی چوٹیاں منظر کو دلکش بناتی سامنے سے گزرتی رہیں۔

تب وہ خالی الذہن اگلی سیٹ پر بیٹھا گزرتے مناظر میں گم رہا۔ وقت۔ زماں و مکاں سب اس کے ذہن سے محو ہو چکے تھے۔ شاید وہ گلگت کے رستے چین جانا چاہتا تھا۔ ابھی تک وہ فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ وہ کہاں جائے گا۔ کہاں قیام کرے گا۔ ایک جذبے۔ ایک ضد یا ایک فرار کی صورت میں سفر میں

تھا- شاید اس نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا-

چٹیل پہاڑوں کے دوسری جانب سڑک کے ساتھ دریائے سندھ بہتا چلا آ رہا تھا- پھنکارتا اور جھاگ اڑاتا- پرشور دریا- دور بہت گہرائی میں- اور دریائے سندھ اپنی ہیبت دلوں میں بٹھاتا تھا اور فاصلے کے باوجود اس کا شور سنائی دیتا تھا- اس کا پاٹ چوڑا تھا اور وہ سنگلاخ چٹانوں سے سر ٹکراتا ہوا بہتا تھا اور مسافروں کے دل میں خوف پیدا کرتا تھا- کوسٹر ایک روانی کے ساتھ موڑ کاٹتی بل کھائے رستے پر چلی جاتی تھی- مانسہرہ' بشام' داسو اور کہیں کہیں نخلستان- بہتے آبشار اور پھر سفر...... سندھ کا پرشور دریا- غصیلہ...... جیسے وہ ناراض ہو اور احتجاج کر رہا ہو- سب کو فنا کر دینا چاہتا ہو اور بڑے بڑے پتھر ٹوٹ ٹوٹ کر دریا میں گرتے تھے جن سے پرشور دریا کا پانی فٹوں کے حساب سے اچھلتا تھا اور پھر کوسٹر گلگت کی جانب مڑ گئی اور بلندی پر چڑھنے لگی-

دوسری جانب سڑک نیچے اترتی چلی گئی تھی اور بل کھاتی پہاڑوں کے بیچ نظروں سے اوجھل ہوتی تھی- یہ سکردو کا رستہ تھا جسے پیچھے چھوڑتے ہوئے اس نے سوچا تھا اور چین جانے کا خیال اس نے ترک کیا تھا- گلگت اور قرب و جوار کے علاقے دیکھنے کے بعد وہ سکردو جائے گا اور اب وہ صرف ایک سیاح تھا- اپنے ماضی سے لاتعلق اور حال سے بے پرواہ- وہ پھرتا رہا- پیدل- جیپوں میں- اور پھر اس کے سامنے ایک عجوبہ آیا- جھیل خلطی ایک عجوبے سے کیا کم تھی؟ وہ نیلگوں شیشہ تھی چمکدار جو آنکھوں کو جھپکنا بھلا دیتی تھی یا آنکھوں میں خواب سجا دیتی تھی اور وہ جھیل ایسی نہ تھی جو کسی انسانی ہاتھ یا کسی انسانی ذہن کی کرشمہ سازی بنتی- پہاڑی جھیلیں تو قدرت کا عطیہ ہوتی ہیں اور وہ ایک بے مثال عطیہ تھی اور قدرت کہتی تھی مجھے پہچانو...... مجھے مانو اور صرف میری پرستش کرو-" وہ جھیل ایسی ہی ایک حیرتناک جھیل تھی جو اپنی حسن کی بے مثال چمک دمک اور رعنائیوں کے ساتھ خوف کا احساس دلاتی تھی اور مقامی لوگوں کی زبان پر ایک کہانی رقص کرتی تھی- وہ کہانی جھیل سیف الملوک سے یکسر مختلف تھی-

وہ ایک گاؤں تھا- شاید خلطی ایک پہاڑی گاؤں' کسی دریا کنارے' گلیشیئر کے ہمسائے میں- کہ ایک طوفان میں پانی کی طغیانی کے ساتھ بڑے بڑے پتھر بھی لڑھکتے آئے جنہوں نے دریا میں گر کر پانی کے بہاؤ کو روک دیا اور پھر پانی بلند ہوتا گیا اور گاؤں ڈوبتا گیا اور وہ گاؤں اب جھیل کی شکل میں نمودار تھا اور وہ سارا کا سارا علاقہ جو کہیں شندور تھا اور کہیں ہرچین تو کسی جگہ یہ چترال ہے اور کہیں یہ مستوج کے نام سے موسوم ہے مگر جو سب کی سب پیلے' سرخ' کاسنی اور نیلے پھولوں سے ڈھکی وادیاں ہیں- یہاں قدم قدم پر آبشار گرتے ہیں اور ندیاں بہتی ہیں- دریا اپنی خاموش مزاجی کے ساتھ بہتے ہیں اور جہاں جا کر انسان بھول جاتا ہے اپنے سب دکھ درد- اپنے تمام غم اور وہ کھو جاتا ہے جنت نما کہساروں میں اور اس کے لیے واپسی کے سب راستے جیسے مسدود ہو جاتے ہیں اور ان وادیوں میں

تاریکی کے ساتھ ہی خاموشی اترتی تھی - ایک بیکراں ہولا دینے والا سناٹا - پھر جیسے دن نکلتا - پرندے چہکتے - پانی کے منجمد قطرے - بوند بوند ٹپکتے اور چڑھتے دن کے ساتھ آبشار بن کر گرنے لگتے - یہ ایک عجیب طلسم تھا اور وہ اس طلسم کدے میں غرقاب جاتے دنوں کو رات اور راتوں کو دن کرتا پھرتا تھا اور جب وہ اس ہوشربا طلسم سے آزاد ہوا تو اس نے خود کو اسلام آباد کی ایک روشن صبح میں پایا -

وہ متعجب ہوا کہ وہ یہاں کیسے پہنچا اور کیوں پہنچا؟ اس نے بے دھیانی سے گھر جانے والے راستے پہ نظر ڈالی اور منہ پھیر کر ایئر پورٹ کی سمت چل دیا - موسم صاف اور نکھرا ہوا تھا چنانچہ جہاز اپنے مقررہ وقت پر روانہ ہو گیا - وہ بدستور شدید طور پر رنجیدہ تھا اور اپنی سیٹ پر روٹھا ہوا سا بیٹھا تھا - کاک پٹ سے اعلان پر بھی وہ اپنے اطراف کے نانگا پربت اور ہمالہ کے حسین' ہیبتناک پہاڑوں کو لاتعلقی سے دیکھتا رہا اور یہ طویل سفر چند منٹوں میں طے کر کے وہ سکردو کے ویران سے ایئر پورٹ پر کھڑا تھا - سکردو...... جسے گلگت جاتے ہوئے اپنے دائیں ہاتھ چھوڑ کر وہ بل کھاتے راستے پر مڑ گیا تھا اور اسے افسوس تھا کہ اس حسین سفر میں وہ تنہا تھا - اکیلا...... جہاز سے کچھ ہی فاصلے پر چمکدار سفید ریت کے اونچے اونچے ٹیلے کھڑے تھے - اتنے بلند کہ اپنی جگہ پہاڑ تھے - ریت کے پہاڑ - ہوا تیز اور سرد تھی اور اس ریتلے میدان میں بھی خوش رنگ پھولوں کی بہتات تھی - وہ قدرت کی صناعی اور فیاضی پر حیران ہوا - ''کیا اللہ تعالیٰ نے سارا حسن' تمام خوبصورتی پہاڑوں کے نام وقف کر دی ہے؟ تب اس کا دل یکبارگی کسی انجانی مسرت سے بھر سا گیا -

•◆•◆•◆•◆•◆•◆•◆•◆•◆•

محسن بھوپالی سے ایک مکالمہ

* میں نے جس طرح زیست کاٹی ہے
ایک دن ہی سہی بسر تو کر

اور

زیست ہمسایے سے مانگا ہوا زیور تو نہیں
ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کھو جانے کا

کے درمیان عرصہ زیست کی سرگذشت کہیے۔

** اس سوال کے جواب کے لیے دفتر درکار ہے۔ مختصراً عرض کروں گا۔ ۴۷-۱۹۴۶ کے دو برس سیاسی اور معاشرتی طور پر اہل ہند پر بہت کڑے گزرے ہیں۔ تقسیم پاک و ہند کے نتیجے میں کروڑوں افراد کے دونئی مملکتوں کے مابین تبادلے تھے۔ اور معاشرتی اتھل پتھل سے کوئی خوش قسمت خاندان ہی بچ رہا ہوگا۔ والد صاحب چونکہ محکمہ ڈاک میں ملازم تھے اور انھوں نے مستقبل میں اپنی سروس کے لیے پاکستان منظور (OPT) کیا تھا چنانچہ ان کا تبادلہ اگست 1947ء میں لاڑکانہ (سندھ) ہوگیا تھا۔ والدین نے میرے تین بھائیوں اور چار بہنوں کے ہمراہ اسی شہر میں سکونت اختیار کی۔ نئی جگہ، نئے لوگ، نئی زبان، رفتہ رفتہ دہلی، یوپی اور سی پی سے بھی سینکڑوں خاندان آ کر بس گئے۔ یوں نئی سماجی زندگی کا آغاز ہوا۔ والد صاحب کی تنخواہ میں اتنے بڑے خاندان کی رہائش، پرورش اور سب بہن بھائیوں کی تعلیم کے سلسلے کو والدین نے جس کفایت شعاری سے جاری رکھا اسے میرا دل جانتا ہے۔ میں نے پری میٹرک اور میٹرک میں اپنی تعلیم کے دوران چوتھی اور پانچویں جماعت کے تین طلباء کو ٹیوشن پر پڑھایا اور ایک سال تک مقامی سنیما میں رات کو بکنگ کلرکی بھی کی۔ میری جدوجہد اور صبر واستقلال قدرت کو پسند آیا۔ میٹرک کا امتحان دینے کے بعد گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران میں مقامی بجلی گھر میں کلرک کی جاب مل گئی۔ آج یہ بات شاید ناقابل یقین سمجھی جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں سندھ حکومت کو الیفائیڈ کلرک کو پچاس روپے مہینے تنخواہ اور نو روپے مہینے مہنگائی

الاؤنس دیا کرتی تھی۔ چند ماہ بعد مجھے اسکالرشپ مل گئی۔ اور مجھے این ای ڈی انجینئرنگ کالج میں ڈپلومہ کلاس میں داخلہ مل گیا۔ بعد میں میں نے اپنا کیریئر بہ حیثیت اوورسیئر اندرون سندھ کے دیہاتوں اور دریائے سندھ کے بندوں پر گزارا۔ زندگی بسر کرنے کی جدوجہد اور اس دوران حاصل ہونے والے بہترین کم اور تلخ تجربات سے زیادہ واسطہ پڑا۔ جس کا اظہار میرے کئی اشعار اور خصوصاً نظم ''مانوس اندھیرا'' میں ہوا ہے۔

* نامساعد حالات کے باوجود رجائی نقطۂ نظر

کیا خبر لو بجھانے والے کو
روشنی تو دیے کے اندر ہے
پا ہی لیں گے منزلیں دشواریوں کے باوجود
کوئی شے راہ طلب میں کوشش پیہم بھی ہے

جبکہ عام تاثر یہی ہے کہ شعر میں تاثیر، درد یاسیت سے جنم لیتی ہے

** ہائی اسکول کے زمانے میں میں لائبریری جایا کرتا تھا۔ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی تحریریں مجھے بہت پسند آتی تھیں تحریک کے بارے میں معلومات حاصل ہونے اور مزید کتابیں پڑھنے کے بعد میں نے ترقی پسند نظریہ کو ہی اپنی تحریروں کا رہنما بنایا۔ معاشرہ کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے کے تخیل کے تحت اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو شاعری میں منتقل کرتا رہا ہوں۔ میں نے تاثیر پیدا کرنے کی شعوری کوشش نہیں کی، بلکہ اپنے تجربات، مشاہدے اور مطالعہ کو اپنی شاعری میں سمونے کی شعوری کوشش کی ہے۔

\- روایتی و کلاسیکی انداز لیے فارسی آمیز، موسیقیت و غنائیت سے لبریز غزلیات کے ہمراہ آپ کے کلام میں جدید تر انداز کا شعر بھی موجود ہے۔ کیا اس کا سبب وقت کے بدلتے تقاضے ہیں۔

** شعری لفظیات ہر پندرہ بیس سال کے بعد بدلتی رہتی ہے۔ جس زمانے میں میں نے شاعری شروع کی۔ اُس زمانے میں فارسی آمیز زبان استعمال کی جاتی تھی اور اساتذہ کی مشہور زمینوں میں غزل کہنا باعث اعزاز سمجھا جاتا رہا۔ اساتذہ کی زمینوں میں طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ بعد کے دور میں نئی زمینوں میں شعر کہنے اور فارسی تراکیب کا استعمال کم سے کم ہوگیا۔ جب کہ موجودہ دور میں اردو کے قوافی و ردیف اور اکثر اضافت اور عطف کے بغیر اشعار کہنے کا رواج عام ہے، چنانچہ اب میں بھی آج کی لفظیات میں شعر کہتا ہوں۔ جس کی مثال آپ کو میرے نئے مجموعوں، روشنی تو دیئے کے اندر ہے، اور منزل کی غزلوں اور نظموں

میں ملے گی۔

* آج کو میں لکھوں گا آج کے مناظر میں
مصلحت کے پردے میں بود و رفت کیا لکھوں
پھر ابھرتے سورج کو مصلحت نے گھیرا ہے
بے گواہ لمحوں کا پھر ہے وقت کیا لکھوں

احتجاج یا مصاعت، تخلیق کار کے لیے، زیست کرنے کے واسطے کون سا رویہ بہتر ہے۔

** اہل قلم کو کسی صورت میں بھی مصلحت سے کام نہیں لینا چاہیے۔ اسے احتجاج کا رویہ ہی اپنانا چاہیے لیکن اسے شعریت کا دامن کسی حال میں نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اس لیے کہ نظم اور اداریتی نوٹ میں فرق ہونا چاہیے۔

* خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعۂ تر کی صورت

آپ بھی کہتے ہیں۔

فکر میں خوب رگِ جاں بھی ملا دیتے ہیں
کوئی مضمون ہو ہم رنگ بنا دیتے ہیں

اور نئی نسل کو مشورہ دیتے ہیں۔

* اب کہاں قدر فن کاغذ پر
مت کلیجہ نکال کر رکھنا

شاید یہی وجہ ہے کہ کوئی شاعر اپنے بیٹے کو شاعر دیکھنا نہیں چاہتا۔

** شاعری کسی بھی شاعر کا معاشی مسئلہ حل نہیں کر سکتی۔ (سوائے گنتی کے چند شعراء کے) ہر شاعر کو اپنی معاشی ضروریات کے لیے، ملازمت یا تجارت کرنا پڑتی ہے۔ اس لیے شعراء بھی اپنی اولاد کے لیے پہلے معاشی مسائل حل کرنے کے لیے، اسے پروفیشنل تعلیم یا تجارت کے لیے تربیت دیتے ہیں۔

* احمد فراز کی مشہور غزل

سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں

اور آپ کی غزل

چمن چمن اسی رنگین قبا کو دیکھتے ہیں
ہر ایک جلوے میں جلوہ نما کو دیکھتے ہیں

ہر دو غزلوں میں سمعی و بصری حواس پوری طرح بیدار ہیں۔ رنگینی و رعنائی، احساسِ جمال، حسن لطافت، موسیقیت و رغنائیت عروج پر ہے۔ ان دونوں غزلوں کے بارے میں آپ کا تاثر کیا ہے۔

** ایک عہد میں سانس لینے والے شاعر ایک دوسرے کو متاثر بھی کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔ مذکورہ غزلوں کے ڈانڈے غالب کی غزل کے مشہور شعر سے ملتے ہیں۔

نظر لگے نہ کہیں تیرے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

میں نے یا دیگر ہم عصروں نے قوافی بدل کر طبع آزمائی کی ہے۔ احمد فراز نے ردیف کے پہلے لفظ ''کو'' کے بجائے ''کے'' استعمال کیا ہے۔ بعض نے فراز کی طرح میں غزلیں کہی ہیں۔ جہاں تک مذکورہ بالا دونوں غزلوں کا تعلق ہے۔ دونوں ہر دو شعراء کی جمالیاتی اپروچ کی مظہر ہیں۔ جس کی داد اساتذۂ فن ہی دے سکتے ہیں۔

وہ کراچی، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہاں پہنچ کر کوئی بھوکا نہیں رہ سکتا، مدتوں زخم زخم رہا۔ آج بھی صورت حال کچھ مختلف نہیں۔ کراچی پر گزرنے والے سانحات کا عکس آپ کے اشعار میں واضح ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کراچی میں رونما ہونے والے واقعات سے پاکستان کے دیگر شہروں میں رہنے والے اہل قلم بے نیاز رہے کیا یہ بات درست ہے۔

** کراچی کا جسم ایک عرصے تک زخموں سے چور چور رہا۔ کراچی کے چند ایک شعراء نے اس دور میں نہ صرف مزاحمتی شاعری کی بلکہ اخبارات و رسائل میں اپنا کلام جرأت کے ساتھ چھپوایا بھی۔ یہ بات واقعی افسوس ناک ہے کہ دیگر بڑے شہروں کے رسائل و اخبارات کے علاوہ شعراء نے بھی اہل کراچی کے المیے کو نہ اس سطح پر محسوس کیا اور نہ ہی اپنی شاعری میں اس کا اظہار کیا۔

* ''جستہ جستہ'' میں شامل قطعات اور نظمانے میں موجود نظم نما افسانے، ان میں ہیت کے علاوہ آپ کیا فرق دیکھتے ہیں۔

** قطعات کسی خاص Event یا احساس کا مظہر ہیں جب کہ نظمانے معاشرے میں پائی جانے والی برائیوں اور غلط بخشیوں اور مجہول رویوں پر منظوم کہانی کے ذریعے ایک بھرپور طنز

ہیں۔ اردو کے سربرآوردہ افسانہ نگار ابوالفضل صدیقی کا کہنا تھا کہ ہر نظمانے پر ایک کامیاب مختصر افسانہ لکھا جاسکتا ہے۔ جس کا اختتام یادر ہنے والی Punch Line پر کیا جاسکتا ہے۔

* شاعری میں تجربے ہوتے رہنے چاہیں 'نظمانے' کے بعد آپ نے شاعری میں کوئی اور نیا انداز اپنایا، کوئی نیا تجربہ کیا۔ کیا اردو شاعری میں نئے تجربے ہور ہے ہیں۔ نظمانے کو آپ کامیاب تجربہ کہیں گے۔ آپ اپنی پیروی میں کن شعراء کے نام لیں گے۔

** نیا تجربہ تو نہیں کیا۔ لیکن جاپانی صنفِ سخن ہائیکو کو پاکستان میں متعارف کرانے کی بھر پور کوشش کی ہے۔ پاکستان کی حد تک میں نے سب سے پہلے ڈاکٹر تنویر عباسی کے سندھی ہائیکو کے منظوم تراجم سے اس کا آغاز کیا تھا۔ یہ تراجم ماہنامہ افکار ستمبر ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئے تھے۔ اس کے بعد ہائیکو کے صحیح فارم Form یعنی ۵۔۷۔۵ کی پابندی کے ساتھ ہائیکو لکھنے کا آغاز کیا جس کا اعتراف پروفیسر احمد علی جیسے نقاد نے کیا تھا۔ (تاثر مطبوعہ گردِ مسافت ۱۹۸۸ء) میرے ہائیکو کے پہلے مجموعے ''منظر پتلی میں'' کی ادبی حلقوں میں ہی نہیں بلکہ بیرونِ ملک بھی پذیرائی ہوئی۔ اس کی بنیاد پر جاپانی فاؤنڈیشن نے ''جاپان کے چار عظیم شاعر'' کے مسودے کو ٹوکیو یونیورسٹی کے ماہرین کی تصدیق کے بعد منظور کیا اور کتاب کی اشاعت کے لیے فاؤنڈیشن نے گرانٹ بھی دی جو ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں جاپانی کے چار عظیم شعراء باشو، ایسا، بوسون اور شیکی کی سوانح اور ان کے منتخب ہائیکو کے اردو تراجم شامل ہیں شاعری میں نئے تجربے ہورہے ہیں۔ مثلاً آزاد غزل، غزل نما وغیرہ لیکن ابھی ان کو پذیرائی نہیں ملی ہے۔ بلاشبہ نظمانے اردو شاعری میں ایک کامیاب تجربہ ہے۔ اسے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، احمد ندیم قاسمی، شان الحق حقی اور شمس الرحمٰن فاروقی جیسے نقادوں نے بھی سراہا ہے۔ (تاثرات مطبوعہ نظمانے) عظیم راہی، غزل جعفری سیما سراج، عارف کمال حمیرا راحت اور دیگر نظمانے لکھ رہے ہیں، لیکن اسے اب تک وہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی جس کی توقع تھی۔

نظمانے ایک نشست میں پڑھی جانے والی کتاب نہیں، ہر موضوع آپ کو گرفت میں لے گا۔ آپ کو سوچنے پر مجبور کر دے گا۔ اس کی تلخی، چبھن محسوس ہوتی رہے گی۔ اس کی پرتیں آپ پر کھلتی جائیں گی اور شاعر نے جس کیفیت میں وہ بات کہی ہوگی، آپ اس منظر نامے کا ایک حصہ بن جائیں گے۔ اس لیے نظمانے، ایک سانس میں پڑھی جانے والی کتاب نہیں، آپ کی کیا رائے ہے۔

** اس کی بعض خصوصیات کا تو آپ نے اپنے سوال میں ہی ذکر کر دیا ہے۔ ہر نظمانہ چونکہ اپنے اندر ایک مکمل افسانہ یا کہانی رکھتا ہے۔ اس لیے قاری بھی لطف اندوز ہوسکتا ہے، جب وہ نظمانہ پڑھے، اس میں ان کہی باتوں کو اپنے تخیل اور تصور کے ذریعے محسوس کرے تب ہی وہ

ایک مکمل تاثر ابھرتا محسوس کرے گا۔

* آپ کی غزلوں اور نظموں کی زبان "نظمانے میں مستعمل زبان سے مختلف ہے۔ روزمرہ اور عام بول چال کی زبان نظمانے کی ضرورت تھی۔ جسے آپ نے ادبی چاشنی اور شعری لطافت سے دور رکھا۔

** یہ بالکل فطری بات ہے اس لیے کہ میں نے نظمانے میں ہر کردار کی زبان اس کے اپنے طبقے اور اس کی فکری استعداد کے مطابق رکھی ہے۔ یہ وہ نزاکتیں ہیں جنہیں ہر اچھا افسانہ نگار ملحوظ رکھتا ہے۔

* زندگی کے تلخ حقائق اور تجربات اور تجربات کو نظم کرنے کے لیے کیا اسی احساسِ جمال اور حسن لطافت کی ضرورت نہیں جو نیم وا آنکھوں اور کھلتے گلابوں کے لیے ضروری ہے۔

** یقیناً ضروری ہے احساسِ لطافت کے ساتھ بیان کے لیے شعری پیرایہ بھی بنیادی حیثیت رکھتا ہے، ورنہ سپاٹ پن کسی بھی فن پارے کو اُس کے مرتبے سے گرادیتا ہے۔

* آپ اپنے شعری سفر سے مطمئن ہیں۔ جو کرنا چاہتے تھے کرلیا، جو کہنا چاہتے تھے کہہ لیا یا ابھی لمحہ' کمال کے منتظر ہیں۔

** بہت حد تک مطمئن ہوں۔ مجھے جو کہنا تھا اور جس پیرائے میں کہنا تھا۔ اسے میں نے کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ نقادوں نے اپنے جائزے میں بہت حد تک میرے کلام اور کام کو نظر انداز کیا ہے۔ لیکن عوامی حیثیت پر جو مقبولیت حاصل ہے اور میرے بعض اشعار کو جو ضرب المثل کا درجہ حاصل ہوا ہے اسے میں اپنے لیے ادبی اعزاز سمجھتا ہوں۔ شکر ہے کہ اس میں میری قسمت کو دخل ہے نہ کہ کوشش کو۔

* آپ کو اپنے عہد کی متنازعہ شخصیت کہا جاتا ہے۔ سبب؟

** اس کا سبب وہی ہے میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند یہ مصرع تو میری فکر اور تخیل کی ترجمانی کرتا ہے۔ جبکہ عملی طور پر نہ کبھی میں نے ذاتی پبلسٹی کی کوشش و خواہش کی اور نہ ہی متعلقہ اداروں کے سربراہوں کی کاسہ لیسی کی خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ پھر بھی میں محرومی کا شکار نہیں ہوں۔

* محسن بھوپالی ایسی شخصیت ہے کہ جسے صرف یہ پتا لگنا چاہیے کہ آپ کسی مسئلے میں گرفتار ہیں۔ وہ بن طلب کیے حاضر ہو جاتے ہیں اور اپنا قیمتی وقت آپ کے مسائل کے حل میں لگا دیتے ہیں۔ دوسرے اہل علم دوستوں کا رویہ، آپ کے اس انداز زیست کے متعلق کیا ہے۔

** میرے اس رویے کو میرے بعض ہم عصر اچھا نہیں سمجھتے اس لیے کہ وہ اسی کام کو بعض اوقات جلب زر کا ذریعہ بھی بنالیا کرتے ہیں۔ لیکن مجھے اپنے ساتھیوں اور نئے لکھنے والوں کے

مسائل حل کر کے واقعی خوشی محسوس ہوتی ہے۔

* کہا جاتا ہے کہ ہائیکو خالص ادبی صنفِ سخن نہیں۔ اول اول یہ عوام کی اور گھریلو خواتین کی صنف سخن کے طور پر مشہور ہوئی۔ پاکستان میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور روزِ اول سے ہی اسے ادبی صنفِ سخن شمار کیا گیا۔ اس کی وجہ کیا ہے۔۔۔؟

** جاپانی انسائیکلو پیڈیا کو دنشا کے مطابق ہائیکو شروع شروع میں چھیڑ چھاڑ اور غیر سنجیدہ گفتگو کے لیے استعمال کی جاتی تھی، لیکن سترھویں صدی میں باشو نے اسے باقاعدہ سنجیدہ صنفِ سخن کے طور پر استعمال کیا اور اس کے بعد دیگر جاپانی شعرا نے اس کی پیروی کی۔ پاکستان میں اسے واقعی حیرت انگیز طور پر مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ تقریباً چھبیس ستائیس ہائیکو مجموعے صرف بیس برسوں کے اندر شائع ہو چکے ہیں۔ تمام اہم ادبی رسائل اور اخبارات کے ادبی صفحوں پر ہائیکو شائع ہو رہے ہیں۔ اردو کے اہم سینئرز اور ان کے بعد کے معروف شعراء بھی مسلسل ہائیکو لکھ رہے ہیں۔ جن میں تابش دہلوی، شبنم رومانی، رسا چغتائی، حمایت علی شاعر، پروفیسر محمد امین، اختر شمار، لیاقت علی عاصم، وضاحت نسیم، فراست رضوی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

* ہائیکو کی مقبولیت کا ایک سبب کیا یہ نہیں ہے کہ جاپان کا قونصل خانہ گزشتہ بیس پچیس برسوں سے ہائیکو مشاعرے نہ صرف منعقد کرا رہا ہے، بلکہ مشاعرے میں پڑھے جانے والے ہائیکو کتابی صورت میں محفوظ بھی کر رہا ہے یوں اپنی ایک صنف سخن کے فروغ میں جاپانی سفارت خانہ مثبت کردار ادا کر رہا ہے...... آپ بیرون ملک جاتے رہتے ہیں پاکستانی سفارت خانہ اور سفارت کار اپنے ملک کی تہذیب و ثقافت خصوصاً زبان و ادب کے فروغ میں جو ''خدمات'' انجام دے رہے ہیں۔ کیا وہ کافی ہیں۔

** ایک سبب یہ بھی ہے جو آپ نے بیان کیا۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے بیرون ملک ہمارے سفارت خانے اور سُفراء پاکستانی ادب کے متعارف کرانے میں کوئی کام نہیں کر رہے، بلکہ عام طور پر دیکھا گیا ہے پاکستانی سفیر مشاعروں میں شرکت تک نہیں کرتے جبکہ بھارتی سفیر اور قونصل جنرل صاحب نہ صرف شاعروں سے ملتے ہیں بلکہ ادبی محفلوں میں شرکت بھی کرتے ہیں۔

* آپ کا بے حد شکریہ

** شکریہ

ادب اور امن

اس وقت مجھے نامور سنگھ جی یاد آ رہے ہیں۔ نامور سنگھ ہندی کے مشہور لیکھک ہیں۔ پچھلے دنوں وہ پاکستان آئے تھے تو انہوں نے پاکستانی اور ہندوستانی ادب کی مشترکہ میراث پر کوئی آدھ گھنٹے بات کی تھی اور یہ مشترکہ میراث ہے صوفیوں اور سنتوں کی میراث۔ وہ صوفی سنت جو شاعر بھی تھے اور اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ ہمارے اکثر صوفی سنت شاعر تھے کہ انسان ہی نہیں ہر جیو جنتو اور ہر ذی حیات بلکہ تمام مظاہر قدرت سے پیار کے اظہار کا بہترین وسیلہ شاعری ہی ہے۔ میں یہاں نامور سنگھ جی کی باتیں تو نہیں دہرا سکتا کہ میں نہ انکے جیسا ودوان ہوں اور نہ میرے پاس وہ زبان اور وہ انداز ہے کہ میں جو بھی کہوں سننے والے کے دل میں اترتا چلا جائے۔ ہاں' ان کی باتیں اور ان کی میٹھی زبان میرے بھی دل میں ایسی اتری تھیں کہ اب تک میں انہیں یاد کرتا ہوں۔ انہوں نے ہمارے ادب اور ہماری شاعری کی پوری تاریخ کو ویدانتک فلاسفی' بھگتی تحریک اور صوفیوں سنتوں کی روایات کے حوالے سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی تھی اور یہ ہمارا ادب کسی ایک زبان کا نہیں تھا۔ انہوں نے سنسکرت سے لے کر ہندی اردو جنوبی تمام زبانوں کے ادب کا احاطہ کیا تھا۔ یہ صوفی سنت کون تھے؟ اور ان کی روایت اور ان کی پرم پرا کیا تھی؟ ان کی روایت تھی پیار روایت ہے۔ سب سے پیار سب سے محبت۔ سارے سنسار اور اس میں بسنے والی ساری جیو جنتوؤں کے لیے سد بھاؤنا۔ اور یہ سد بھاؤنا اور یہ پیار کیسے کیا جاتا ہے؟ اپنی ذات کی نفی کر کے۔ اپنی ذات کی نفی' اپنی ذات کا انکار جسے ہندی میں نکارنا' پرتیواد یا کھنڈن بھی کہتے ہیں۔ اس انکار کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ دوسروں کی اچھائیوں پر نظر رکھو اور اپنی برائیاں اپنے سامنے رکھو۔ یہی طریقہ ہے دوسروں سے محبت کرنے کا۔

بھگت کبیر اس دنیا اور اس کے باسیوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں اور پھر اپنے آپ کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں۔

برا جو دیکھن میں چلا برا نہ ملیا کوئی
جو دل کھو جو آپنا' مجھ سے برا نہ کوئی

ساری برائیاں اپنے ہی اندر دیکھنے کا مطلب کیا ہے؟ یہی نا کہ ہم برے ہیں۔ دوسرے ہم سے

اچھے ہیں اور چونکہ وہ ہم سے اچھے ہیں اس لیے ان کے ساتھ پیار ہی کیا جا سکتا ہے۔ نفرت نہیں کی جا سکتی۔ یہ ہمارے شاعر تو اپنے دشمن کو بھی برا نہیں کہتے۔ اس کے بارے میں بھی اچھے خیالات ہی رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ دنیا کی بے ثباتی کا ذکر بھی کرتے ہیں تو اس انداز میں کہ دشمن سے بھی محبت کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ چنانچہ میاں محمد کہتے ہیں......

دشمن مرے تو خوشی نہ کریئے، سجناں وی مر جانا

اور ہاں، گرونانک کا یہ قول تو ہم سب جانتے ہی ہیں۔

من جیتا جگ جیتو

اور ہمارا فارسی کا شاعر کہتا ہے۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است

یعنی اگر آپ نے کسی کا دل رکھا کسی کے ساتھ ہمدردی کی، کسی کی مدد کی تو گویا آپ نے حج کر لیا اور حج بھی کیسا؟ حج اکبر۔ کسی بھی مسلمان سے پوچھ لیجیے۔ وہ آپ کو بتائے گا کہ حج اکبر کا کتنا ثواب ہے۔ عام حج سے ہزاروں گنا زیادہ ثواب ہے حج اکبر کا۔ اور شاعر یہ پیغام دے رہا ہے کہ کسی بھی انسان کا دل رکھ کر اس سے پیار کر کے آپ اس حج کا ثواب حاصل کر سکتے ہیں۔

اب اگر میں یہ کہوں کہ ہمارے صوفی سنت اور اولیاء اللہ اپنے اپنے انداز میں سیکولر تھے تو شاید کچھ لوگ مجھ سے ناراض ہو جائیں۔ لیکن اگر سیکولرازم کو اس کے صحیح معنی میں دیکھا جائے تو میری بات سمجھ میں آ سکتی ہے۔ سیکولرازم کا مطلب ہرگز مذہب سے بیزاری نہیں ہے۔ جو لوگ اس کا ترجمہ لادینی کرتے ہیں وہ دراصل ہمیں گمراہ کرتے ہیں۔ سیکولرز کا مطلب ہے حکومت کا مذہبی معاملات میں دخل نہ دینا اور تمام عقائد کا احترام کرنا۔ یعنی ہر مذہب اور ہر عقیدے کی آزادی اور ہمارے صوفیاء بھی تو اسی کی تلقین کرتے تھے اور آج بھی اسی کی تلقین کرتے ہیں۔ سب سے محبت اور کسی سے دشمنی نہیں۔ یہی سیکولرازم ہے اور یہی تصوف۔ آپ میری بات نہ مانیے صرف اتنی زحمت گوارا فرما لیجیے کہ ہمارے تاریخ میں جتنے بھی صوفی اور ولی اللہ گزرے ہیں ان کی زندگی پر نظر ڈال لیجیے اور یہ دیکھ لیجیے کہ یہی صوفیائے کرام ہیں جن کی بدولت اس خطے میں اسلام پھیلا اور حق کا بول بالا ہوا۔

اب آپ اپنے شاعروں پر بھی نظر ڈال لیجیے۔ دیکھیے ہمارے جتنے بھی شاعر گزرے ہیں اگر وہ صوفی سنت نہیں بھی تھے تو ان کے اندر بھکتی اور تصوف کی ایک لہر، ایک لکیر یا ایک Sreak ضرور موجود تھی۔ بھوبھوتی اور کالیداس سے امیر خسرو اور پھر غالب تک بہت سے ایسے شاعر بھی تھے تصوف جن کی شاعری کا غالب رجحان نہیں ہے۔ لیکن انسان اور انسانیت سے محبت ہی ان کی شاعری کو بھی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ آپ امیر خسرو کو اس اعتبار سے تصوف کی شاخ سے ہی وابستہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے

پیر و مرشد کے اتنے متوالے تھے کہ ان پر اپنی جان ہی نچھاور کردی۔ لیکن ان کی شاعری بہر حال سیکولر شاعری ہے۔ البتہ سورداس، والمیکی، تلسی داس، میرا بائی اور کبیر کے ساتھ ایک لمبا سلسلہ ہے ہمارے ان شاعروں کا جو خود بھی سنت اور صوفی تھے۔ گرونانک، بابا فریدالدین گنج شکر، شاہ حسین، وارث شاہ، بلھے شاہ، میاں محمد اور خواجہ غلام فرید یہ سب صوفی سنت اور فقیر تھے اور تو اور ہمارے فیض صاحب میں بھی صوفیا کا یہ وصف اس حد تک موجود تھا کہ کبھی کسی نے ان کی زبان سے کسی کی برائی نہیں سنی۔ اگر کوئی ان کے سامنے کہتا بھی کہ فلاں شخص آپ کے بارے میں یہ کہہ رہا تھا تو وہ ہنس کر ٹال دیتے۔ یہی صوفیانہ یا شاعرانہ وصف ہے جو ہمارے تمام شاعروں میں موجود رہا ہے۔ یہ سب انسان اور انسانیت کی بھلائی چاہتے ہیں۔ وہ اس دنیا میں امن و شانتی چاہتے ہیں۔ انہوں نے اپنا یہ پیغام عام آدمی تک پہنچانے کے لیے شاعری کا سہارا لیا۔

یہاں میں آپ کی توجہ ایک اور بات کی طرف بھی مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ آپ نے کبھی غور کیا کہ انسانی سماج، انسانی زندگی اور انسانی رشتوں کے بارے میں ہمارا رویہ مغرب سے خاصہ مختلف ہے۔ ہماری دیو مالائیں۔ ہماری گاتھائیں اور ہماری پرانی داستانیں اور قصے کہانیاں بہت کم ایسی ہیں جو فراق و چھوڑے یا ٹریجیڈی پر ختم ہوتی ہیں۔ یہ ہمیشہ امید اور ملاپ پر ختم ہوتی ہیں۔ چاہے یہ ملاپ اس دنیا میں ہو یا دوسری دنیا میں۔ ہمارے ہاں گریک ٹریجیڈیز جیسی کہانیاں نہیں لکھی گئیں۔ ہماری ہر کہانی Optimistic Note پر ختم ہوتی ہے۔ آخر میں ہمارا ہیرو اپنی مراد پا لیتا ہے اور ہیرو ہیروئین کا ملاپ ہو جاتا ہے۔ ہمارا ادب یعنی مشرق کا ادب، جس میں سنسکرت، عربی، فارسی اور ہندی اردو سارا ہی ادب شامل ہے۔ میل ملاپ کا ادب ہے۔ رجائیت اور آشاواد کا ادب ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ادب کے ذریعہ نفرت اور دشمنی نہیں پھیلائی جا سکتی۔ ہاں وہ ادب بھی ادب ہی کہلاتا ہے جس کے ذریعہ نفرت پھیلائی جاتی ہے۔ یہ Hate Literature کسی بھی زبان اور کسی بھی ملک میں لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کا اثر کچھ دیر ہی رہتا۔ نعرے بازی کا یہ ادب زیادہ دیر زندہ نہیں رہتا اور اسے ادب کی دنیا میں دوامی یا استھائی مقام حاصل نہیں ہوتا۔ دوام حاصل ہوتا ہے اس ادب کو جو امن، شانتی، پیار محبت اور بھائی چارے کا ادب ہوتا ہے۔ آج بھی ہم یاد کرتے ہیں تو ان ادیبوں اور شاعروں کو جنہوں نے انسان دوستی اور امن و شانتی کا پیغام ہم تک پہنچایا۔

اب شاید یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں ہے کہ ہمارے آج کے لکھاریوں کو بھی اپنے پرکھوں کی روایت پر عمل کرنا چاہیے کہ یہ ہمارے سامنے کی بات ہے کہ ادب ہی ایک ایسا ذریعہ اور ایسا مادھیم ہے جو روٹھے ہووٴں کو بھی منا سکتا ہے۔ ہم ادب کے ذریعہ ہی ایک دوسرے کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور اسی کے ذریعہ ہم ٹوٹے رشتے جوڑ سکتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ انتہائی خوشی کی بات ہے کہ پچھلے دس

پندرہ سال سے پاکستان میں ہندوستان کی مختلف زبانوں کی کہانیوں کے ترجمے ہو رہے ہیں اور یہ ترجمے صرف انگریزی اور کسی دوسری زبان کے واسطے سے نہیں ہو رہے ہیں بلکہ اب وہ ہندی ادب ہے یا پنجابی ادب۔ یہ ترجمے براہ راست اصل زبان سے ہو رہے ہیں۔ یہی حال ہندوستان میں ہے۔ پاکستان کی مختلف زبانوں میں لکھا جانے والا ادب وہاں ہندی اور دوسری زبانوں میں برابر ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو جتنا پڑھ رہے ہیں اتنا ہی ہمارا شوق بڑھتا جا رہا ہے۔ یہی طریقہ ہے ایک دوسرے کو سمجھنے کا اور یہی راستہ ہے امن اور شانتی کا۔

اب مجھے ہندی کے مشہور شاعر پر مانند شری واستو کی ایک نظم یاد آ رہی ہے۔ میں اس کی چند مصرع آپ کو بھی سنانا چاہتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں۔

اب ایک بار وہ پھر کھوجتا ہے
تاروں میں ماں کا چہرہ
دیکھتا ہے وہ کہ ایک ذرا سے دھبے میں
سکڑی بیٹھی ہے ماں
اپنی گرہستی کا
آخری دم خم بچائے
اتنے چھوٹے سے تارے میں
وہی سما سکتی ہے

یہاں ماں صرف شاعر کی ماں نہیں ہے۔ سب کی ماں ہے۔ انسان کی ماں' انسانیت کی ماں۔ وہ جننی جس نے سب کو جنا ہے۔ اس ماں کے لیے کتنا آدر اور کتنا پیار ہے شاعر کے دل میں۔ اب آپ ہی بتائیے جو شاعر ماں کو یعنی جننی کو اتنا اونچا درجہ اور بلند مقام دے رہا ہے بھلا وہ کسی سے نفرت کیسے کر سکتا ہے۔ اس کے دل میں تو پیار ہی پیار اور محبت ہی ہونا چاہیے۔

اب میں آپ کو ایک اور بات بھی یاد دلانا چاہتا ہوں۔ یہ بات ایسی ہے جس سے ہمارے دلوں میں ایک دوسرے سے نفرت پیدا ہوئی ہے۔ میرا اشارہ تاریخ یا اتہاس کی طرف ہے۔ آج ہم ہندوستان اور پاکستان کے بیچ دوستی اور بھائی چارے کی بات کر رہے ہیں اور یہ بات آگے بھی بڑھ رہی ہے۔ لیکن پچھلے پچاس اٹھاون برس میں ہم نے اپنے بچوں کو جو تاریخ پڑھائی ہے وہ ہمارے راستے کی رکاوٹ بن رہی ہے اور اگر ابھی ہم نے کچھ نہیں کیا تو یہ اسی طرح رکاوٹ بنتی رہے گی...... پہلے تو انگریزوں نے ہی ہمارے ساتھ ظلم کیا تھا کہ اس خطے کی تاریخ کو ہندو اور مسلم ادوار میں تقسیم کر دیا تھا۔ لیکن آزادی کے بعد دونوں ملکوں نے اس سے بھی آگے قدم بڑھایا اور اسکولوں اور کالجوں کے کورس

کے ذریعہ اس کھاڑی یا خلیج کو اور بھی گہرا کر دیا۔ چنانچہ دونوں ملکوں میں مذہبی بنیاد پرست یا کٹر پنتھی طاقتوں کو جو پنپنے کا موقع ملا ہے وہ ہمارے تعلیمی اداروں کے اسی کورس کی وجہ سے ہے۔ ہندوستان میں ہندوتوا اور پاکستان میں جہادی گروہوں کا اثر تو آج کی بات ہے تاریخ کو مسخ کرنے کا کام تو بہت زمانے سے جاری ہے۔ آج جو لوگ دونوں ملکوں کے درمیان امن وشانتی اور دوستی و بھائی چارے کے لیے کوششیں کر رہے ہیں انہیں سب سے پہلے تاریخ کی ان کتابوں پر توجہ دینا چاہیے جو ہمارے ہاں معاشرتی علوم کے نام پر اور ہندوستان میں کسی اور نام سے بچوں کو پڑھائی جا رہی ہیں۔

اب آخر میں مجھے 1940ء کا آخر اور 1950ء کا شروع یاد آ رہا ہے۔ دوسری بڑی جنگ نئی نئی ختم ہوئی تھی۔ ایٹم بم نے جاپان میں جو تباہی مچائی تھی اس کی یاد ابھی تازہ تھی۔ چونکہ دنیا کی دو بڑی طاقتوں کے درمیان نفرت اور دشمنی بڑھ رہی تھی اور خطرہ تھا کہ کہیں ایک اور جنگ نہ شروع ہو جائے...... اس لیے ان دنوں ساری دنیا میں امن کی تحریکیں چلائی جا رہی تھیں اور ان تحریکوں میں ادیب ہی آگے آگے تھے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ آج بھی پاکستان اور ہندوستان کے درمیان امن اور دوستی کا راستہ ہموار کرنے میں دونوں ملکوں کے ادیب ہی سب سے آگے ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ایک طرف تو امن وشانتی کی باتیں ہو رہی ہیں اور دوسری طرف دونوں ملک ہتھیاروں کی دوڑ میں بھی لگے ہوئے ہیں۔ ایک راکٹ چھوڑتا ہے تو دوسرا اس سے بڑا میزائل چھوڑ دیتا ہے ایک ایٹم بم کا تجربہ کرتا ہے تو دوسرا دو تین ایٹم بموں کے تجربے کر ڈالتا ہے۔ ہتھیار بندی کی اس دوڑ پر اربوں کھربوں روپے خرچ ہو رہے ہیں۔ اب ہم لاکھ کہتے رہیں کہ یہ ہتھیار پڑوسی ملک کے لیے نہیں ہیں لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ ان کا نشانہ پڑوسی ملک ہی ہیں۔ میرا سوال دونوں ملکوں کے ادیبوں اور شاعروں سے یہ ہے کہ کیا ہم چالیس کی دہائی کی طرح آج بھی اس ہتھیار بندی کے خلاف تحریک نہیں چلا سکتے؟ یہ کھربوں روپیہ جو ہتھیاروں پر خرچ کیا جا رہا ہے غریب عوام کا ہے۔ اس سے لاکھوں کروڑوں بھوکوں کا پیٹ بھرا جا سکتا ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان امن اسی وقت ہی قائم ہوگا جب ہم ہتھیاروں کی یہ دوڑ ختم کرا دیں گے اور یہ کام دونوں ملکوں کے ادیب ہی کر سکتے ہیں کہ وہ عام آدمی کی سوچ بدلنے کی طاقت رکھتے ہیں......

(عالمی پنجابی کانگریس کے اجلاس میں پڑھا گیا)

☆......☆......☆

غالب میموریل ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام

غالبیات کے باب میں نئے منصوبے

غالب
میموریل
ٹرسٹ

نئی ضروریات

- غالب کے کل فارسی کلام کے ترجمے اور شرحیں لکھوائی جائیں گی۔
- سہ ماہی جریدے کا اجراء۔
- غالب کے معاصرین، متعلقین اور تلامذہ کی توضیحی فہرست مرتب کی جائے گی۔
- عالمی سطح پر ہونے والے غالب پر کام کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ۔
- غالب کے انگریزی تراجم کا لسانی تنقیدی مطالعہ۔
- نوادرات غالب کی جمع آوری اور غالب میوزیم کا قیام۔
- پاکستان کی علاقائی زبانوں میں کلام غالب کے تراجم کا اہتمام۔
- غالب کے نثری وشعری متون کی صحت کے ساتھ اشاعت۔
- کالج اور یونیورسٹی کے طلباء وطالبات اور غالب سے عمومی دلچسپی رکھنے والوں کیلئے کلام غالب کی تسہیل۔
- اشارات وتلمیحات غالب کی کئی جلدوں میں تیاری اور فراہمی۔
- انٹرنیٹ پر غالب کے فن، کلام، زندگی اور کتب پر ویب سائیٹ کا قیام اور غالب ونڈوز پر فراہمی۔
- سی ڈیز پر غالب کے بارے میں پاکستانی اور ہندوستانی فلموں کی منتقلی، تمام ٹی وی اور تھیٹر ڈراموں کی ریکارڈنگ حاصل کر کے سی ڈی پر منتقل کرنا۔
- دلچسپی رکھنے والے غالب دوستوں کو غالب پر کمپیوٹرائزڈ مواد کی مناسب نرخوں پر فراہمی اور بین الاقوامی سطح پر مواد کی منتقلی۔
- غالب کے حوالے سے اہم دنوں کی روشنی میں ٹی وی پر خصوصی پروگراموں کا اجراء۔
- غالب کی نمائندہ غزلوں کو جدید انداز میں ریکارڈ اور عکس بند کر کے تجارتی بنیادوں پر تیار کرنا۔

تسلیم احمد تصور بانی وچیئرمین

غالب میموریل ٹرسٹ

رجسٹرڈ آفس: 6/A نصیر الدین روڈ، اسلام پورہ، لاہور۔ فون: 7226970

Email: ghalibtrust@yahoo.com

غالب دوستوں کے اعزاز میں

غالب میموریل ٹرسٹ کے چیئرمین تسلیم احمد تصور نے 28 ستمبر 2005ء کو لاہور جم خانہ میں غالب دوستوں کے اعزاز میں عشائیے کا اہتمام کیا۔ مہمانانِ گرامی میں ڈاکٹر مبشر حسن صدر پاک انڈیا پیس فورم، بیگم بشریٰ رحمٰن رکن قومی اسمبلی، ابوسعید احسن اصلاحی سابق صدر نیشنل بنک آف پاکستان، طاہر علی زیدی رکن پنجاب سروس کمیشن، تسنیم پیرزادہ ڈائریکٹر رفیع پیر تھیٹر، ڈاکٹر محمد شفیق صوبائی وزیر ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن، میاں عبدالستار نجم سابق ایڈووکیٹ جنرل پنجاب، شفقت علی شیخ رکن پنجاب سروس کمیشن، حسین احمد شیرازی ڈائریکٹر جنرل ہائیر ٹیکس پیئر زیونٹ، مصدق حسین اسد، محمد ابراہیم رامے، ضیاء اکرام، شجاع شیرازی اور ممتاز مصور و دانشور محمد حنیف رامے شامل تھے۔
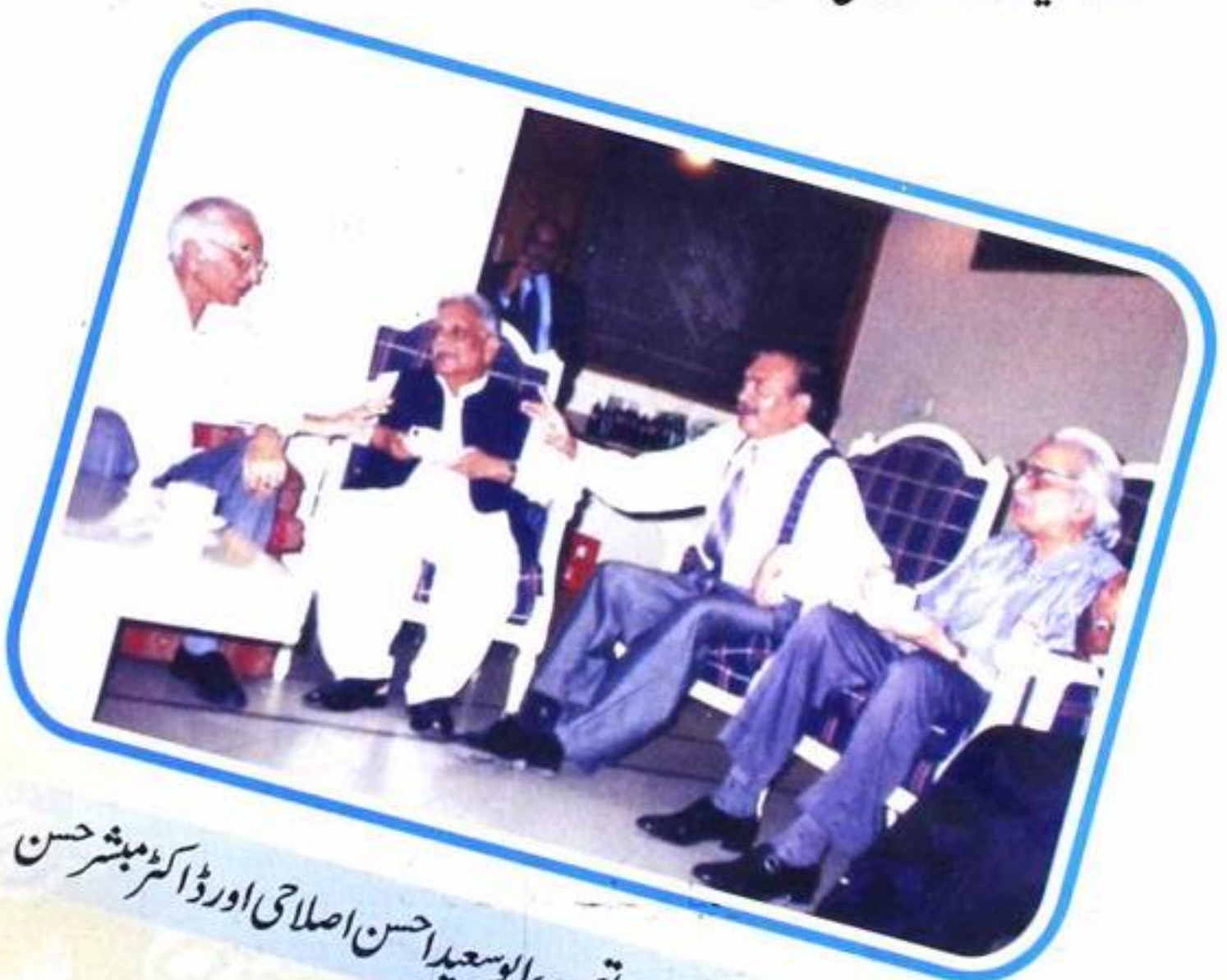
محمد حنیف رامے، تسلیم احمد تصور، ابوسعید احسن اصلاحی اور ڈاکٹر مبشر حسن

ضیاء اکرام اور تسلیم احمد تصور
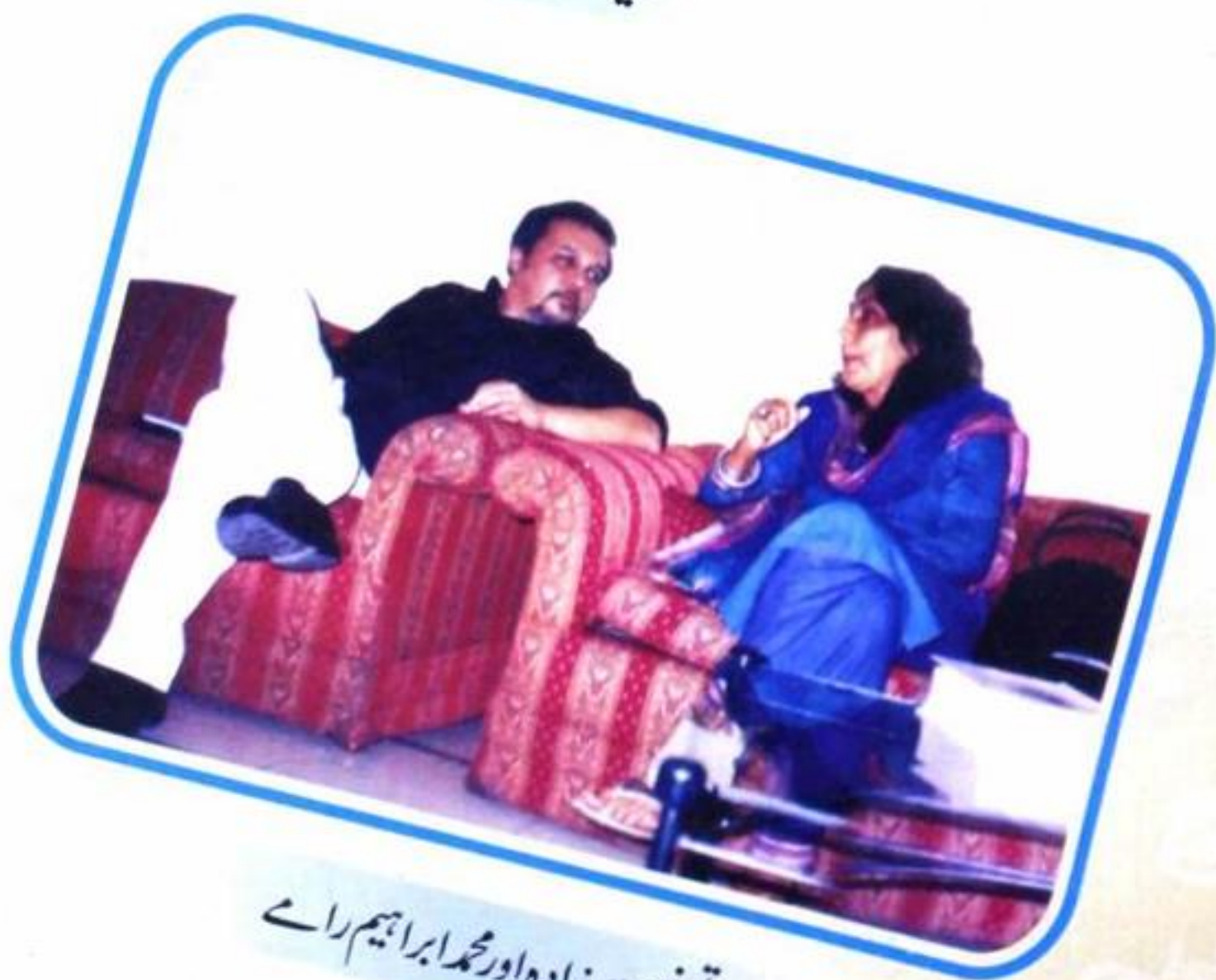
تسنیم پیرزادہ اور محمد ابراہیم رائے

ابوسعید احسن اصلاحی اور ڈاکٹر مبشر حسن
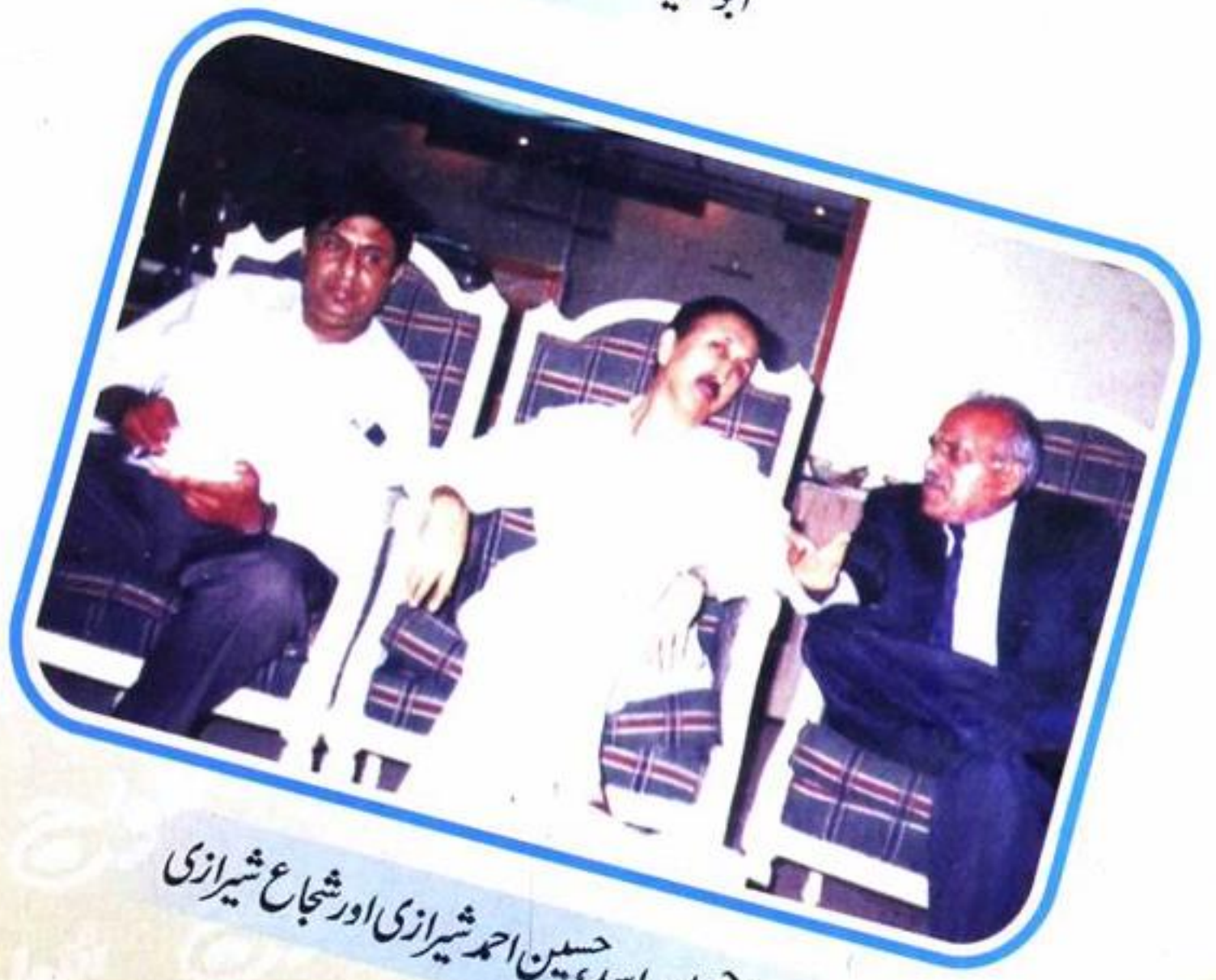
مصدق حسین اسد، حسین احمد شیرازی اور شجاع شیرازی

ڈاکٹر محمد شفیق، شفقت علی شیخ اور علی طاہر زیدی
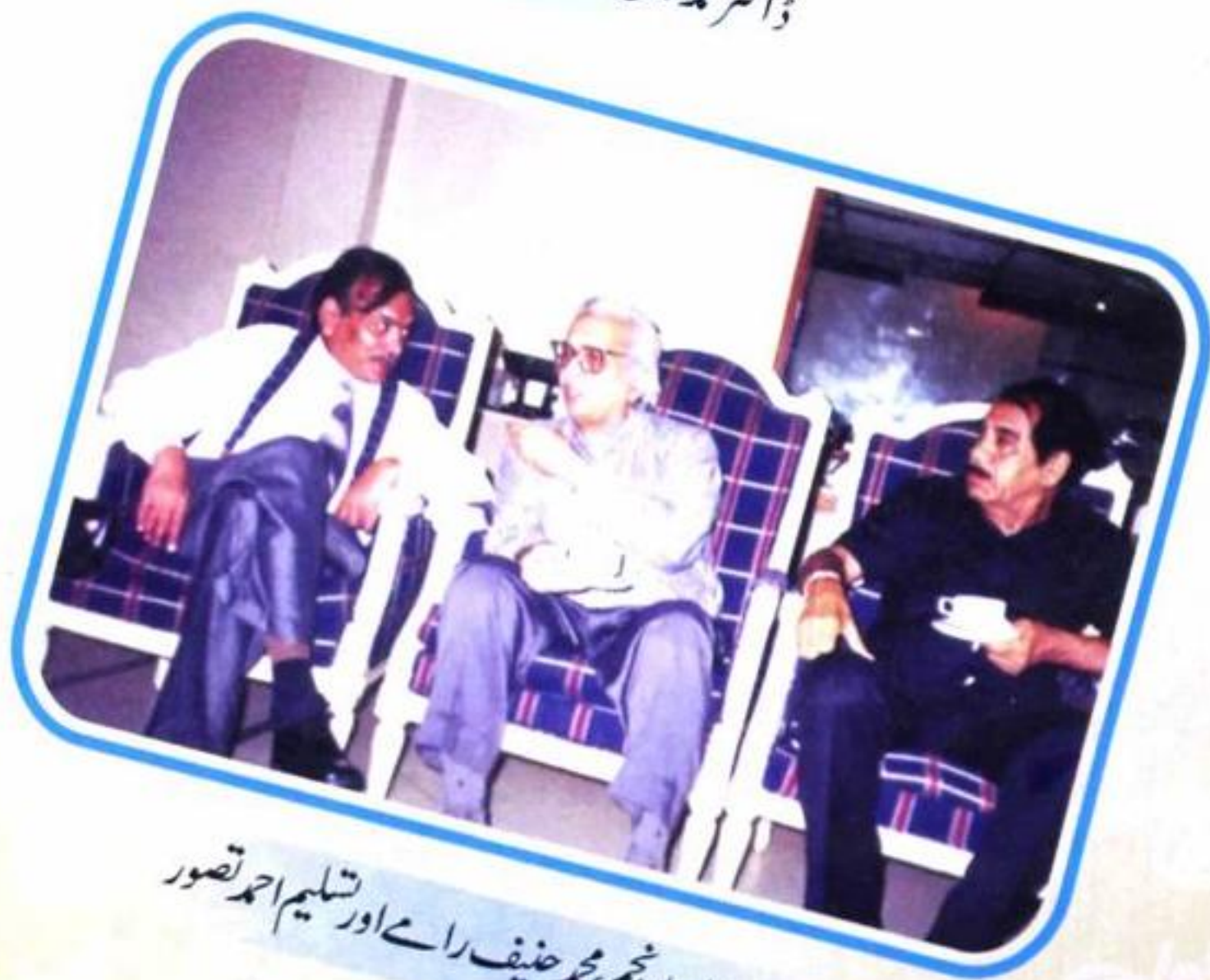
میاں عبدالستار نجم، محمد حنیف رامے اور تسلیم احمد تصور

اختر حیات

محمد ظہیر

ڈاکٹر سیفی سرونجی، بھارت

مقصود الٰہی شیخ، بریڈفورڈ

ناصر شہزاد

عادل ندیم

عازم گروندر سنگھ کوہلی، نئی دہلی

ترنم ریاض، نئی دہلی

تسلیم احمد تصور، ڈاکٹر کیول دھیر اور گلزار جاوید
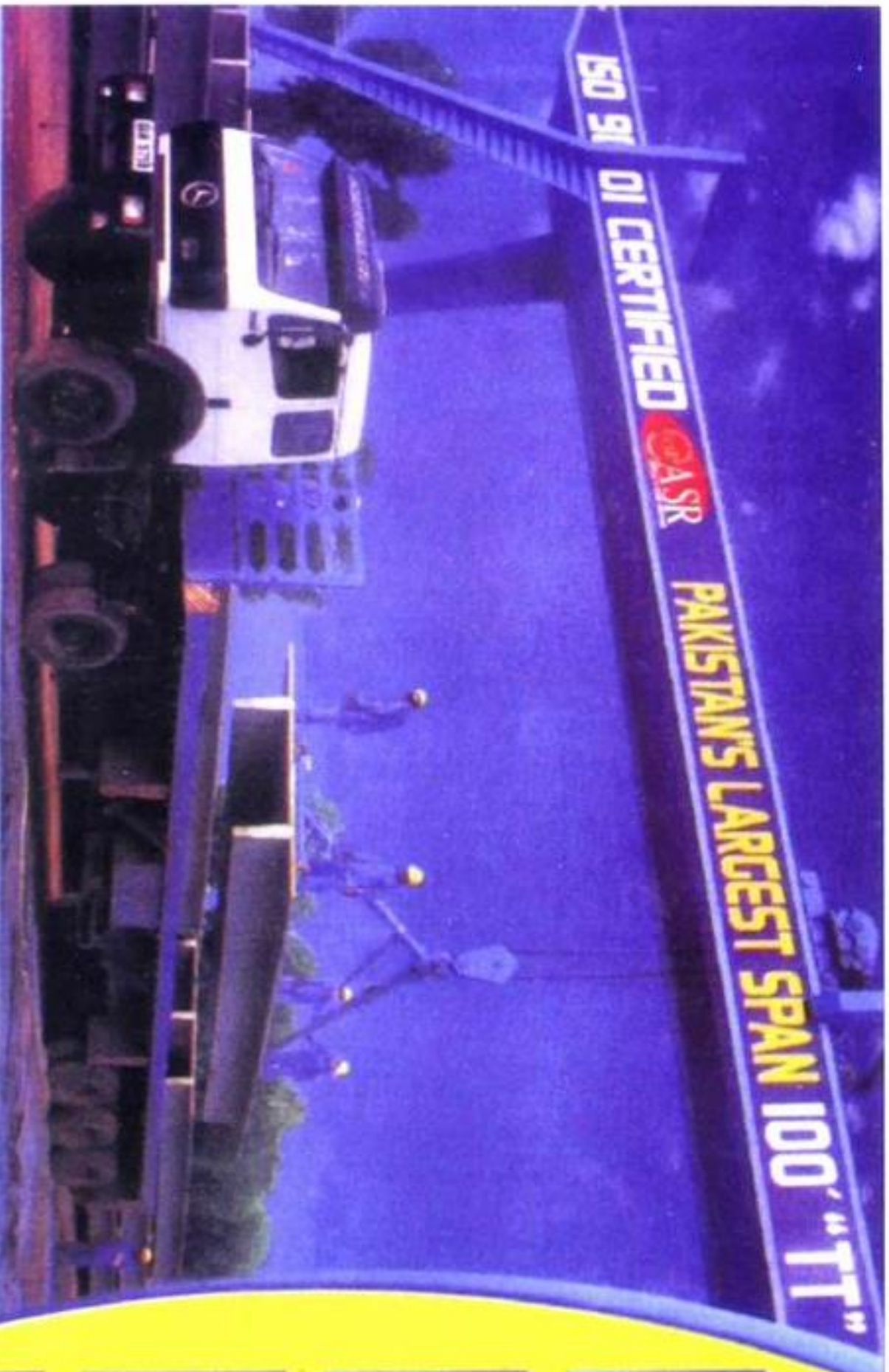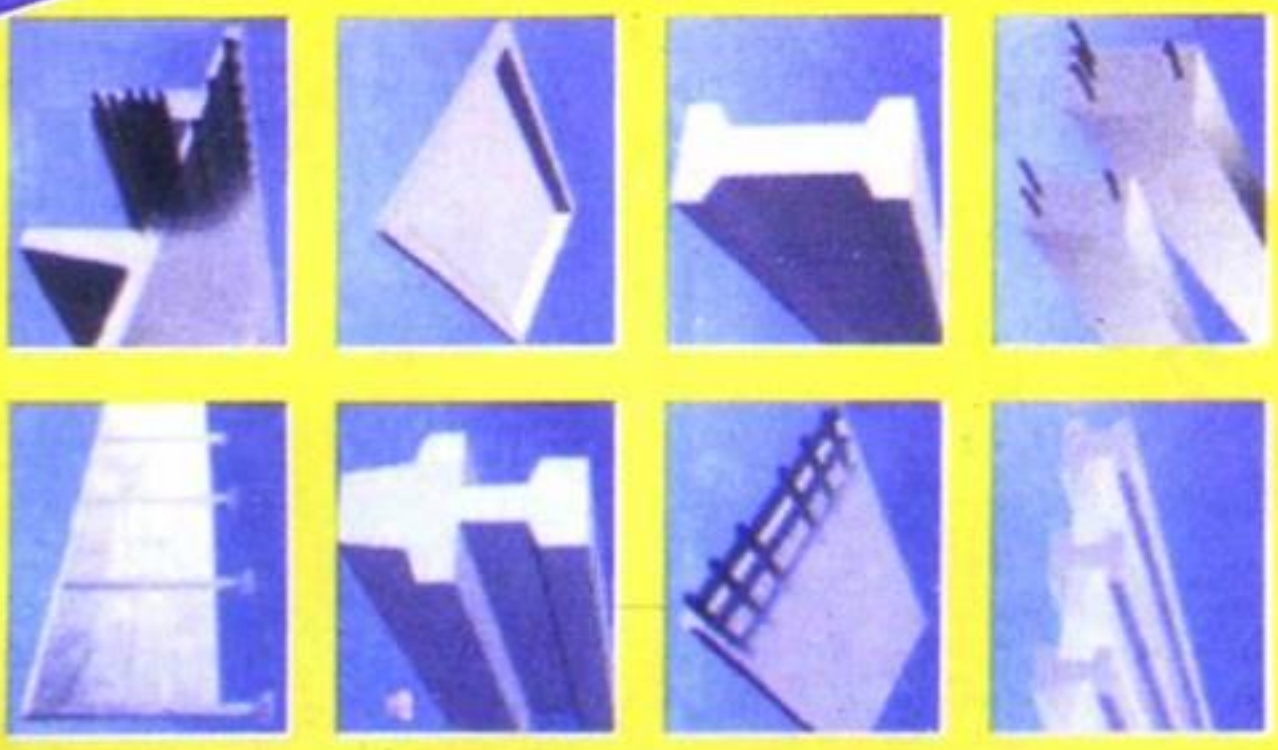
نوائے سروش

اس جگر کاوی کا اندازہ عام لوگ نہیں لگا سکتے۔ ان کے سامنے شعر بنا بنایا آ جاتا ہے۔ وہ اس روحانی اور لطیف کرب سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ جس نے الفاظ کی ترتیب پیدا کی ہے۔ جہاں اچھا شعر دیکھو سمجھ لو کہ کوئی نہ کوئی مسیح مصلوب ہوا ہے۔ اچھے خیال کا پیدا کرنا اوروں کے لیے کفارہ ہوتا ہے۔

اقتباس از مکتوب علامہ اقبال بنام گرامی۔ ۲ دسمبر ۱۹۱۸ء

خالد اقبال یاسر کی طویل ترین نظم

خالد اقبال یاسر
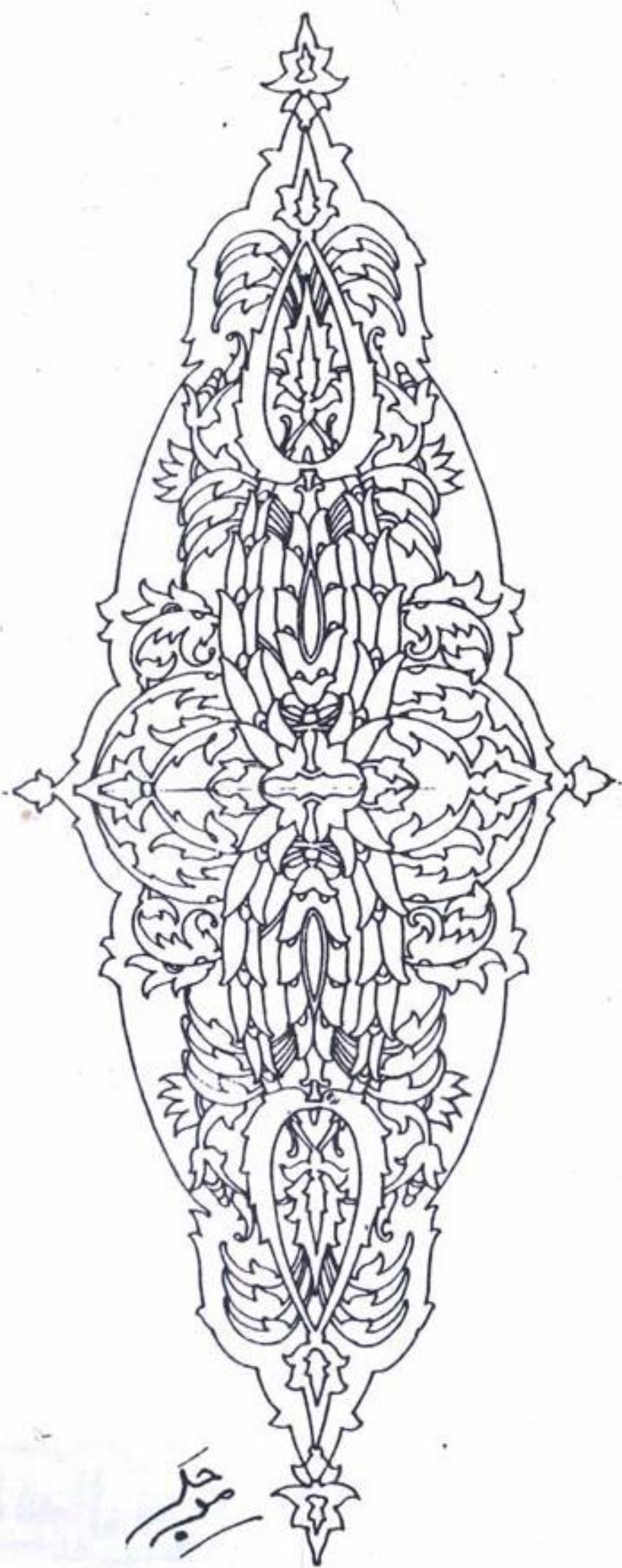
رخصتی

(1)

پُر فضا سبز دالان کی روح پرور کیاری
—— سے لہرا کے اٹھتی ہوئی
اور برآمدے کے مدوّر ستونوں سے لپٹی ہوئی
عشق پیچاں کی بیلوں کی شاداب شاخوں
—— سے کمرے کی کھڑکی کی جانب ہمکتی ہوئی
صبح کی حمدیہ اوس میں بھیگتی پنکھڑی —— رخصتی

(2)

ایک سے روز و شب، عکس در عکس لمحات،
تقدیر کی چھدری چھایا کی دھندلاہٹوں میں
کوئی مژدہء جانفزا، باعثِ خیر و برکت مناجات کی یاوری
—— رحمتِ ایزدی، داوری —— رخصتی

(3)

آسمانوں سے سارے میں
ساری کی ساری
ستاروں کی گوٹا کناری
خداوندِ قدوس کے اذن سے

تارہ تارہ اترنے کی،
آنگن سے دہلیز تک
روزنوں، در، دریچوں
سے دالان میں ہر طرف خوشبوؤں کی طرح
اک مسرت بکھرنے کی،
ہر ڈبڈبائی ہوئی واری واری نگاہوں
—— میں تصویر، گھونگھٹ کی ایک اک لڑی
—— کے سنورنے کی
سعد و مبارک گھڑی —— رخصتی

(4)

موتیے، یاسمن اور گیندے کے نازک گلوں کی تر و تازگی
اور پتلی کلائی میں نارنجی پھولوں کے گجروں،
حسیں گیسوؤں میں سجی، پیچ در پیچ گل پاش لڑیوں
—— پہ اڑتی منقش رنگا رنگ تتلی
—— کے بجرے پروں کی عجب سمفنی —— رخصتی

(5)

من ہی من میں معالڈ دوؤں کی طرح پھوٹتی
ماہتابی کوئی مضطرب الجھے اعصاب میں چھوٹتی
اور مدّت سے آہو کے نافے میں سر بند
خوشبو کی مانند یکبارگی جان و تن لوٹتی —— رخصتی

(6)

مخملیں کان کے چھید میں،

اوّلیں شب کے مہتاب کی قوس کی شکل میں
—— جھولتی مندری
ریشمیں مست انگلی میں ناز آفریں زرد سونے کی انگشتری
—— اور اس میں زمرّد کی صورت جڑی —— رخصتی

(7)

جگمگاتے ہوئے قمقموں
روشنی میں نہائے ہوئے شامیانوں
معطر قناتوں، سدا شادماں سیج کے درمیاں
ناز و انداز سے اِک لجاتی ہوئی سُندری —— رخصتی

(8)

سر سے چہرے پہ ڈھلکائے زرتار گھونگھٹ
—— کی معدوم سی اوٹ سے جھانکتی
سُرمہ آلود اشکوں سے بھیگی ہوئی سرمئی روشنی —— رخصتی

(9)

چاند ماتھے پہ افسوں بھرے زاویے سے ٹکا
ترچھا ٹیکا سجانے سے کچھ دیر پہلے
سنہری گھنی لمبی زلفوں کی چوٹی سے
—— آزاد، آوارہ لٹ کی طرح
شرم سے تمتمائے ہوئے رخ پہ
—— بے ساختہ، بے ارادہ گری —— رخصتی

(10)

شادآبادایک اک سہاگن کے ہاتھوں
—— سے دلہن کی سیدھی ہتھیلی
—— پہ مہندی کی صورت بجی —— رخصتی

(11)

آرزوؤں، امنگوں بھری عمر کی جی لبھاتی گھڑی
اورآئندہ کی ان گنت آس امیدوں بھرے
—— بندھنوں میں بندھی —— رخصتی

(12)

گھر کی مانوس دیواروں، پیاروں سے منہ موڑ کر
اپنی دہلیز کو چھوڑ کر
اپنے شانے سے انجان شانہ بہم جوڑ کر
اونچی نیچی پُر اسرار پگڈنڈیوں پر کسی ناشناسا دیارِ طرب کے
—— سہانے سفر کے فقط وعدہ دلنشیں،
زمزمہ ریز پیمان ہوعہدِ وفا کی غم آگیں خوشی —— رخصتی

(13)
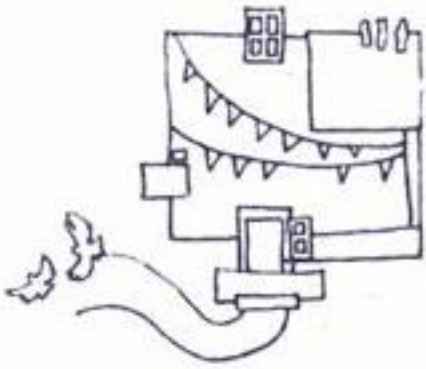
گڈے، گڑیاؤں کی منگنی، شادیاں
پیچ، پینگیں، پہل دوج تیج، اونچ نیچ، انگنائی
چھپا کی، لکن میٹیاں، کھوہ
اڈی چھڑپا، گھڑولی گھڑا، ککلیاں
کیڑی کاڑا، رمی، بھنگڑے، پیلیاں
سیڑھیاں سانپ، لڈو، شٹاپو

جُھمر، تھال، گِدّے، سکھی، لُڈیاں
چنگ، دف، سیٹیاں
تالیاں، گھوڑیاں، ڈھولکی
گیٹیاں، کوڑیاں، نوگنی
بچپنا، کم سنی —— رُخصتی

(14)

دو کہاروں کے کاندھوں پہ رکھی صبا سے سبک پالکی
کوئی قالین جادو سے اڑتا ہوا
تختِ دوشِ ہوا پر سلیمان کا یا اڑن طشتری —— رُخصتی

(15)

دل کی ڈھلوان پر
برف کے دودھیا نرم گالوں کی مانند گرتی ہوئی
سردیوں میں کسی سُونے کمرے کے کونے میں
—— جلتی انگیٹھی کی لپٹوں میں لپٹی ہوئی
اُجلی، انمول، نایاب آسودگی —— رُخصتی

(16)

بھیگتی شب زفافی
دوپٹہ، نمازِ دوگانہ
حیا، حجلہ و توشکِ خسروانہ
شگن، رونمائی، شناسائی، چاہِ ذقن
حسن و لطفِ بیاں، خوشبوئے محرمانہ
مہکتی کلائی، چھنکتے زر افروز کنگن
دل و جاں کی نورُستہ، خرسندوارفتگی
لعلِ یکتا کی ناسُفتگی، بارِ دوشیزگی —— رُخصتی

(17)

آشنا بام و در چھوڑ کر ہمرہِ اجنبی ، رخصتی
اجنبی اجنبی میں مگر باعثِ دوستی ، رخصتی
مشفق آنکھوں کی پلکوں پہ مشکل سے ٹھہری نمی رخصتی
اوراچھی دعا سے پروئی ہوئی اوڑھنی ، رخصتی
سائباں نوریں قرآن کا ، ازلی پاکیزگی رخصتی
اور پہلا قدم ہم قدم، آرتا ، آرتی رخصتی
ارغواں کہکشاں سے چھلکتی ہوئی روشنی رخصتی
چودھویں رات کے چاند کی دودھیا چاندنی رخصتی
شبنمیں خواہشوں ، خوابگوں آرزوؤں بھری رخصتی
شاخ پر اوس میں بھیگتی ایک نازک کلی رخصتی
ابر و بادِ بہاری کی سَرمستیوں میں کِھلی رخصتی
رنگ رس مہندیوں کی سجل خوشبوؤں میں رَچی رخصتی
گیسوؤں کی گرہ در گرہ مینڈھیوں میں گُندھی رخصتی
ساتھ کھیلی سہیلی کی اک رنگ افزا ہنسی رخصتی
ہر بُنِ مو سے بے ساختہ پھوٹتی سَرخوشی رخصتی
کان میں جھولتی بالیوں کی طرح . نقرئی رخصتی
تیکھے ماتھے کے جھومر کی روپہلی تابندگی رخصتی
سامنے اک نیا مرحلہ اک نئی زندگی رخصتی
پُر سکوں گھر کی دہلیز سے دوسری تک بچھی رخصتی
کانُ رس ، جاں فزا ، دل نشیں نغمۂ سرمدی رخصتی ،
منعکس دو بھلی ، مضطرب صورتیں ، آرسی رخصتی
پہلی پہلی جھلک ، ابتدائی جھجک ، ٹکٹکی رخصتی
کان میں گونجتی دھیمی شہنائی کی راگنی رخصتی
اور باجے کی ہر تان میں رخصتی ، رخصتی ، رخصتی

(18)

شہر کی برجیوں، کنگروں، رنگ محلوں، چوباروں تلے
ٹیڑھے چوراہوں، بازاروں، گلیاروں میں اہلے گہلے
رنگارنگ قہوے کے پیالوں میں طوفان اٹھاتے ہوئے
سگرٹوں کا دھواں دوسروں پر اڑاتے ہوئے
ملگجی گرد آلود شاموں
سلگتی دوپہروں
جنوں خیز اندھیاری راتوں کی
—— فکر اور فاقے سے آزاد آوارگی —— رخصتی

(19)

ایک ہی وقت میں
عمر گھٹتی رہی اور بڑھتی رہی
عمر کے ہاتھ سے
قرض ملتا رہا واپسی کے لیے
کتنا رونا پڑا اک ہنسی کے لیے
ہر کوئی ہے کہاں ہر کسی کے لیے
منقسم ہو گئے زندگی کے لیے
منقسم زندگی کی طرح کچھ اضافہ مگر —— کچھ کمی —— رخصتی

(20)

شہد کی، دودھ کی، ایک سی سطح پر دائمی بہتی نہروں
درختوں پہ اک ہاتھ کے فاصلے پر الوہی پھلوں
اور خوش رنگ انواع واقسام کے شیریں میووں

مقدس گلوں سے بھرے مستطیل اور چوکور تختوں
روش در روش حسنِ فطرت کے جلووں
—— سے معمور پاکیزہ جنت سے بھولی نہیں
—— اپنی ناوقت، بھیدوں بھری، عارضی —— رخصتی

(21)

رات کی کوکھ سے پھوٹتی پَو
افق سے نکلتے ہوئے دن کی ضو
اک پہر' دوپہر' سہ پہر'
جھٹپٹا' شام' بُجھتا ہوا دن
اترتی ہوئی رات' اندھیرا
اماوس' پُر نماشی' تارے
مہ ومہر کی منزلیں' مرحلے' برج
شب' شام کی تیرگی —— رخصتی
اور دن' صبح کی روشنی —— رخصتی

(22)

نعرۂ حق' اناالحق کا اسرار
منصور' سرمدؔ' گرفتاریاں
سولیاں' زہر کی چسکیاں
حلقۂ درس' بے ساختہ فکر
برجستہ اظہار پر قدغنیں
سوچ' سچ' زہر کا پیالہ
دو گھونٹ' سقراط

ڈُلے، بھگت، ٹیل، ویلیس، جگّے
بغاوت، حقِ خودارادی کی تاریخ
اشرافیہ کی جبیں کی شکن
تیرانداز ساونت، شمشیرزن سورما، صوفیاء، رہنما
دیومالائی کردار
شاہانِ عالم کے دربار، للکار
زندان، زنجیر، تعزیر
کڑیاں، کٹہرا، پرایا قلم
طوق، بیڑی، رسن، آہنی ہتھکڑی
گھور اندھیری گھڑی، تنگ تر کوٹھری
درّے، کوڑے، کڑے تازیانے، ٹکی ٹکٹکی
صبحِ صادق کی اجلی کرن
پہلی پہلی کلی کی نجل خوشبوئے دل گرفتہ کی
دانستہ توثیقِ کوتاہ بیں پر
زبردست جلّاد کے کپکپاتے ہوئے کُھردرے ہاتھ سے
دار کی چوبِ ناقدرے جھولتے جسم سے
جاوداں روح کی —— رخصتی

(23)

اک طرف مال و دنیائے دوں
اک طرف نیلگوں آسماں، واژگوں
موج در موج پیاس اور بہتا فرات
آتشیں ریت میں جذبِ خوں

سورج

ایک معصوم حلقوم، تیر
اور جھوٹ اور سچ، بیچ خونی لکیر
اسمِ شبیرؑ ابن علیؑ، بے بسی، صبر، بے چارگی
کربلا کربلا، تشنگی —— رخصتی

(24)

اک سنگھاسن کا وارث
زمانے سے ناآشنا شاہزادہ
سوئمبر میں جیتی ہوئی شاہزادی
مقدر کی رانی
تراشا بدن زعفرانی
فسوں زا کہانی، پرانی
وفا کیش حسنِ زمانی
مرادوں بھرے روز، راتیں سہانی
زرافشاں پنگھوڑے جھلاتی ہوئی
پنکھے جھلتی ہوئی کنیائیں
سکوں بخش سیجیں، بچھونے
نگر، راجدھانی، محل، بام
سنتان، ماتا پتا، راجگیری
مگر کھانستے ایک بوڑھے کی جھکتی کمر
ایک بیمار کی بجھتی چیخیں، کراہیں
اک ارتھی، چتا
دلگذاری میں گم

اپنی سوئی ہوئی پھول شہزادی

گل فام اولاد پر آخری اک نظر

مضطرب شاہزادے کے نروان کی پیش بیں

اونگھتی رات کی جاگتی —— رخصتی

(25)

آپ میں گم، اکیلے میں

کچے گھروندوں کی دھندلی منڈیروں سے کچھ دور، بیلے میں

رنجیدہ لمحوں کے ریلے میں

مغموم لے سے

فسردہ و دلگیر رانجھے۔ کے یکسو رگ و پے سے

خوشیاں چراتی ہوئی بانسری —— رخصتی

(26)

رات، اندھیرا گھنا

اور مٹی کا بے جاں گھڑا

بپھرے دریا کی طوفانی لہریں

کڑکتی ہوئی برق

ڈھولک نہ باجا

نہ مہندی، نہ سکھیاں

نہ ڈولی، نہ بھائی کا کاندھا

نہ بابل کی پُر آب اکھیاں

نہ ماں کی دعائیں

فقط کچی مٹی کی ڈولی گھڑا، ڈوبتی سوہنی —— رخصتی

(27)

جنڈ کی ٹیک، ترکش، مقوّس کماں
نیند میں بے خطر محوِ مرزا
سرہانے مگر پہرہ دیتی ہوئی صاحباں
اور بکّی کی بے چینیاں
اک طرف تیر اور اک طرف ویرا اپنا سمیر
اک طرف اپنے مرزے کے بالوں کا چیر
اک طرف اپنی مٹی، خمیر
آتے گھوڑوں کی ٹاپوں سے بڑھتا ہوا
اضطراب و تذبذب
وفا، بے وفائی کے دوراہے پر
ٹوٹتے تیر، ترکش، کماں
خاک کا رزق مرزے کا خوں
صاحباں کی وہیں اپنے محبوب پر جان و تن وارتی —— رخصتی

(28)

زہر کی ایک چٹکی، دہن
فصد، چاقو کی دھار
آبی لہروں کی پھنکار، خاکی جسد
ایک مضبوط رسّی، گلا
نامرادِ محبت کی تنہا، کہیں دور
یا، تنگ دونوں زمانے کے ہاتھوں
محبت کے ماروں کی اک ساتھ

ہاتھوں میں تھامے ہوئے ہاتھ

ماتھے پہ سہرا

سجانے کی حسرت نظر میں لیے

گورے ہاتھوں پہ مہندی

رچانے کے ارمان دل میں رکھے

وقت کی حد سے باہر

کسی ماورائے زمانہ چمن میں

ملن کی تمنا کیے باہمی خودکشی —— رخصتی

(29)

بے خطر اپنے محفوظ رستے پہ چلتے ہوئے

ناگہانی کوئی حادثہ، سانحہ

گھات، شب خون، حملہ

نشانے بنا تیر، بھٹکی ہوئی کوئی گولی

لٹیروں کا جتھا

شب تیرو تار میں، دن دہاڑے

چھرا، شاہ رگ پر کوئی

نیزہ بردار، پسلی

طمنچہ، خمیدہ ٹریگر پہ انگلی کا خم

ایک معصوم کی کنپٹی —— رخصتی

(30)

ایک میداں سے پسپائی

صلح وصفائی

پڑاؤ اور خیام اور الاؤ

اور چڑھائی، لڑائی

ہراول کے تاؤ

اور کہیں میسرے، قلب کے بیچ داؤ

اور تلوار کے پینترے، وار، گھاؤ

اور کھینچی ہوئی منجنیقوں، پیادوں، سواروں کی ہو ہاؤ

—— پر عین گھمسان کے رن

—— میں نصرت سے دو ہی قدم پہلے،

دارالخلافے سے محضر بدست ایلچی —— رخصتی

(31)

اپنے قد سے بڑی کرسیاں

شان، رتبے، شرف

مسندیں، عہدے، انعام، دنیاوی منصب

حشم، جاہ، سطوت

مراعات، عیاشیاں، کارمختاریاں

کہنیوں کی کرامات، لفاظیاں

چوردروازے کی یاریاں

سازشیں، حرص، لالچ، خوشامد، لسانی تعصب، ریاکاریاں

اپنی باری سے پہلے

ترقی کی بجلی بھری سیڑھیاں

اقرباپروری، مصلحت، فرقہ بندی، حسد

ضابطوں سے تجاوز، زبانی ہدایات

زر' مال' املاک' رقبے' سواری
حصص' شرکتیں' کاروباری مفادات
روز یئے' روٹی کی مجبوریاں
بوجھ سے ذمہ داری کے دہری کمر
بے سبب نیچی نیچی نظر
کورنش' خم سے بے وجہ شرمندہ سر
اور انکار پر
سرزنش' بندشیں' جبری رخصت' اڑنگے
شُبے' شک' تنزل' تعطل' سبکدوشیاں
قابلیت' دیانت' صداقت' قناعت کی معزولیاں
عرضیاں' عرضیاں سننے والوں کی معذوریاں
بے بضاعت قویٰ' ذہن شل' جوڑ مختل
شقی' موذی غاصب کی مختاریوں کی طوالت
مگر آخرش گردنوں کا اترتا تناؤ'
اور اکھڑتی رعونت' بکھرتی اکڑ
نرخرے کا ڈھلکتا کلف
خود بخود ابروؤں کی سلجھتی شکن
ارضی مستاجری' آجری' افسری
عارضی نوکری' مستقل چاکری ---- رخصتی

(32)

تمغے، اعزاز، انداز،
حاجب کی آواز،

انجام، آغاز

طرّے، کلف، ٹوپیاں، خان سامانیاں،
خلعتیں، کلغیاں، کرسیاں
باندیوں کی طرح داریاں
تخت، دربار، فانوس، درباں، جھروکے، کلس
چوبداروں کی ہر گام پر چھاؤنی، چوکیاں
قورچی، مورچے، دمدمے، بُرجیاں
مسندیں دس ہزاری،
محاصل، شقیں، پرگنے، صوبہ داری
قلم اور فرمان، پروانے، محضر
علم، مُہر، سالاریاں، لاؤلشکر، مُعَسکر
جلالِ کئی، سطوتِ قیصری
توشہ خانہ، خزانہ، خزانے کی کنجی
خزانے کی ہر اشرفی —— رخصتی

(33)

تیر، ترکش، کماں
ہاتھی، گھوڑے، شتر
خُود، بکتر، زرہ
توپ خانے، رسالے، پیادے
کلہاڑے، گنڈاسے، چھرے
گولہ بارود، توپیں، فلیتے
کٹاریں، کٹاری دودھاری

سورج

چمکتی ہوئی تیغ، کرپان، تلوار

ترشول، آکاش، اگنی

حتف، غزنہ، شاہین

انی، دھار، بھالے

سپاہی، کماندار، سالار، سینائیں، سیناپتی

اور بحری، زمینی، فضائی، خلائی جھڑپ

پوکھراں، ناگاساکی، نوادا، ہیروشیما، چاغی

دھمک، حملے، یلغار، دھاوے

گرانڈیل طیارے، سیارے، پُر ہول اوزار

صیہونی، اسلامی، نصرانی، بدھ، ہندو ہتھیار

بمبار، بم

خفیہ، اعلانیہ یورشیں، دھمکیاں

کیمیائی، حیاتی، طبعیاتی شب خون، بمباریاں

تارپیڈو، مزائل، جہاز، آبدوز، ایٹمی چھتریاں

تابکاری کی پچکاریاں

اسلحے جوہری ــــ رخصتی

(34)

ہیکٹر کی کماں سے نکلتا ہوا تیر

ایڑی کی شست، ادیکلیز

افراسیابی جھپٹ،

رخش کی جست در جست

رستم کی تازندگی، رستمی

سیمسن، سیمسن کی لٹیں کندنی ــــ رخصتی

(35)

مچھلیوں، سیپیوں اور گھونگھوں
سے آباد گہری تہوں سے
سمندر کے پانی سے سانسیں ادھاری لیے
ساحلوں کی ڈھلی ریت پر
اپنے ہی ساتھ اک دو گھڑی کھیلتی جل پری —— رخصتی

(36)

گھات میں چھپ کے بیٹھے شکاری کے کھینچے ہوئے
—— تیر کی زد پہ آئے ہوئے
مرغزاروں میں بے خوف رم کرتی ڈاروں
—— کے ایک ایک خوش تاب آہو کی
من موج میں آخری چوکڑی —— رخصتی

(37)

سنگدل دیو کی قید سے
ایک الفت کے مارے جری شاہزادے
—— کی جرأت کے بل پر
رہا ہو کے اُس شاہزادے کے پہلو بہ پہلو
اُسی قاف کی رفعتوں کی طرف
اپنے بُراق پر کھول کر
پھر سے پرواز کرتی پری —— رخصتی

(38)

ہاتھ میں گہری مہندی سجا ہاتھ، گلگوں کلائی

گلوبند، پازیب، سولہ سنگار اور سرمہ سلائی بھی
اونی سویٹر کی دلبر کی خاطر، بنائی بھی
رومال پر اک طرف
دو حروف مخفف کی دستی کڑھائی بھی
ماں باپ، ماں جائی، بھائی
سبب، بے سبب جگ ہنسائی
وفا بے وفائی بھی
سر سبز تنہائی بھی
وقت کے قرض کی پائی پائی بھی
ذاتی کمائی بھی
پندار، نخوت، انا، بے خودی، فخر، کم مائیگی —— رخصتی

(39)

گھر کی محراب پر منتظر
اک دیئے پر نظر
واپسی کا سفر اور دہلیز، در
معدم پھر سے درپیش اگلا سفر
توتلے لفظ پر ملتوی —— رخصتی

(40)

لوحِ تقدیر کی روشنائی بھی
اور ان پہ لکھی عبارت کی سُرخی، خفی یا جلی
گردشِ مہر و مہ، زہرہ و مشتری، جوتشی
اور اچھا برا زائچہ، کنڈلی —— رخصتی

(41)

ابرہہ!
مست فیل اور اصحابِ فیل
اور ابابیل، ابابیل کی چونچ کی کنکری
تختِ بلقیس، قصرِ سلیمان
طالوت و جالوت
ہاروت و ماروت
یاجوج و ماجوج کی راہ میں سدِ اسکندری
خضرؑ، آبِ حیات
اور اصحابِ کہف
اور صالحؑ کی خاکستری اونٹنی
آستیں میں کفِ دستِ موسیٰؑ
عصا اور الواح کے
قدرتی معجزوں کے مقابل
فریبِ نظر ساحری، سامری —— رخصتی

(42)

دیوتا، دیویاں
ایشور، کام دیو، اگنی، وشنو، ورن
کالی، اندر، گنیش
اور بجرنگ، درگا، مہادیو
آشور، مردوک
نمرود، فرعون

مریخ، زہرہ، زحل، چاند
یمراج، یمدود، راما، کرشنا
عطارد، کیوپڈ
اڈونیسیس، شمس، عشتار، عشترتی، پرمیشور
سائیکی، ایفرودائتی، لکشمی، مشتری —— رخصتی

(43)

فرقہ، تحریک، مت
دین، ایمان، مذہب، عقیدہ، دھرم، نظریہ
کشٹ، اذکار، پرچار، تبلیغ، معکوس چلہ کشی، سادھنا،
سنگھٹن، شدھی، بھگتی
مہاویر، زرتشت، نانک، سدھارتھ، منو، کنفیوشس، ولی، پوپ، لامے
غنا، فقر، ارادت
فضائل، مناقب
طہارت، سلوک وولایت
طریقت، شریعت
مبلّغ، مجدّد، مفسّر، معلّم، رشی، عبقری
سچے پیغامبر، احمدی، قادیانی، بہائی
فقے —— حنفیہ، مالکی، حنبلی، شافعی، جعفری
بدعتیں، مسلے، معجزے، وسوسے
قادری، نقشبندی، سہروردیہ سلسلے، خواجگی
مالک ابنِ نویرا، عطا ابن مقنّع،
حسن بن صباح و محمد علی باب و شدّاد کذّاب

حجاج، چنگیز، بش جیسے سفاک،

طبقات، انسان کی ساختہ ذات پات

آریا، سام، منگول، حبشی، دراوڑ، سکیمو

تعصب، ستم، خوف، خونخواریاں

افتراق، انیائے، ستم

بے کسی، آہ، لاچاریاں

بھائی چارہ، مروت، صداقت، مساوات، ہنسا اہنسا، رواداری

سکھ شانتی، آشتی، برتری، کم تری، منعمی، مفلسی

فلسفہ، عقل، دیوانگی —— رخصتی

(44)

گرجے، معبد، پگوڑے

صنم خانے، استھان، تیرتھ، شوالے

سمادھی، جنم بھومی، آتش کدے، گردوارے

رواں آبِ زم زم، وضو، رودِ گنگا کا اشنان، بپتسمہ، گنگوتری

پاٹھ، دم، کیرتن، جاپ، تجوید، تسبیح، گانا، دھمالیں، بھجن

بھینٹ، نذرانے، صدقے، انگوٹھے

بلیدان، خیرات، پرشاد، لنگر

گجر، گھنٹی، ناقوس، اذانیں، نفیری، ترم

نوبتیں، سنکھ، نقارے، نقارچی

چھاپ، قشقہ، تِلک

صُوف، صُوفی، ریاضت، تپسیا، پرستش

عبادات، ویدانتی

گیان، نروان، سطعات، عرفان
دیوالیاں، ہولیاں، پنچمی
ایسٹر، عرس،
عیدین، میلادِ عیسیٰ، دسہرے
چٹائی، کٹورے، کڑے، منکے، مالائیں، کنٹھے
عبا، دَلق، خرقہ، قبائیں، گلیمیں، عمامے
جفر، فال، قرعے، قیافے
کتھائیں، اساطیر، قصے، دفینے
مہابھارت، وید، اشلوک، گیتا، اپنشد، گرنتھ، آیتیں، شاستر، عہد نامے
طبو، خیر، طوطیم، شر، زندق،
کشف، الہام، پیشین گوئی، اشارہ، نزولِ وحی —— رخصتی

(45)

سنت، ابدال، سادھو
مہارِش، بھکشو، پروہت، گرو دیو، اوتار، جوگی
گرنتھی، پجاری، حواری
مہاراجے، سمراٹ، راجے، برہمن
چندر ونشی ساونت اور سوریا ونشی بلوان، ججمان
شودر، ملیچھ، املے ویش
زائر، مقدس مقامات کے یاتری
تیغ زن کھشتری، کم نظر پادری، تنگ دل مولوی
انتری جنتری، منتری —— رخصتی

(46)

راجباہوں کے پانی کی خاموشیاں
دور تک لہلہاتی ہوئی کھیتیاں
گیہوں، زیتون، جو، باجرے، دھان کی بالیاں
گھاس کی پتیاں
یاسمن، موتیا، ناز بو، رات کی رانیاں
سرخ، کالے، گلابی گلابوں کے گلدستے،
چوبی ستونوں، درختوں سے لپٹی چنبیلی کی شاخیں
چناروں کے کھلتے شگفتہ شگوفے
اناروں کی کلیوں کے لچھے
تر و تازہ چمپا کی بن بیلڑی
ترمرائے گُلِ لالہ کی گٹھی، نرگس کی بے نور تنہائی،
داؤدی، دوپہری، گیندے کے گچھوں
پہ خنداں، تبسم کناں تتلیاں
برف کے تاج پہنے ہوئے
کوہساروں کی آکاش چھوتی ہوئی
——— چوٹیوں کی بہم گہری سرگوشیاں
نیلگوں آسمانوں کی پہنائی میں
سنبلیں بادلوں کے شِکارے
غلولی رواں ابر پارے
طبق در طبق ٹمٹماتے ستارے
زیرِ کہکشاں، کہکشاں کی دراڑوں میں ٹھہری ہوئی تیرگی

چاند سورج گرہن، ارضی قطبین،
اجرامِ سیار و ثابت کے چھلّے
درخشندہ دمبالے، ہالے
کہر، بھاپ، کہرا، دھواں، بلبلے
دھند، جھاگ، اوس، اولے، بخارات، گالے
سراب، آبی چکر، سموم، آبِ شرشر، بگولے
طلسماتی فوارے، فوارچے
دلدلیں، جھال، جھیلیں،
ترائی، تری، کھاڑیاں، خشکیاں، دشت، صحرا، بیاباں
گھمر گرد باد، آبِ شوریدہ،
پُروا، نسیم و شمیم و صبا کی سنن سن سنن
منجھدھاریں، بھنور، بادِ صرصر کے تپتے جھکولے، پون
سوئے سوئے نگوں سار درّے، سکوت آشنا تنگنائیں،
اکیلے جزیرے، تلاطم کناں آبنائیں
جزیرہ نما، راس، ٹاپو، نگر، منبعے، ڈیلٹا، طاس، دریا، خلیجیں، بحیرے
بہار آفریں مرتفع، کوہی، میدانی رقبے
سدا منجمد، محرقہ، باردہ، معتدل موسمی منطقے
راہ پیما عمود و افق،
استوا، جدی، سرطان خط، خطّے، ابلاد، اطراف، ابعاد
کھنچے ہوئے مستطیل و مربع، محیطِ مقعر، محدب،
مثلث، قطر، دائرہ، زاویہ، قوس، بے شکل اشکال
گنتی، عدد، ضرب، تقسیم، اکائی، کمیت، اعادہ، حجم، قدر، اوزان، ہیئت

گرہ در گرہ، گنبدی، داخلی
کروی، ملفوف، قلمی چٹانیں،
ہرے، نیلے نیلے پہاڑ
اوندھے، خفتہ و بیدار، مردار آتش فشانوں
——— کے لاوے کے، گارے کے میدان، ڈھلوان، اکسار
جمتے، سرکتے یخستانی تودے، پھسلتے ہوئے برفشار
آبشاریں، خنک معدنی بہتے چرخاب، جھرنے
تہِ بحر پوشیدہ زیریں رویں
گرم ٹھنڈی سرِ سطح جاری رویں
موج در موج جھاگیں اڑاتی ہوئی رودباریں
گھمس، حبس، لو، مون سون استوائی سکوں
دائمی ساحلی، گردبادی، طبعی مسلسل ہوا کا فسوں
ساگواں، دیودار، آبنوسی ذخیرے،
سدا سبز شیشم، صنوبر
لرزتے ہوئے بیدِ مجنوں کی ازلی لچک،
نرسلوں، بانس کے جنگلوں کی لہک
صندلوں کی للک
نیم کی تلخی، پیپل کا سایہ، سفیدے کی اونچائیاں
آک، خارِ مغیلاں
گھنے بوڑھ کی بوڑھی شاخیں، تنے
سیب، لیچی، کھجور، آم، امرود، خوبانی، انگور، شہتوت
۔۔۔ آلو بخارے، اناس، آڑو کی بھینی مہک

فالسے، ترش نارنگی، لیموں، چکترے کے رس
میٹھے انجیر، شیریں عسل
تیکھے جامن کی شاخوں پہ کوئل کی کوکو
شریفے، ہری چھال کیلے، پپیتے، چکو، ناریل، سردے
——تربوز، خربوزے کے مختلف ذائقے
طوطیاں، شوخ مینائیں، طوطے، شجر در شجر خوش گلو بلبلیں،
عنقا، سُرخاب، ققنس، ہُما
فاختہ، تیتری، لالی، چڑیا، کبوتر، پپیہے کی پی ہو
قطاروں میں سہمی ہوئی چیونٹیاں
سوسمار، اژدہے، کرگسیں
کیکڑے، کرم، جرثومے، پروانے، جھینگر
مگس، بھونرے، زنبور، جگنو، گلہری، ہرن
کرلے، جل تھلیے، خرطومیے اور گرگٹ
خزندے، درندے، چرندے، پرندے
جمادو نبات وحیات وثبات
ارتکاز، انعکاس، انعطاف، ارتقاء
نظم، تبخیر، تکثیف
لاسلکی مشیرہ، منفیرہ برقیرے، مقنیطے، بے تار مقناتی لہریں
تسلسل، تناسب، توازن، ثقل،
سبزہ، پتھریلی کائی، پھپھوندی، خمیر
آبِ آئینہ، چقماق، پارس
تب وتابِ زر

زنگ، زنگار، سکری،
نفس در نفس سوکھتی جمتی بے جان پپڑی
نمود و نمو، خاک در خاک پوشیدہ روئیدگی
روپ، رنگینیاں، رنگتیں گندمی
ذہن اِنساں کی کاریگری
دستِ قدرت کی گلکاریاں قدرتی
حسنِ فطرت کی مشاطگی —— رخصتی

(47)

ایک پل زندگی کا تلاطم، تگ ودو
ابھی آگے اور آگے بڑھتے چلے جانے کی کاہشِ نو بہ نو
آسماں پار کرنے کی خواہش
زمیں پر ستارے اُگانے کی لامختتم کوششیں
وسعتیں، فرصتیں، حوصلوں، شوخیوں، چونچلوں کی
ارادوں میں دم، والہانہ قدم
اور ابھی اک معالج کی تشخیص
دم کی بجائے دمہ اور مہلت بھی کم
ملتہب، سُدّی یرقان، طاعون، سرطان، صفرا، سل ودق، شقیقہ
سبب بے سبب سانس کا منتشر زیر و بم
رگ، ورید اور شریان میں
خون کا انجماد اور بڑھتا فشار
اور وجع المفاصل، جذام
اور صفراوی، میعادی تاپوں کی پُر ہول اقسام

سوزِ جگر، شکری، آہستہ رو بلبلہ

نوبتی تاپ الگ

ضعفِ دل، دردِ دل، دردِ سر

ریح، تخمیرِ معدہ، ورم

نیشتر، زخم، ناسور، ٹانکے، رفو

گاز کی پٹیاں، بانس کی کھپچیاں، لیپ، پھاہے، پلستر

مسیحائی، چارہ گری

تیرہ و تار گودے کی آلودگی

زنگ سے بھربھری، کرکری، مرمری ہڈیاں

جھلّیاں، تھیلیاں، گلٹیاں،

گنٹھیا، سوزشیں، گانٹھ، گومڑ

غدّ ودوں کی ناکردگی ——

چُھوت، موروثی، مہلک مرض

ان گنت عارضے، مزمنہ روگ، بیماریاں

سر کے، چوعرقے، دوآتشے

مغز، کشتے، کھرل، ست، جواہر

طبیب اور نباض، حاذق حکیم

ادویہ، کڑوے میٹھے سفوف

آزمودہ جڑی بوٹیاں

قیف، انبیق، صد تجربوں کے ظروف

اَن سُنی گولیاں، ٹکیاں، قُرص، جھل ڈبیاں

اور تریاق، مُسہل، مرکب، تری پھل

حبوب ولبوب وجوارش

طِلا، بام، تکمید

یک قطرۂ آبِ حیواں

گراں بار معجون، محلول، روغن، طباشیر

اکسیر نسخے، مجرب خمیرے

ولی، پیر، درویش، مجذوب، سنیاسی باوے

مزارات، درگاہیں، دربار، تکیے

دعا، دھاگے، تعویذ، منتر، نیازیں، چڑھاوے

مناجات، منت، مرادیں

عمل، ٹوٹکے ٹونے، حرمل کی دھونی، وظیفے

مگر آخرکار چھپنے کو آتی مسہری

عزیز و اقارب کی، تیمارداروں کی مایوسیاں

اور بیمار آنکھوں کی زردی میں گھلتی

سمٹتی ہوئی جھرّیوں سے جھلکتی

قضا کی سیاہی

حزیں اترے چہرے کی پھیکی سفیدی

——— پہ سایہ کناں کتنی صدیوں کی افتادگی

حسرت آمیز افسردگی، دل کی آزردگی

برطرف قوتِ شامہ و ذائقہ

سامعہ، باصرہ، لامسہ، حافظہ، دافعہ

آخذہ، ماسکہ، نامیہ، مدرکہ

اور آپس میں جُڑتی ہوئی پنڈلیاں

حاصلِ زندگی ایک لاحاصلی

بے دلی، جاں کنی، ۔بے حسی، جسم کی سردنی —— رخصتی

(48)

تختہءِ غسل آخر

گلابوں کے تازہ عرق، آبِ زم زم سے نم

خاکِ نجد و نجف سے چھوئے ادھ سلے

اک کفن کی چٹکتی سپیدی

جُتا گورکن، بیلچہ، پھاوڑا، ایک اندھا گڑھا

ارتھی، مرگھٹ، چتا

چار کاندھوں پہ رکھا جنازہ

بوئے عود و لوبان و کافور، اگربتیوں کا دھواں

تازہ پھولوں کی بکھری ہوئی پتیاں

سورہءِ فاتحہ کے چھتر، مغفرت کی دعاؤں کی چھاؤں تلے

سوندھی، بے روح، چپ گا چنی —— رخصتی

(49)

دو گزی قبر کی ٹھور کی سادگی

کردہ ناکردہ اعمال بارے

سوال و جواب، احتساب

ایک انوکھا کڑا ماورائے گماں، بے نہایت عذابِ مسلسل

مزاروں سے اٹھنے تلک

یا سفارش پہ منکر نکیروں کی

جنت کی جانب کھلے در، دریچے سے

مرقد کی تنگی کو آسان کرتی معطر ہوا کے ابد تک ہلاروں
——— سے سرشار کرتی ہوئی ——— رخصتی

(50)

سدِ اسکندری چاٹتے چاٹتے
نحس لمحے میں اخراجِ یاجوج و ماجوج' بربادیاں
چوڑی گردن
سیہ حبشیوں سی گھنی گھنگریالی لٹوں
سبز شیشے کی اندھی پھلی والے
یک چشم کذاب دجال کی
ناموافق دنوں'
ارضِ شط العرب' شام کی سرحدوں کے قریں
شرق میں اصفہان و خراساں کے اطراف آمد
نبوت' خدائی کا دعویٰ
شیاطین کو مردہ ماں باپ کی شکل دیتے
بظاہر سرِ آسماں بدلیوں کی طرح تیرتے
اور دنیا میں تیزی سے جگہیں بدلتے
کسی باغ کو اپنا فردوس' الاؤ کو دوزخ بتاتے
نظر بندیوں سے دھواں دھار بارش دکھاتے
درختوں پہ بے موسمی پھل لگاتے
مدینے سے اک دو منازل ادھر
حضرتِ خضر سے شعبدہ باز ملعون کا سامنا
حضرتِ خضر کو چیرنا' اور پھر جوڑ کر زندہ کرنا

مگر قتل کرنے کی پھر ایک ناکام کوشش

فساد، ابتری، کال، فتنے

زکوٰۃ ایک تاوان

امانت بھی مالِ غنیمت

غنائم، وراثت

کہیں باپ پر ظلم، یاروں پہ احسان

شَر وجہِ عزّت

ہوس کار، عیار اہلِ حکومت

وحی سے تہی گم کردہ کھوئی رسالت

فقط دل ہی دل میں اصولوں پہ اڑنا بہت

دل ہی دل میں برائی سے لڑنا بہت

اور آنکھوں سے نیکی کا دامن پکڑنا بہت

منفعِل مُجدی، مبتدِل مُقتدی

شریروں کی امامت

اور ایسے میں دشتِ غیابت سے اک دن معارجعتِ مہدوی فاطمی

مہدی المنتظر، مختصر عسکری

اوجِ منارۂ مشرقی، رجعتِ عیسوی

ارضِ لدّ، ارمجیدون، دجّال کا قتل،

انسان کی بیعتِ عیسوی،

عظمتِ مصطفائی، رواجِ مسیحائی، یکجائی

نو سال فرمانروائی

جدائی کی نازک گھڑی —— رخصتی

(51)

حقیقت، علامت، نشانی، حکایت، گماں،
بولتا جانور، انشقاق القمر اور بادِ یمن
لوطیوں، ایکیوں اور عادوں، ثمودوں کی بربادیوں کا تسلسل
سرافیل کے صور کی پھونک
ناقوس کی گونج
پُرہول آواز، بھونچال، کنکر،
مہیب آندھیاں،
بھاپ، دریا، سمندر، بحیرے، خلیج
اڑتے روئی کی صورت کہستان، گرتی عمارات
آفاق وانفاس بے مول،
موقوف آنات، تقویم، اقلیدسی
علمِ تاریخ، جغرافیہ اور جیومیٹری
قرن، یگ، دن، مہینے، صدی
سال وسن، قمریہ، شمسیہ، عیسوی، بکری
خون کے رشتے ناتے، روابط، دلوں کے حوالے غلط
فکر شل، گنگ لب
شور سے بہرے ہوتے ہوئے کان
گرتے حمل، قبض روحیں
فقط ساعۃ، الغاشیہ، حاقہ، القارعہ
وقتِ معلوم پر وقت کا خاتمہ
ابتلائے قیامت

کہاں اتنی آساں تھی

جنت سے نکلے ہوئے آدمی کی درازیٔ کارِ جہاں سے خجل، مضمحل

اپنے رب کی طرف رجعتِ قہقری —— رخصتی

(52)

حشر کی سنسناتی ہوئی خامشی

جانبِ شرق سے اٹھتے شعلے، بگولے

سوئے غرب اولادِ آدم کی پسپائی

قیلولے کی رات

یومِ نشور، احتسابِ عمل، جدولیں، گوشوارے

نکوکاروں کے سیدھے ہاتھوں میں اچھائیوں کی کھتونی

مگر الٹے ہاتھوں میں بدنامیوں کی کھلی جمعبندی

حقوق و فرائض کی پُستک

خسارے کے خسرے

بیاہی ہوئی، بن بیاہی ہوئی ماؤں کے نام شجرے

خدا، ربِ کعبہ، خداوند، یزدان، بھگوان، پرمیشور

—— کی حضوری میں حاضر خدائی

گنہگار چہروں پر اعمالنامے کی کالک

خلاف اپنے بے قابو اعضا کی سچی گواہی

خجالت، ندامت، جہنم کی دہشت

مگر خاص بندوں کے نورانی، بشاش چہروں پہ رحمت

رسول، امتیں، امتوں کی شفاعت

مداراتِ کوثر

اُدھر ختم شیطان کی شیطنت

حشر میں موت کی موت

اِدھر پلِ صراط، اس کے پار ارضِ زقوم، اعراف، برزخ
درِ خُلد، داروغہ رضوان
لوحِ ازل سے مٹی زندگی
روح کی واپسی
خالقِ دو جہاں کی نیابت، خلافت سے حتمی سبکدوشی
فردوسِ گم گشتہ
جنت کے باغوں کو انسان کی واقعی، دائمی ـــــ رخصتی

(53)

دوہڑے، دوبیتے، قطعات، سانیٹ
، ہجویں، رباعی، قصیدے، ترانے
کہستانی ٹپے بھی، صحرائی وائی بھی
مشکل پہیلی، حقیقت، سہیلہ، شہادت، ترالے
شمائل، سہاگن، لگن، ہائیکو، چیستاں
منقبت، مرثیے، رزمیے، شہر آشوبے، اوڈ، سی حرفیاں
کہہ مکرنی، کبت، ساکھیاں، ذکریاں، بارہ ماسے
غزل، قافیے، مطلعے، مقطعے،
زمزمے، جھولنے، رخصتی، سہرے
ضرب المثل، قول، میلاد، چوپائی، واراں،
ردیفیں، تعلّی، تخلص، لقب، عرف، تلمیح، تمثیلچے
کافیاں، چکیاں، لوریاں، پنکھیاں، ڈھولیاں، چرخ نامے
شگوں، فال نامے
صنائع بدائع، فصاحت، بلاغت، سلاست، اضافت
زبان و بیاں، علتیں، جزم، تشدید، ترکیب، لکنت بھی
تان، انترہ، بکھرہ، استھائی بھی

وزن، تقطیع، بحریں، زحافات بھی
حسنِ ترتیب، آہنگ، دھن، گنگوی
تال، سُر، ٹھمریاں، مُرکیاں،
انگ، اُپ انگ، سَم بھنگ، آبھنگ، تر بھنگ
بھاؤ، نرت، تھاپ، تھیّا،
کتھک، ناتیم،
تھاتھئی، تر تکی —— رخصتی

(54)

جستجو، شوق، تحقیق، اظہار
تخصیص، حیرت، تجسس
تلاش، آرزو
ذوقِ فن، سّرِ تخلیق، مشقِ سخن
ذہن کی دسترس
گائیکی، شاعری —— رخصتی

(55)

بلدیے، صدعروس البلاد، آسمانوں کو چھوتی عمارات کی منزلیں
چارمینار، قلعے، کلس، کنگرے، برجیاں
اونچی اونچی فصیلیں، اکیلے دکیلے ستوں
مرمریں مقبرے، اونچی کرسی کے ایواں
سراپردہ وخواب گاہیں،
طویل آبناؤں پہ تانے ہوئے پُل، بندھے بند، بندر گہیں، زیرِ آب وزمیں راستے
بر سرِ خاک سہ رویہ، سہ منزلہ، شش جہت شاہراہیں
عجوبے، اجنتا، ایلورا، معلّق گلستان، اہرام

پیسا، محل تاج، دیوارِ چیں، تختِ طاؤس
ڈھلوان چھت، آہنی گھنٹیاں، بت، سنگھاسن کی اونچائیاں
شوکتِ منبر و شانِ محراب، گنبد کی گولائیاں
شوقِ تعمیر و صورت گری رُخصتی

(56)

آ ہی لیتی ہے آخر
دبے پاؤں انسان کو دہر میں
گھر، گلی، شہر میں
ہر نہاں خانۂ ذات کے پھیر میں
گنبدِ ہفت افلاک کے گھیر میں گونجتی، سر پھری رُخصتی

(57)

سست رو، تیز گام
اور خاص اور عام
اِس طرف اُس طرف یعنی چاروں طرف
ناک کی سیدھ میں
ایک ہی راستہ، راستی —— رُخصتی —— رُخصتی —— رُخصتی

☆☆☆

کیا نثر لکھنا شاعری سے زیادہ مشکل کام ہے؟

شہزاد احمد

ناصر شہزاد

گیت

پیا کی پریت میں میاری میا
یہ دل ناچے تتا تھیاری تھیا
پیا کی پریت ....

چٹانوں سے اتر کر زرد سورج
انڈیلے آتما میں درد سورج
اٹد کے پربتوں پر چھائیں بادل
بکھیریں آنسوؤں میں سرد کاجل
لگی ہے گھاٹ پر نیاری نیا
یہ دل ناچے ....

رُنک کر پائیں پاؤں میں باجیں
مرے ہردے میں سر مرلی کے گاجیں
پہاڑوں سے پگھل کر برف اترے
بدن کے پتھ......ملن کا حرف اترے
جلائیں دیپ رستے پر کنہیا
یہ دل ناچے ....

کھڈوں سے آئیں بازوں کی صدائیں
اندھیرے سے اجالوں کو ملائیں
الجھ جائے تڑپ اک آتما سے
ملے دھن دھیان سب پرماتما سے
کھلے چھم چھم میں سم دیاری دیا
یہ دل ناچے ....

ادیب سہیل

عمارت

زلزلہ وہ آیا کہ کیا کیا عمارت ڈھے گئی
جو بھی اس کی فیل پا ٹھوکر کی زد سے بچ رہی
ٹوٹے روزن، پچکی چھت، اکھڑی منڈیروں، کبڑی دیواروں کا گھوارہ ہوئی
خستگی وہ آئی کہ استادہ رہنا مسئلہ سا ہو گیا
مسئلہ کے حل سے بام وقت عاری
اور مستقبل......؟
عجب سی بے یقینی کے سرے سے بستہ وآویزاں سا

اور اس برزخ میں وہ
اپنے سقف و بام کو دے کر دلانوں سے اٹھان
اپنے ظاہر کو اڑھا کر رنگ و روغن کی ردا
ہر اقامت خواہ سے ہے داد خواہ
تاکہ ٹوٹے روزنوں، اکھڑی منڈیروں، کبڑی دیواروں
کا جاری رکھ سکے قاتل سفر!

صلاح الدین ایوبی

بصرے کا نوحہ

کس نے انہونی سی کر دی
کس نے چھیڑا دیپک راگ
دیپ جلے ہیں نگری نگری
شعلے ہر ساحل پر رقصاں
رستے رستے جلتا دریا
گلی گلی میں ایک الاؤ
اُس کی ساری کلا مہان

اُس کے سامنے دم سادھے ہیں
سارے پنڈت بال سمان
بس کر دے اب راگ سے روشن
ہر کُٹیا ہے اگنی دان!
پانی کی اک بوند نہیں ہے
ہونٹوں نے کھوئی مسکان
ناری کی گودی میں بالک
جانے کب سے بلک رہا ہے

پیاسے ہونٹ کلیجہ چھلنی
ممتا رو رو ہوئی ہلکان
پیاسا بالک کب تک روتا
ہچکی لے کر شانت ہوا ہے
(دھیرے بول ارے نادان)
ہر دے میں بس ایک ہی مورت
ہوش نے کھو دی ہر پہچان
دیپ جلے ہیں دیپ بجھے ہیں
تیرا راگ ہے شکتی مان!!

وانا میں بصرے کا منظر
ایک عرب ہے اک افغان
پاپ بھی دونوں کا سانجھا ہے
دونوں کا راکھا بھگوان!

تسلیم احمد تصور

جل تھل

ایسی گہری کالی راتیں ، خود کو ڈھونڈ نہ پاؤں
ایسے آگ اُگلتے دن تھے ، ہو گئے کالے پتھر
اُس کے دو میٹھے بولوں نے چھین لیے دُکھ سارے
اُس کی اِک مُسکان نے میرا کر دیا جل تھل اندر

ہوا کے ہاتھ

اوڑھنی اُس کے ہاتھ سے چُھٹ گئی تیز ہوا کے ہاتھوں
یوں سِمٹی وہ لاج کے مارے جیسے چُھوئی مُوئی
تم جانو یہ ہاتھ ہوا کے روکے سے نہیں رُکتے
لال گُلال ہوئی وہ ایسے جیسے بِیر بہوٹی

تن کی خوشبو

جِھجکی، سِمٹی ، خود سے اُلجھتی ، ہر آہٹ پر ٹِھٹکے
سانجھ بھئے جب باغ میں مجھ سے وہ ملنے کو آئے
دھڑ دھڑ کرتی اُس کی دھڑکن ، کر دیتی ہے پاگل
اُس کے تن کی سوندھی خوشبو ، میرا تن مہکائے

ترنم ریاض (نئی دہلی)

کیوں

کبھی کالج کا البم دیکھ کر
نم ہونے لگ جاتی ہیں کیا
پلکیں تمھاری
یا کبھی بچوں سے ہنستے بولتے
یکلخت رک جاتے ہو تم
شاخوں سے
پتے ٹوٹنے کی رت میں
بکھرے بکھرے رہتے ہو
یونہی بس بے خیالی میں
کسی بھولی ہوئی میری ادا سے
تم ملاتے ہو ادائیں دوسروں کی
یا مرے قد میری صورت سے
کوئی ملتا سا چہرہ دیکھ کر
تم مسکرا کر جھینپ جاتے ہو؟
جو تم ایسا نہیں کرتے،
تو بولو کیوں نہیں کرتے؟

جنت

بوجھ ڈھوتے مرے جذبات
بدن، روح، نظر
چند لمحات کی خلوت کے لیے روتا ہوا
یہ مرا بھیڑ سے گھبرایا وجود
کہیں گم ہونے کو کوشاں
ذہن بے چارہ سا
اب کہیں جا کے سکوں پائے گا

یہ سکوں شب کا
یہ تنہائی مرے کمرے کی
اس سے جنت بھی بھلا
اور حسیں کیا ہوگی

محمد فیروز شاہ

ہمراز کی راز بیانی

صبح کا تارا امر ہمراز ہے

جاگتا رہتا ہے وہ بھی رات بھر

زخم کو مشعل بنانے میں ہے وہ میرا رفیق

شب کی پلکوں پر ستارے ٹانکنے کے

فن سے بھی ہے آشنا!

زخم کی صورت گری میں

وہ مرا ہمکار ہے

رات کے خاموش سر پر

صبح کی دستار ہے

میرے دکھ سن سن کے وہ

ہو جاتا ہے آنسو مثال

اور میرے زخم چن چن کر

ددائے آسماں پر

ٹانکتا رہتا ہے

تاروں کی طرح!

اور میں

اس غمگسار و ہمدم و ہمدرد ساتھی کے لیے

آنکھ آنگن میں سجاتا ہوں ستارے

رات بھر

ہم کلامی کے یہ لمحے بھی عجب اسرار ہیں

شب کے سناٹے میں بے آواز طرزِ گفتگو

جیسے دل کو کھینچ لے گل کی صدائے

مشکبو!

اشتراکِ غم رفاقت سے سدا مربوط ہے

زندگی اور درد کا رشتہ بہت مضبوط ہے

سعدیہ قریشی

آگہی !

وہ قضائے ناز کچھ اور تھی
کسی خواب صبح جمال کی !
یہ جو ایستادہ راہ شام زوال ہے، کوئی
اور ہے
وہ جو بے کنارسی وسعتوں میں اڑان تھی
کوئی اور تھی ......!
یہ شکستگی پر و بال کی ......!
عجب بے بسی میرے حال کی ......
کوئی اور ہے
وہ جو خوش گماں ہمالیہ پہ قیام تھا کئی
روز سے
کوئی اور تھا ......!
یہ جو پستیوں کے سفر میں گہری ہیں
کھائیاں ......کوئی اور ہیں
کسی خواب خوش کے تھے ولولے
کہ جہان فتح کریں گے ہم ......کوئی
اور تھے
یہ شکست ذات کے مرحلے

یہ ہزیمتیں کوئی اور ہیں
سر شاخ جاں وہ کلی جو ایک مہک رہی
تھی گلاب کی
کوئی اور تھی ......!
تہی دامنی میرے شہر کی
یہ تباہیاں کس جبر کی ......کوئی اور ہیں
وہ جو ابتدائے سفر میں ساتھ تھیں خواہشیں
کوئی اور تھیں ......!
یہ جو رائیگانی وقت ہے ......!
یہ جو تیری میری شکست ہے ......
کوئی اور ہے
وہ جو ایک دنیا بسائی تھی ...... تیرے
نام پر
کوئی اور تھی !
یہ جو حسرت در و بام ہے، یہ جو زرد و
میری شام ہے
یہ کوئی اور ہے !

Publishers, — پبلشرز
Booksellers, — بکسیلرز
Exporters. — ایکسپورٹرز

سعود عثمانی

سورج کے لیے

ایک پرندہ ٹہنی ٹہنی ڈولتا ہے
مجھ میں کوئی اڑنے کو پر تولتا ہے

کُنج چشم سے کُنج لب تک آتے ہوئے
ڈھلتا آنسو لمحہ لمحہ بولتا ہے

کوئی تو ہے جو تلخ سمندر کی تہ میں
چپکے چپکے میٹھا دریا گھولتا ہے

سانس میں ریت کی لہریں کروٹ لیتی ہیں
اب میرے لہجے میں صحرا بولتا ہے

سعود عثمانی
16/03/05

E mail saud_usmani@hotmail.com ★ موہن روڈ، چوک اردو بازار، کراچی 7722401 ★ 190- انارکلی، لاہور، پاکستان 7353255 - 7243991 ★ 14- ... 7324785 7324412

امجد اسلام امجد

⊙

چلے گی یہ پریشانی کہاں تک! بتا اے گھر کی ویرانی، کہاں تک!
بہت لمبی تھی اب کے، خشک سالی برستا آنکھ سے پانی، کہاں تک!
ترے ٹوٹے ہوئے گجروں کے ہوتے مہکتی رات کی رانی، کہاں تک!
رُکے گی کب تلک سانسوں میں خوشبو اُڑے گا رنگ یہ دھانی، کہاں تک!
کرشمہ در کرشمہ ہے یہ دنیا کہاں تک ہے یہ حیرانی، کہاں تک!
کھلونا ہے، اِسے تو ٹوٹنا ہے کریں دل کی نگہبانی، کہاں تک!
اُسے بادل بلاتے ہیں ہمیشہ سمندر میں رہے پانی، کہاں تک!
کہاں تک ہے مری زنجیر لمبی میسر ہے یہ آسانی، کہاں تک!
سخن کی ساکھ بنتی ہے اسی سے کہ ہیں کس بات کے معنی، کہاں تک!
قفس میں کون سنتا ہے، کسی کی کریں گے شور، زندانی، کہاں تک!

ق

نہیں ہے میل دنیا اور دل کا بہم ہوں آگ اور پانی کہاں تک!
خود اپنی ذات سے انکار کر کے کسی کی بات ہے مانی، کہاں تک!
ہمارے چوک میں اُترے ہیں کپڑے چھپائیں گے یہ عریانی، کہاں تک!
سرِ محفل، انا کی خودکشی پر کریں اب مرثیہ خوانی، کہاں تک!

لیے جاتی ہے امجدؔ آدمی کو ذرا سی ایک نادانی، کہاں تک!

انور شعور

⊙

ہونے کے باوجود کہاں بات ہوتی ہے
ان سے مشاعروں میں ملاقات ہوتی ہے

پہلے ہم آنسوؤں میں نہاتے تھے اور اب
ہوتی بھی ہے تو نام کی برسات ہوتی ہے

ہم پر نہیں ہے کوئی توجہ تو کیا ہوا
اس گھر میں ہر کسی کی مدارات ہوتی ہے

ہر طرح کی شراب کا ہے تجربہ ہمیں
یہ چیز واقعی بڑی بدذات ہوتی ہے

بیٹھے ترستے رہتے ہیں ایک ایک چیز کو
مت پوچھ کس طرح گزراوقات ہوتی ہے

خود سے مقابلے کا ارادہ ہے دیکھیے
اب جیت ہوتی ہے کہ ہمیں مات ہوتی ہے

خوابوں کا کوئی وقت مقرر نہیں شعور
ہوتا ہے دن خراب کبھی رات ہوتی ہے

⊙

خیالوں میں کر لی جہانوں کی سیر
زمینوں کی سیر آسمانوں کی سیر

اسی مختصر زندگی میں ہمیں
کرا دی گئی ہے زمانوں کی سیر

عجب لطف دیتی ہے تالاب پر
پرندوں کی نیچی اڑانوں کی سیر

تصور میں ہم نے کئی مرتبہ
ترے ساتھ کی بوستانوں کی سیر

بہت غم کے مارے نظر آئیں گے
کرو شہر کے بادہ خانوں کی سیر

سرِ شام کرتے ہیں چھت سے شعور
ہم اپنی گلی کے مکانوں کی سیر

محمد ظہیر

⊙

نظر کے سامنے منظر حجاب جیسا تھا
وہ چہرہ دیکھنے میں بھی نقاب جیسا تھا

مٹی مٹی سی تھی تحریر خستہ کاغذ پر
وہ دن گئے کہ وہ چہرہ کتاب جیسا تھا

بنا سنوار کے رکھنا اسے مصیبت تھی
ہمارا دل بھی جہانِ خراب جیسا تھا

یہ کیا کہا کہ ہماری کسی سے نبھ نہ سکی
ہمیں تو جو بھی ملا وہ جناب جیسا تھا

ہر ایک نقش کفِ پا تھا گمرہی کا سبب
نظر جو آیا وہ دریا سراب جیسا تھا

نہ کی وہ بات جو الجھن میں ڈالتی اس کو
سوال جو بھی کیا وہ جواب جیسا تھا

تھا ایک سایہ جسے ڈھونڈھنے چلے تھے ہم
جو اپنے ذہن میں نقشہ تھا، خواب جیسا تھا

جو کہنا تھا وہ اسے کہہ گیا اشاروں میں
سکوت اس کا بھی گویا خطاب جیسا تھا

تمام عمر کٹی پل صراط پر چلتے
ہر ایک دن ہمیں روزِ حساب جیسا تھا

کچھ ایسا تیز تھا موسم چمن بھی جلنے لگا
ہر ایک شاخ پہ شعلہ گلاب جیسا تھا

نہ جانے سوچ اسے کیسی کھائے جاتی تھی
وہ زرد ڈھلتے ہوئے ماہتاب جیسا تھا

ظہیرؔ ڈوبا جو اس میں وہ پھر نہیں ابھرا
کہ اقتدار کا نشہ شراب جیسا تھا

عازم گروِندر سنگھ کوہلی (نئی دہلی)

⊙

میں بساتا ہوں بستیاں کیا کیا
چھوڑ جاتا ہے تو نشاں کیا کیا

میں نے سوچا ، ہوا عیاں کیا کیا
یہ نہ جانا کہ ہے نہاں کیا کیا

پار کیا کیا ہے پار کے آخر
درمیاں کے ہے درمیاں کیا کیا

چھپ کے بیٹھا ہے تو جہاں اے رب
یہ تو بتلا کہ ہے وہاں کیا کیا

آئیں گردش میں گردشیں کتنی
سر پہ پھرتے ہیں آسماں کیا کیا

کیسے کیسے خیال آتے ہیں
مست کرتی ہیں مستیاں کیا کیا

خوب سے خوب تر ہوئی ہستی
تجھ میں دیکھی ہیں خوبیاں کیا کیا

نیز کس کس ہدف کو جالیں گے
لوچ دیتی رہی کماں کیا کیا

اک یقیں ہے فقط یقیں تیرا
بے گمانی ترے گماں کیا کیا

تجھ کو پانے کے واسطے میں نے
رنگ بدلے کہاں کہاں کیا کیا

راز کھلتے رہے نگاہوں سے
جال بنتی رہی زباں کیا کیا

دیکھ کیا کیا گنوا دیا عازمؔ
ہو گیا ، سوچ ، رائیگاں کیا کیا

ڈاکٹر سیفی سرونجی (بھارت)

⊙

تو نے دیا تھا زہر اگلنے لگا ہوں میں
تیری طرح سے چال بھی چلنے لگا ہوں میں

سب کچھ خدا نے مجھکو زمانے میں دیدیا
پھر بھی حسد کی آگ میں جلنے لگا ہوں میں

کہتے تھے مجھکو لوگ اُجالوں کا دیوتا
ہونے لگی جو شام تو ڈھلنے لگا ہوں میں

بیٹھا ہوں چپکی سادھ کے گوشے میں آجکل
دنیا کا رنگ دیکھ کر چلنے لگا ہوں میں

٥

اک بات اس نے کان میں ایسی کہی ہمرے
سن کر جسے خوشی سے اچھلنے لگا ہوں میں

ڈاکٹر نزہت اکرام

⊙

میں شعلے اُگلتا سماں دیکھتی ہوں
میں جلتا ہوا اک جہاں دیکھتی ہوں

ہیں تاراج خرمن ، خزاں دیدہ گلشن
میں اجڑے ہوئے بوستاں دیکھتی ہوں

کہیں جشن پیہم ، بیاباں بیاباں
کہیں بحرِ غم بے کراں دیکھتی ہوں

کہیں مائیں گریاں ، کہیں باپ لرزاں
تڑپتے ہوئے جسم و جاں دیکھتی ہوں

ہے زخمی نظر اور زخمی قدم بھی!!
میں کانٹوں بھرا اک جہاں دیکھتی ہوں

کوئی آنکھ شعلہ ، کوئی دل پھپھولہ
نیا دور رنگ زماں دیکھتی ہوں

ہر اک گام رہبر کا ہے وقف لغزش
بھٹکتا ہوا کارواں دیکھتی ہوں

عروج ہوا و ہوس پر ہیں انساں
میں پستی اہلِ جہاں دیکھتی ہوں

نگاہوں میں تارے ہیں لرزیدہ نزہتؔ
میں خوں سے بھری کہکشاں دیکھتی ہوں

محمد اعظم احساس

⊙

جانے کس رو میں ہوں بے سمت چلا جاتا ہوں
میں ہواؤں کے تعاقب میں بڑھا جاتا ہوں

اجل آتی ہے گرا دیتی ہے پیکر میرا
پھر تری کوزہ گری سے میں اٹھا جاتا ہوں

میں وہ تحریر ہوں جس کو نہیں سمجھا کوئی
صفحۂ دیر پہ مدت سے لکھا جاتا ہوں

شب یلدا سے ڈرا ہوں نہ شب غم سے ڈرا
اے سحر تیرے اجالوں سے ڈرا جاتا ہوں

میرے الفاظ کے معنی ہیں ذرا غور طلب
وہ سمجھ بیٹھا ہے میں اس پہ کھلا جاتا ہوں

ایک احساس ہے جینے نہیں دیتا مجھ کو
بے حسی یوں ہے کہ چپ چاپ مرا جاتا ہوں

سورج
شاہد واسطی

غزل

مجھ کو عزت بھی ملی فن بھی اجاگر ہو گیا
میں جو اپنی ذات سے تھوڑا سا اوپر ہو گیا

دیکھنا چاہا تو آنکھوں میں چمک پڑنے لگی
اک ذرا پاؤں بڑھایا تھا کہ پتھر ہو گیا

ہاں وہی جس کو سلیقہ بات کرنے کا نہ تھا
ہاں وہی لڑکا دنوں میں ہم سے بہتر ہو گیا

گھر کی خاموشی میں اک آواز تک آتی نہیں
شور کچھ ایسا بپا اس دل کے اندر ہو گیا

ہم نے جس کو احتراماً آنکھ بھر دیکھا نہ تھا
اک ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہوگیا

ایسی اس کو راس آئی شہر کی آب و ہوا
پیڑ نفرت کا بہت جلدی تناور ہو گیا

میں نے وہ فنکار بھی دیکھا ہے شاہد واسطی
فن کو سینچا خون سے اور آپ بے زر ہو گیا

ظفر علی راجا

⊙

یہ سب کرشمۂ وہم و گماں ہو ، ناممکن
یہاں نہ ہو کے بھی ، کوئی یہاں ہو ، ناممکن
بچا ہے ایک جو ، طوفانِ برق و باراں سے
وہ آشیاں ہی میرا آشیاں ہو ، ناممکن
تمام عمر بھی کافی نہ ہو ، یہ ممکن ہے
بس اک نشست میں اُن کا بیاں ہو ، ناممکن
ہوا کے ساتھ یہ سازش ہے ریت کی ورنہ
سراب ، سیل کی صورت رواں ہو ، ناممکن
کوئی تو پیشِ سفر ، دشت کے سفر میں ہے
نہ کوئی عزم ، پسِ کارواں ہو ، ناممکن
وہ آسمان جو چھایا ہے ، چاند تاروں پر
ہماری شب پہ وہی آسماں ہو ، ناممکن
وہاں اک اور یہی دنیا ہے منتظر اپنی
افق کے پار ہے خاکداں ہو ، ناممکن
مجھے اے زیست نہیں ، اعتبارِ دل ، کچھ بھی
میرا رقیب ، ترا پاسباں ہو ، ناممکن
ہمارا پیار ہے ہر شک سے ماورا راجاؔ
کوئی گمان ، کہیں درمیاں ہو ، ناممکن

تسلیم احمد تصور

⊙

مل جائے اماں دنیا میں پل بھر ، نہیں لگتا
پا جائیں سکوں دائمی مر کر ، نہیں لگتا

پانی کی طلب لائی کہاں سے یہ کہاں پہ
صحرا سا تو لگتا ہے یہ ، ساگر نہیں لگتا

اُس کوچۂ دلبر میں یہ کیا خاک اُڑی ہے
وہ تو نہیں ، اُس کا کوئی ہمسر نہیں لگتا

اک روز نہ مل پائیں ، گزارا نہیں ہوتا
ہر روز ہی ملتے ہیں ، یہ مل کر نہیں لگتا

ہر دن کی طرح دن بھی یہ کاٹے سے کٹے گا
یہ شب بھی گزر جائے گی ، اکثر نہیں لگتا

کچھ دن سے عجب بیکلی گھیرے ہے تصوؔر
کچھ دن سے مجھے اپنا ہی گھر ، گھر نہیں لگتا

زاہد آفاق

⊙

کچھ یقیں رہنے دیا کچھ واہمہ رہنے دیا
سوچ کی دیوار میں اک در کھلا رہنے دیا

کشتیاں ساری جلا ڈالیں انا کی جنگ میں
میں نے بھی کب واپسی کا رستہ رہنے دیا

میں نے ہر الزام اپنے سر لیا اس شہر میں
باوفا لوگوں میں خود کو بےوفا رہنے دیا

ایک نسبت ، ایک رشتہ ، ایک ہی گھر کے مکیں
وقت نے دونوں میں لیکن فاصلہ رہنے دیا

جاگتی آنکھوں میں کیسے خواب کی تعبیر تھی
عمر بھر جس نے کسی کو سوچتا رہنے دیا

ایک سائے کا تعاقب کر رہا ہوں آج تک
خود کو کیسی ابتلا میں مبتلا رہنے دیا

وہ مری راہوں میں دیواریں کھڑی کرتا رہا
میں نے ہونٹوں پر فقط حرفِ دعا رہنے دیا

پیار میں اب نفع و نقصان کا کیا سوچنا
کیا دیا اس کو اور اپنے پاس کیا رہنے دیا

اپنی کچھ باتیں درِ اظہار تک آنے نہ دیں
بند کمرے ہی میں دل کو چیختا رہنے دیا

پھر نہ دستک دے سکا آفاقؔ کوئی اس کے بعد
نام اس کا دل کی تختی پر لکھا رہنے دیا

عنبرین صلاح الدین

⊙

بھنور میں پیر تھے اور آس اک ستارے پر
الجھ رہی تھی نظر دوسرے کنارے پر

تکان اوڑھ ہی لیں گے نئی مسافت کی
تراش دیں نہ ہوائیں کہیں ہمارے پر

نجانے سحر تھا کیسا کسی کی آنکھوں میں
ہم اپنے گھر سے نکل آئے اک اشارے پر

زمیں پہ پھر کوئی جائے امان مل نہ سکی
مجھے کسی نے بلایا تھا اک ستارے پر

گماں کے آخری پل میں یقیں ملا ایسا
ہمیں یہاں ہیں ، ہمیں دوسرے کنارے پر

ڈھلی ہے شام تو نظریں بھی جم گئیں جاناں
فلک سے جھانکتے چاہت کے استعارے پر

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

⊙

بُرا ہے یا بھلا کرنا پڑے گا
مجھے خود کو ترا کرنا پڑے گا

ابھی تو ابتدائے عشق ہے یہ
اسے اب انتہا کرنا پڑے گا

مجھے ہر حال میں سچ بولنا ہے
زمانے کو خفا کرنا پڑے گا

وہ اپنے آپ میں رہنے لگا ہے
اسے اس سے جدا کرنا پڑے گا

نہیں سنتا کوئی سوچیں پرانی
ہمیں اب کچھ نیا کرنا پڑے گا

محبت میں کہاں گم ہو گئے ہیں
ہمیں اپنا پتہ کرنا پڑے گا

حیاتی قرض ہے سعدؔی خدا کا
اسے اک دن ادا کرنا پڑے گا

نثار ترابی

⊙

دیتی تھی گام گام پہ ہر رہ گزر فریب
سارا سفر فریب تھا سارا سفر فریب

پھر یوں ہوا کہ چھت مری مجھ پر ہی آ گری
مجھ کو تو دے گئے مرے دیوار و در فریب

پسپائیوں کے بعد بھی زندہ رہا تھا میں
کاندھوں پہ دے رہا تھا مجھے میرا سر فریب

تھا واقعہ عجیب یہ شہرِ طلسم کا
یعنی جدھر نگاہ گئی ، تھا اُدھر فریب

کیا رنگ تھے جو آنکھ میں آ کر ٹھہر گئے
کیا آس تھی جو دیتی رہی عمر بھر فریب

اسلم کولسری کا غیر ملکی شعری ادب سے انتخاب
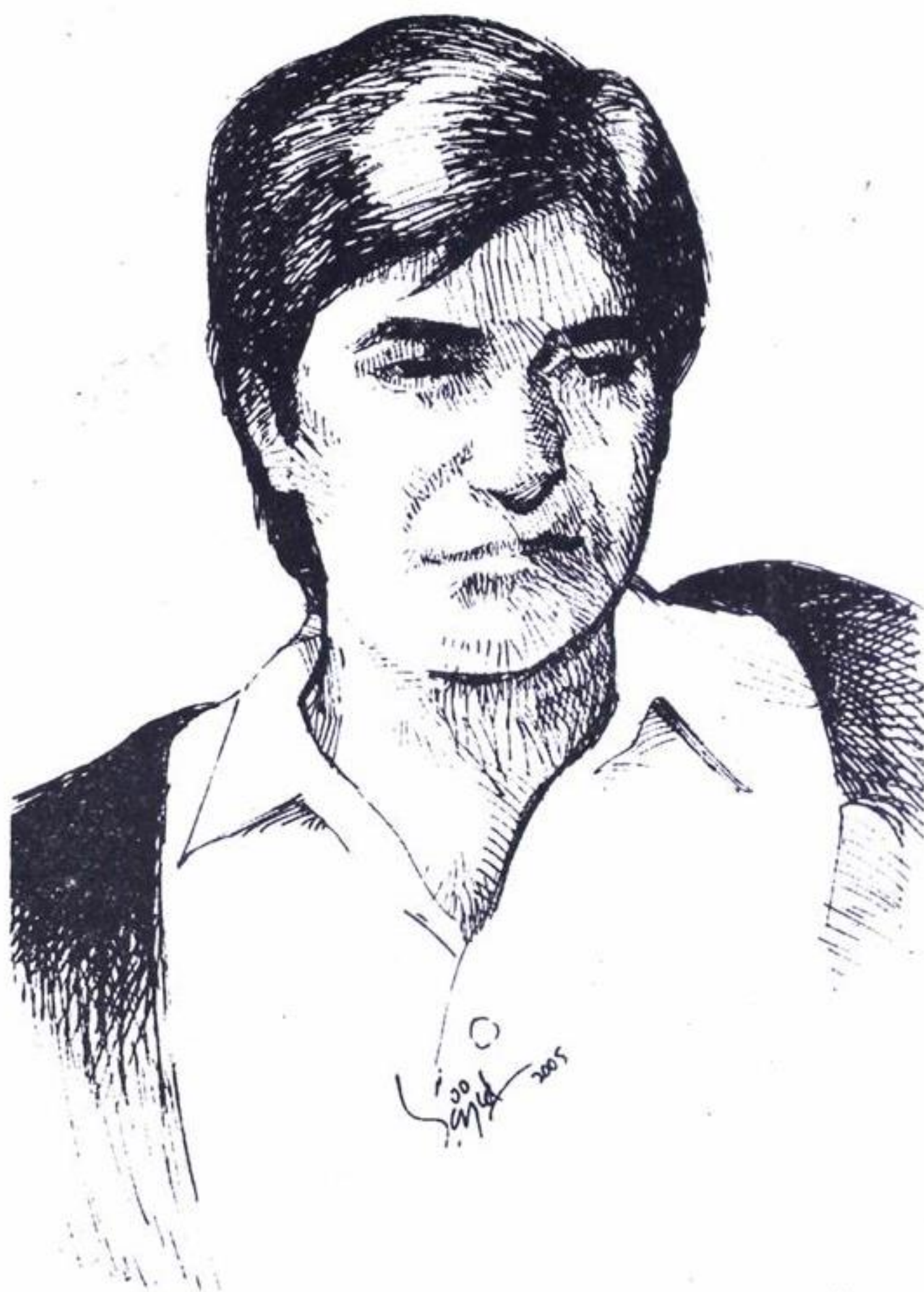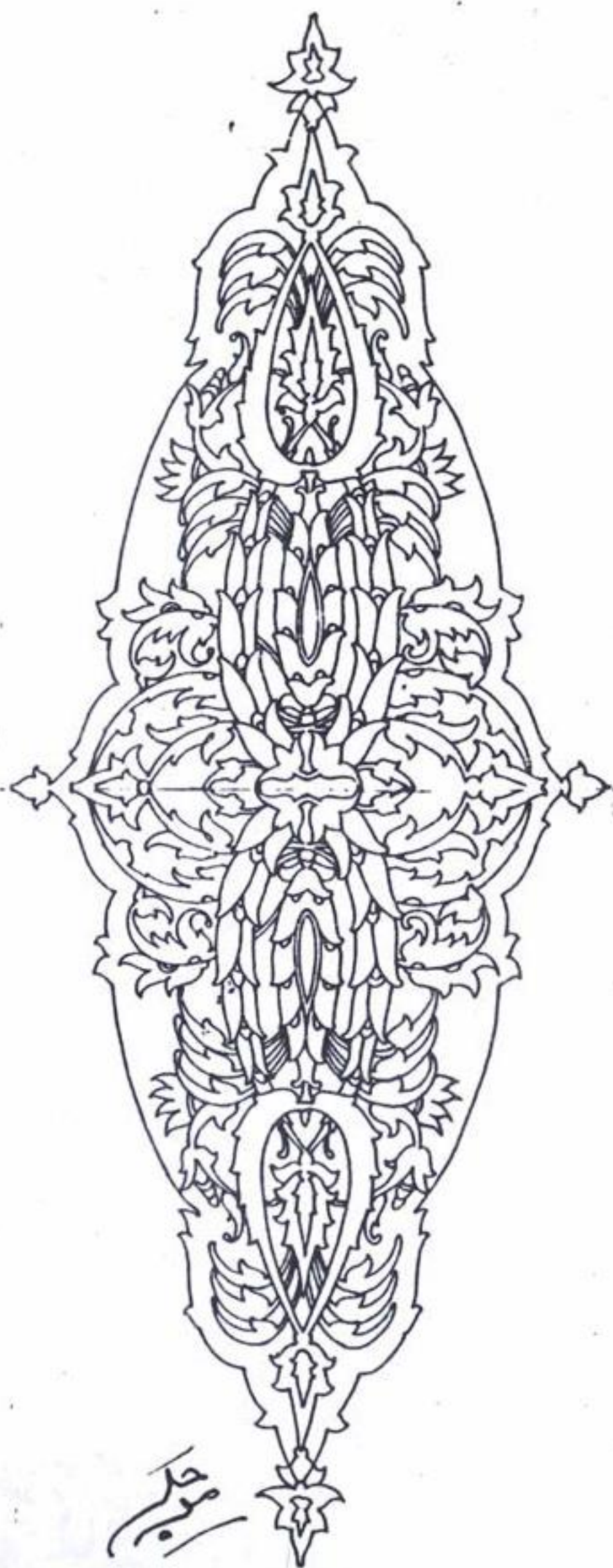
HANNES PETURSSON

1931--(Iceland)

ہرے بھرے درخت سے مکالمہ

(ترجمہ)

مجھ کو شعر نہیں کہنا ہے

جب تک ہو محسوس نہ مجھ کو

میرے لہو میں تم شامل ہو

اور میں ''میں'' نہیں گویا ''تم'' ہوں

تاریکی اور نور کے ہاتھوں میں ہرے پتوں والا بربط

میں آکاش اور دھرتی بیچ اک ایسا زندہ پُل بن جاؤں

جو سورج اور ٹھٹھری دھرتی یکجاں کر دے

جیون کے ہاتھوں میں توانا بربط کی صورت ہو جاؤں

بربط جو زندہ تاروں سے بھرا ہوا ہو

جیسے تم ہو۔۔۔

مجھ کو شعر نہیں کہنا ہے

HANNES PETURSSON

1931--(Iceland)

درخشاں رات

(ترجمہ)

لو، گرما کی رات آئی ہے

اور شمال کی جانب آگ ہوئی ہے روشن

جس کے شعلے اک اک کر کے

آسمان کا نیلا چہرہ چوم رہے ہیں

لیکن شہر میں شام کے سائے پھیل رہے ہیں

اور گلیاں خاموش اور گم سم

اونچے سُروں میں سوچ رہی ہیں
گھور رہی ہیں پیلے لیمپوں کی آنکھوں کو

سارے گھروندے بند ہوئے ہیں
جن کے اندر باتوں اور بوسوں کی کلیاں مہک رہی ہیں

پس منظر میں
کوہساروں کے پتھریلے کندھوں پر
جوں آکاش نے آگ سجا رکھی ہے

HANNES PETURSSON

1931– (Iceland)

طلوع

(ترجمہ)

پھر بین الاقوامی شہر پہ

مست، جوان، گلابی صبح نے انگڑائی لی

اخباروں کی شہ سرخی خاموش ہوئی ہے

اور کل کے اخبار

گھروں کے کونوں کھدروں میں جا

اپنی اپنی قبریں ڈھونڈ رہے ہیں

یکہ گاڑی والے

سوئی سوئی آنکھیں لے کے

مسافر کی رہ تکنے سے باز آئے

بنکوں والے

قرضوں کی درخواستوں اور بلوں پر

غور و خوض میں ڈوبے سر کھجلائیں

بوڑھے ٹاور کے گھڑیال پہ گھنٹا باجے

بندرگاہ کا بہت سی انگلیوں والا ہاتھ

تجارتی بیڑوں اور سفینوں پر اک پنجے کی صورت میں بند ہوا ہے

اور اک تنہا پنچھی کی آواز پہ ٹھنڈی خاموشی نے

بوجھل دائرہ کھینچ دیا ہے۔

AARO HELLAAKOSKI

1893-1952--(Finland)

مصور

(ترجمہ)

پھر سارا دن بیت گیا

اس من موہنے منظر میں

پیڑوں اور کہساروں کو

میں نے پیاسی آنکھوں سے

دن بھر چوما چکھا ہے

لو پھر گہری شام ہوئی

اور میں سرد صنوبر کے اجلے اجلے پتے بھی

کاغذ پر نہ اُتار سکا

OTTO MANNINEN

1972-1950- (Finland)

میں ہوں کاشتکار کپاس کا

(ترجمہ)

ارے بھیا، یہ جو کپاس ہے
تو یہ دوسروں کا لباس ہے
میں ہوں کاشتکار کپاس کا
جو کپاس بوتا ہے اس لیے
کہ یاں دوسروں کو خوشی ملے
میں اگرچہ اشک ہی اشک ہوں
مرے من میں چیخ ہی چیخ ہے

وہ جو شام ڈھلتی تھی شہر میں
تو افق پہ جھومتا ابر سا

میں نے جب بھی دیکھا، یہی لگا

کوئی سرخ۔ چادرِ سرخ ہے

میں جو مطمئن تھا یقین سے

وہ یقین مجھ کو نہیں رہا

یہ جو ابر ہیں، فقط ابر میں

بھلے مہرِ شام کی زرد لَو

انہیں سونا سونا نکھار دے

اور یہ جو خواب و خیال ہیں

یہ جو حسرتیں ہیں متاعِ جاں

یہ بھی دردِ سر ہیں، فضول ہیں

کسی اجڑی راہ کی دھول ہیں

یہ خوشی ہے جو، تو میں کیا کہوں

فقط اک کہانی

سنا گیا ہو جسے کوئی

بڑی تیزی سے۔ کسی جلدی میں

V.A.KOSKENNIEMI

1885-1962-- (Fin Land)

معصوم بچے کی قبر

(ترجمہ)

کالی رات سے نکلا تھا میں

رات کے اندر ہی کچھ دیر سفر کر دیکھا

جیون کا دن کیسا لوگو

پو پھٹنے کا منظر بھی نہیں دیکھا میں نے

فطرت کو منظور نہ تھا، میں دنیا دیکھوں

میں نے بھی یہ کب چاہا تھا

میرا آنا، پیدا ہونا۔۔۔بس یونہی تھا

میری قبر پہ نامانوس دھمک ہے کیسی

تیز قدم اٹھنے لگتے ہیں

ٹھوکر کھاتے

پھر سے سنبھلتے

اور پھر اگلی ٹھوکر کھاتے

او جیون کے دن میں چلنے پھرنے والے

یہ تو بتا دے

آخر کون ہے تو جو میری قبر پہ

یوں۔تیزی تیزی سے گھوم رہا ہے۔

THORSTEINN fra HAMRI

1938--(Iceland)

کھیت میں

(ترجمہ)

وہ دن ۔ جب نوجواں تھا میں

تو اپنے کھیت میں اکثر

کھڑے ہو کر

میں دریا پار کا نظارا کرتا تھا

جہاں کالا کنارا دیکھ کر میں سوچا کرتا تھا

کہیں ایسا نہ ہو

کالا کنارا گہرے پانی میں اچانک ہی اتر جائے

بکھر جائے

تو ٹھنڈے خوف کی اک لہر مجھ کو ڈھانپ لیتی تھی

سماں بدلا

اور اس کے ساتھ یہ انسان بھی بدلا

مگر میں تھا کہ اس کالے کنارے کو

ہمیشہ ذہن کی آنکھوں سے یونہی دیکھتا رہتا

اور اب یہ ہے

کہ میں کہتا ہوں

ہم تھوڑے سے کارندے اگر چاہیں تو مل کر

کچھ نہ کچھ تو کر ہی سکتے ہیں

مرا مطلب ہے دریا کے لیے ہم اک نیا رستہ بنا سکتے ہیں،

گر چاہیں

AARO HELLAAKOSKI
1893-1952--(Finland)

جنگل کی چاندنی

(ترجمہ)

رات کی سوئی سوئی سی شاخوں کے نیچے
پُراسراری روشنیاں پلکیں جھپکائیں
اس جنگل کے جھٹپٹے میں بھی
اک رستہ ہے
جو رستہ کہیں سے نہیں آتا
اور کسی گھر کو نہیں جاتا
میرا بدن بھی
چاندنی کی ٹھنڈی کرنوں میں بہہ سا گیا ہے
اور مرا سایہ ---یوں لگتا ہے
دور کہیں تحلیل ہوا ہے

مجھ کو تنہا چھوڑ گیا ہے

میرے قدم

مخمور ہوا میں ڈھیلے ڈھیلے جُھول رہے ہیں

اور میرے ہاتھ اس جنگل کے

خالی پن کو سہلاتے ہیں

P.MUSTAPAA
1899--(Finlands)

اناج کے پھول

(ترجمہ)

نرم دل؟
ہم کرخت جنگجو؟؟
کبھی نہیں

مگر یہ ہے کہ جب بھی ہم
اناج کی ہری حسین کھیتیوں کے درمیاں سے
رینگتے ہوئے گذرتے ہیں
تو اپنے ہملٹوں میں بھرتے ہیں
مہکتے پھول اناج کے

اجی سنا؟

مہکتے پھول اناج کے

اور ایسے میں۔۔۔ ہمارے گھر ہمیں بہت ہی یاد آتے ہیں

کہ ان مہکتے پھولوں کی لرزتی پتیوں میں ہم کو اپنے گھر کا آسماں

وہ نیلا آسماں

وہ گہرا نیلا آسماں

اور آسماں کے ساتھ ساتھ

نرم نرم زرفشاں، وہ اپنے گھر کی کھیتیاں

دکھائی دینے لگتی ہیں

جب ایک بار

جنگ کی اذیتوں سے چھوٹ کر

گھروں کو لوٹ جائیں گے

تو دیکھیں گے وہ آسماں

وہ گہرا نیلا آسماں

اور آسماں کے ساتھ ساتھ

نرم نرم زرفشاں

وہ اپنے گھر کی کھیتیاں

یہ سوچتے ہوئے مگر

لڑائی تمتما اٹھے۔۔۔فضا میں پھیل جائے آگ

توپیں دھاڑنے لگیں

تو اپنا بھائی۔ اپنا ہیرو۔۔۔دفعتاً

انہی مہکتے پھولوں میں

زمین و آسماں کے درمیاں کہیں

بہادری کے امتحاں میں کامران ہوتا ہے

لپٹ کے کالی آگ میں

وہ گہری نیند سوتا ہے

MAGNUS STEFANSSON
1884-1942 (Iceland)

چُوزے

(ترجمہ)

چوزوں کے ایک دڑبے میں
مرغا، مرغیاں، چوزے سب
مل جل کر خوش رہتے تھے
مرغا تھا سردار وہاں
اور سب اس کے تابع تھے
وہ سب پیار سے رہتے تھے
جوان کا دستور بھی ہے
لیکن پھر جانے کیسے

اک بوڑھی سی مرغی میں
ایک عجب خواہش جاگی
کوڑے کے اک ڈھیر پہ وہ
چڑھ کر اپنے پاؤں پر
کودنے اور اچھلنے لگی
اور پھر بڑی مشقت سے
اس نے گردن لمبی کی
تا کہ مرغے کی صورت
وہ بھی اذانیں دینے لگے
مرغا بڑی خاموشی سے
دیکھ رہا تھا مرغی کو
کرتا بھی بے چارہ کیا
پاگل سی اک مرغی اگر
کام ہے جس کا گھر داری
مانگنے پر آجائے حق
حق بھی اذانیں دینے کا

MAGNUS STEFANSSON
1884-1942 (Iceland)

آوارہ اور چنچل لڑکی

(ترجمہ)

یہ جو آتش فشاں جوانی ہے
یہ جو ساحر جمال ہے تیرا
جب یہ اک بار جل بجھی پیاری،
پھر نہ آئے کبھی، کسی صورت
زرد رخسار، منجمد دھڑکن
اور بیدرد درد جوڑوں کا
سب کے سب تیرے انتظاری ہیں
تو اگرچہ گلاب سرخی سے
اپنے گالوں کو سرخ کرتی ہے

رنگ لاتا نہیں مگر یہ رنگ
تیری کوشش ہے کارِ لاحاصل
اب تیری سمت کون آئے گا
تیری دوشیزگی کا اب کوئی
کیسے آخر فریب کھائے گا
چھوڑ دے اب ملمع سازی کو
یہ حماقت فضول ہے بے شک
یہ جوانی، یہ حسن و رعنائی
کبھی دریا جنم نہیں لیتے
اب تیری روح کیا ہے، بتلاؤں
داشتہ ہے لعین شیطاں کی
اور تیرا گوشت، یہ گناہی گوشت
کالی مٹی ہے، مردہ مٹی ہے

MAGNUS STEFANSSON

1884-1942-(Iceland)

سفر

(ترجمہ)

مقدر کے بہت لمبے سفر پر نوجواں نکلا

دمکتا تھا بدن امید کے دلدار شعلوں سے

نئی پاپوش سے رستے کی آنکھیں جگمگاتی تھیں

ادھر گٹھڑی میں خورد و نوش کا ساماں بھی وافر تھا

مگر جس چیز پر سب سے زیادہ ناز تھا اس کو

وہ اک نادیدہ چھاگل میں شراب عزم و ہمت تھی

مگر جب زندگی کے کوہساری مرحلے آئے

تو ہر سو برف برساتی ہوا کے تیز جھکڑ تھے

ہمارا نوجواں اک برف کے تودے پہ بیٹھا تھا

عجب اک ناتواں بے چارگی تھی اس کے لہجے میں

وہ بولا

"لو، مرے کھانے کی گٹھڑی ہو گئی خالی
مرے جوتے شکستہ کر گئی رستے کی بے رحمی
یہ رستہ کس قدر بے رحم ہے، معلوم ہے مجھ کو"

"گھسیٹوں کس طرح خود کو میں اس برفانی رستے پر
نہ میرے پاؤں میں جوتے، نہ کچھ گٹھڑی میں کھانے کو
چلو یہ تو ہوا
پھر بھی اگر کچھ ہوتا چھاگل میں
تو اپنے آپ کو میں مجتمع کر کے، ذرا چلتا
فقط آ کاش ہی اب آس ہے، میرا ٹھکانہ ہے
مرے مولا، مرے مولا، مری فریاد ہے مولا
عطا کر دے ذرا سی بوند میری خالی چھاگل کو
کہ میرے خاتمے کی سرد ساعت سر پہ آ پہنچی"
مگر یہ ہر طرف پر ہَول خاموشی سی کیسی ہے
تو کیا شنوائی کا لمحہ بھی آخر ہو گیا۔۔ آخر؟

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے ایک ملاقات

اردو زبان و ادب کی جان پہچانی شخصیت ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے پریم کمار کا یہ یادگار انٹرویو ہندی زبان میں شائع ہوا تھا۔ اس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی کا ہے۔ جو بھارتی جریدے شعر و حکمت کے تعاون سے نذر قارئین ہے۔

ادارہ

تپتی ہوئی دوپہر اور یہ اندیشہ بھی کہ کہیں آج بھی پروفیسر نارنگ کی مصروفیت ہماری گفتگو کو ملتوی نہ کرا دے۔ مگر ساہتیہ اکادمی کے صدر کے کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی نارنگ صاحب کے تسلی بخش رویے نے وہ سکون عطا کیا کہ گرمی کی ساری شدت کافور ہو گئی۔ اردو والوں کی گفتگو میں واقعی جادوئی اثر ہوتا ہے۔ تبھی تو آدمی فوراً اس کی کشش اور مٹھاس کی زد میں آ جاتا ہے۔ ایک منٹ —— بس ایک منٹ اور کی گردان کرتے ہوئے نارنگ صاحب نے کچھ فون کیے اور سنے۔ اس دوران میری نگاہوں نے ان کے دفتر کے ہر حصے کو بہ غور دیکھنے کی کوشش کی —— ساز و سامان، رکھ، رکھاؤ اور سلیقہ عجلت میں یہ سب دیکھتے ہوئے میری نگاہیں —— کہیں ٹھٹکیں، رکیں اور کہیں چونکیں —— قالین، پردے، صوفہ، میز کرسی سب نہایت دیدہ زیب اور پرکشش —— پروفیسر نارنگ کے جمالیاتی احساس کا اثر لیے ہوئے، سامنے کی الماریوں میں شیشے کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی اکادمی کی مطبوعات۔ میز کے ایک کنارے پر دو سفید اور ایک کالا ٹیلی فون۔ سامنے ایک خوب صورت قلم دان۔ دوسرے کنارے پر چند فائلیں اور کتابیں۔ کتابوں کے درمیان جگہ جگہ لگی ہوئی کچھ Slips۔ دو چشمے، ایک موبائل فون —— فون کرنے کے بعد پی۔ ایس کو بلاتے ہیں —— ''اب کسی کو آنے نہیں دینا ہے —— نو کالز پلیز ——

چائے کا ایک گھونٹ پینے کے بعد کرکٹ کا اسکور سنتے ہیں۔ پھر علی گڑھ اور وہاں کے ادیبوں کی خیریت دریافت کرتے ہیں۔ تکلفات ختم ہوتے ہی ——

میں نے ان کے نام کے لاحقے ''نارنگ'' کے بارے میں دریافت کیا۔ ہلکی سی مسکراہٹ اور چائے کی ایک چسکی لینے کے بعد بولے——

'نارنگ' میں 'نا' نفی کا نہیں ہے۔ یعنی اس میں رنگ کی نفی نہیں ہے۔ وادیٔ کاغان میں پشاور اور کوہاٹ کے درمیان نارنگ نامی ایک قصبہ ہے۔ شاید یہ نام یہیں سے چلا ہو۔ نارنگ سکھوں میں بھی پائے جاتے ہیں، نارنگ سنسکرت میں بھی ہے یعنی رنگ نہ بدلنے والا یا جس پر کوئی اور رنگ نہ چڑھے، دوسرے لفظوں میں 'وفادار'۔ ویسے جنم پتری میں میرا گوتر کشیپ ہے۔

پاکستان کی گفتگو نے نارنگ صاحب کے ماضی کی یادوں کو زندہ کر دیا۔ مزید استفسار کرنے پر کچھ دیر خاموش ہوگئے، پھر چھت کی طرف گھورتے ہوئے چائے کی چسکیاں لیتے رہے جیسے دور کے دھندلکوں سے کچھ ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ کلمے والی انگلی ہونٹوں پر ٹکی ہے۔ پھر کچھ سرگوشی سی سنائی دیتی ہے—— ''بلوچستان کے ایک دوردراز علاقہ دُکّی میں پیدا ہوا۔ دُکّی پاکستان اور ایران کی سرحد پر لورالائی ضلع کی تحصیل ہے۔ پتا جی مرحوم دھرم چند نارنگ بلوچستان

چار ایسے کام کیے جن سے میری عزت اور شہرت میں اضافہ ہوا

ریونیو سروس میں افسرِ خزانہ تھے اور ڈومیسائل کا درجہ رکھتے تھے۔ انگریزوں کے زمانے میں ان کا تبادلہ ہر تین برس کے بعد ہو جاتا ہو۔ دُکّی کے متعلق تو کچھ یاد نہیں البتہ اس کے بعد ہم لوگ موسیٰ خیل آ گئے تھے۔ جہاں کی یادیں کبھی کبھی جگنوؤں کی طرح ذہن میں چمک جاتی ہیں۔ مشکل سے ہزار پندرہ سو کی آبادی ہوگی۔ قلعے کی طرح کا تحصیل کا دفتر۔ اس کا بڑا سا چرمراتا پھاٹک جسے تین چار سپاہی مل کر بند کرتے تھے۔ دن میں آنے جانے کے لیے ایک کھڑکی کھلی رہتی تھی۔ رات میں بڑے بڑے تالے پڑ جاتے۔ اندر زمین دوز خزانہ۔ اس وقت گادریج اور کرنسی کا رواج نہ تھا۔ چاندی کے سکے بوریوں میں بھر کر مہر بند کر دیے جاتے۔ بڑی بڑی تجوریاں زمین میں دھنسی رہتیں۔ پتہ نہیں ان تجوریوں کا میرے ذہن پر کوئی اثر ہے بھی کہ نہیں لیکن جب بھی جی چاہتا اسٹاف کوارٹرز کی پشت پر دور تک پھیلے باغیچے کی طرف چلا جاتا۔ اس باغیچے کے رنگ برنگے پھول، انگور کی بیلیں، انار، چیری اور سیب، آڑو، شفتالو وغیرہ کے پیڑ پودے اب بھی میری یادوں کی کہکشاں کا حصہ ہیں۔ اسکول جاتا تو وہاں دل نہیں لگتا۔ وہاں سے بھاگ کر باغیچے میں آ جاتا اور اسٹاربری کی کیاریوں میں تالاب کے کنارے بیٹھ کر مچھلیوں کے رنگ برنگے پروں کو دیکھتا اور خوش ہوتا رہتا، ان پر کنکر پھینکتا، غلیل سے نشانہ سادھتا، دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کرتا۔ بچے بڑی گھاس میں چھپ جاتے۔ بلبل گلاب کی کیاریوں کے قریب بیٹھ کر نغمہ چھیڑتی اور میں اس میں کھو جاتا۔''

پھر یوں محسوس ہوا کہ وہ ہنس رہے ہیں—— ''پہلی جماعت میں کیا پڑھائی ہوتی ہے۔

دس بیس بچے ہوں گے۔ ماسٹر صاحب نے زبانی امتحان لیا۔ ہمت افزائی کے لیے بڑے بھائی ساتھ موجود تھے۔ میں خوف زدہ تو تھا ہی۔ میری باری آئی تو میں نے آنکھیں بند کرلیں اور سبق پڑھنے لگا پورا صفحہ زبانی سنا دیا۔ ماسٹر صاحب بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے کہا نہ صرف پاس بلکہ

اس واقعے کے بعد کتاب میری رفیق بن گئی اور ڈر جاتا رہا

اول۔ میری خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ بھائی نے کندھے پر بٹھا لیا۔ سب نے تالی بجائی۔ خود اعتمادی پیدا ہوئی اور سوچا کہ میں بھی پڑھ سکتا ہوں۔ اس واقعے کے بعد کتاب میری رفیق بن گئی اور ڈر جاتا رہا۔ حافظہ اچھا تھا۔ ہائی اسکول تک پریم چند، ٹیگور، شرت چندر، حافظ، رومی اور غالب وغیرہ کو چاٹ گیا تھا۔ انگریزی میں بھی شُدبُد ہوگئی تھی۔ گاؤں دیہات کے اسکولوں میں تعلیم کا کوئی خاص انتظام نہیں ہوتا پھر بھی بعض استادوں نے مجھ پر بہت مہربانی کی۔ کتابیں لا لا کر دیتے۔ میری ابتدا خوش نصیبیوں سے ہوئی۔'' میرا ذہن کورا کاغذ تھا۔ کئی کئی نقش ایک ساتھ چڑھتے چلے گئے۔ زبانیں اور بولیاں بھی سیکھتا گیا۔ ماں، مغربی پنجاب کی تھیں، سرائیکی بولتی تھیں۔ والد پشتو بولتے تھے، اور بازار کی زبان ہندوستانی یعنی اردو تھی۔ والد صاحب نے مجھے فارسی اور سنسکرت کی بھی تعلیم دی۔ آگے بڑھے تو انگریزی سے زیادہ واسطہ پڑا۔ اس زمانے کی ایک بہت اہم بات یاد آتی ہے —— والد صاحب باجا جس کے گول ریکارڈ پر HMV کا کتا گھومتا رہتا تھا۔ والدہ صاحبہ کے ساتھ ہم بھی بیگم اختر، کے۔ایل سہگل اور روشن آرا بیگم کو سنا کرتے تھے۔ ہم دس بچے تھے۔ چھے بھائی اور چار بہنیں —— جب بارہ لوگ ایک چھوٹے سے کمرے میں ٹھنسے باجا سن رہے ہوں —— ایک کونے میں لال لال اناروں کا ڈھیر لگا ہو —— اور ماں سب سے چھوٹے بچے کو دودھ پلا رہی ہو۔ تو فضا کیسی ہوگی —— ؟ اور ذہن پر کیسے کیسے نقش بن رہے ہوں گے۔ والد ہارمونیم پر ''بالم آئے بسو مورے من میں'' گاتے تو گھر میں خوشی کی جوت جل جاتی۔

چائے کی چسکیوں کے دوران جب سرائیکی کے متعلق مزید جاننے کی کوشش کی تو محسوس ہوا کہ جیسے وہ راز کھولنے کے موڈ میں آگئے ہوں —— ''پانِنی کی زبان ہے وہ سنسکرت سے بھی پرانی

والد ہارمونیم پر ''بالم آئے بسو مورے من میں'' گاتے تو گھر میں خوشی کی جوت جل جاتی

—— پانِنی ملتان کے تھے۔'' امیر خسرو نے بھی اسی شہر میں گوپال نایک سے ٹکر لی تھی۔ قدیمی شہر ہے: چہار چیز است تحفۂ ملتان، گرد، گرما و گورستان۔ اس میں پانچویں چیز سرائیکی کو جوڑ لیں، بلھے شاہ اور بابا فرید کی زبان اور میری دادی نانی اور ماں کی زبان۔ پھر وہ سرائیکی سے متعلق خاص خاص

مقامات اور ندیوں کا دیر تک ذکر کرتے رہے۔ تخلیقی محرکات کے سوال پر انھوں نے بتایا—— میری زندگی کوئی EVENTFUL نہیں ہے —— ویسے یہ ایک دل چسپ واقعہ ہے بچپن کی بے وقوفیوں کا —— گرمی کی چھٹیوں میں بڑے بھائی کے ساتھ ہاکی ٹورنامنٹ دیکھنے ساتھ کے شہر گیا تھا۔ دور کے ایک رشتے دار کے گھر باہر والے کمرے میں ہم ٹھہرے تھے۔ صبح سویرے ابھی آنکھیں ہی مل رہے تھے کہ ایک دبلی پتلی چھریرے جسم والی لڑکی چائے کی کیتلی لیے سامنے کھڑی

بے وقوفی یہ ہوئی کہ اسکول کے پتے پر عشق نامہ بھی لکھ دیا

ہے۔ ننگے پاؤں، بال کھولے ہوئے تیکھے نین نقش، —— میری عمر کوئی چودہ پندرہ برس کی ہوگی۔ لگا کہ پورے بدن میں بجلی سی کوند گئی ہے —— وہ تو چلی گئی مگر میں دیکھتا رہ گیا۔ میچ میں دل نہیں لگا۔ گھر واپس آکر بھی اس کی تصویر آنکھوں میں پھرتی تھی۔ کسی سے ذکر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اور نہ ہی اسے بھلا سکتا تھا۔ جنون یہاں تک بڑھا کہ اس کے اسکول کا پتہ لگا لیا۔ بے وقوفی یہ ہوئی کہ اسکول کے پتے پر عشق نامہ بھی لکھ دیا۔ اس میں گویا مرزا شوق کی مثنوی زہر عشق کا بیانِ درد تھا —— بے چاری لڑکی روتی ہوئی گھر آئی —— اس پر کیا گزری ہوگی اس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے ماں باپ نے میرے بڑے بھائی کو بلوایا اور خوب ڈانٹ ڈپٹ کی۔ بعد میں یہ سب لوگ مہاجر بن کر دہلی آئے —— مدتوں یہ پھانس دل میں چبھی رہی اور رفتہ رفتہ گھل گئی—— پھر خود بخود شعر ہونے لگے۔ اور کہانیاں لکھنے لگا— جلدی جلدی چائے کی چار پانچ چسکیاں لیں اور پھر گویا ہوئے —— ''پہلے عشق کو لے کر میں نے اپنی پہلی کہانی پندرہ برس کی عمر میں لکھی تھی جو ۱۹۴۶ء میں کوئٹہ سے شائع ہونے والے اخبار ''بلوچستان سماچار'' میں چھپی تھی۔ اس کے بعد کئی اور کہانیاں بھی اسی اخبار میں شائع ہوئیں۔ پھر میں دہلی آ گیا اور رسالہ ''ریاست'' میں لکھنے لگا۔ یہ رسالہ رئیسوں اور رجواڑوں کی قلعی کھول کر ان سے حساب بے باق کیا کرتا تھا۔ سردار دیوان سنگھ مفتون کا دفتر دریا گنج میں تھا۔ رسالے کے مالکان نے بہلا پھسلا کر مجھے اسٹاف میں لینا چاہا لیکن میں دہلی کالج میں داخلہ لے چکا تھا۔ پارٹ ٹائم نوکری بھی کر لی تھی۔ تعلیم کے مزے کو کسی قیمت پر

پہلے عشق کو لے کر میں نے اپنی پہلی کہانی پندرہ برس کی عمر میں لکھی تھی

نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ رات رات بھر جاگ کر امتحان کی تیاری کرتا۔ آخر کار ۱۹۵۶ء میں جب ڈاکٹریٹ کا تھیسس بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ دہلی کے مشہور سینٹ اسٹیفن کالج میں جز وقتی لیکچرر کی جگہ مل گئی——''

آپ نے شعر گوئی سے اپنے ادبی سفر کی ابتدا کی تھی بعد میں تنقید تحقیق کے میدان میں آئے۔ یہ بتائیں کہ شاعری کب اور کیسے چھوٹ گئی——؟

"بلوچستان کے زمانے میں چند غزلیں، نظمیں کہی تھیں۔ یہ تخلیقات ایک بڑے رجسٹر میں

جب تک کوئی کتاب پوری نہیں لکھ لیتا، کام پورا نہیں ہو جاتا اندر ایک آگ سی لگی رہتی ہے

درج تھیں۔ فسادات کے زمانے میں جب ہم لوگ ریڈ کراس کے ایک ڈکوٹا جہاز کے ذریعے اندھیری رات میں پالم ہوائی اڈے پر اتار دیے گئے اور ستمبر کی اوس بھری رات میں برلا مندر کے لان پر ہمارا قیام ہوا تو تاریکی اور بھیڑ بھڑکے میں ہمارا سامان تتر بتر ہوگیا۔ بھائی صاحب نے کوہستان کی ندی کے کنارے سے کچھ چمکتی ہوئی چیزیں اکٹھا کی تھیں جنھیں وہ ہیرا سمجھ رہے تھے۔ وہ اور میرا رجسٹر بھی اسی سامان کے ساتھ گم ہوگیا۔ بھائی صاحب تو اس گھڑی کو یاد کر کے اب بھی اداس ہو جاتے ہیں۔ میں تو بعد میں بھی کاغذ سیاہ کرنے میں لگا رہا۔ بلا مبالغہ ہزاروں صفحات لکھے اور پھاڑے ہوں گے۔ ایک کے بعد ایک بیسوں کتابیں شائع ہوئیں —— لیکن اب بھی جب تک کوئی کتاب پوری نہیں لکھ لیتا، کام پورا نہیں ہو جاتا اندر ایک آگ سی لگی رہتی ہے۔"

پی ایچ-ڈی کا موضوع "اردو شاعری کا تہذیبی مطالعہ" تھا مقالے کی تیاری اور لسانیات کی تعلیم میں اس قدر الجھا کہ شاعری اور افسانہ پیچھے چھوٹ گئے —— یوں بھی یونیورسٹی میں اپنے ساتھیوں سے آگے نکلنے اور اپنی جگہ بنانے کے لیے اکیڈمک اور تحقیقی کام کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کام اتنا مشکل تھا کہ مجھے اپنی ترجیحات طے کرنی پڑیں۔ اگر کوئی دیکھنا چاہے تو میرے زخموں کو میرے کالے کیے ہوئے اوراق میں بہ خوبی دیکھ سکتا ہے۔ بچپن کے باغیچوں، انگور کی بیلوں کا حسن، بھوری چٹانوں پر پھیلے نیلے آسمانوں کا سائبان، سہگل، روشن آرا بیگم، ملکہ پکھراج، نور جہاں اور بیگم اختر کی آواز میں، پرفریب محبتوں کے مسلسل زخم اور بچپن کی محرمیوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے خود کو تصنیف و تالیف کے کاموں میں مصروف کر لینا —— ان تمام کاموں کا رشتہ میری باطن کی ضرورتوں سے کہیں نہ کہیں ضرور ملتا ہے——"

دراصل زبان ہی وہ سانچا ہے جس میں انسان ڈھلتا ہے۔ ہم زبان کو نہیں بلکہ زبان ہمیں اپناتی ہے

شاعری ترک کرنے اور اردو زبان سے بے انتہا محبت کا سبب دریافت کیا تو بولے——

"بٹوارے سے قبل جن علاقوں میں میرا بچپن گزرا—— یعنی بلوچستان، سندھ، مغربی پنجاب، دہلی،

یوپی اور بہار تک — عام بول چال کی زبان ہندوستانی تھی جس کی بنیاد کھڑی بولی کا وہ محاورہ تھا جو اردو کی چکی میں پسا تھا۔ زبانوں کی سیاست تو بعد میں شروع ہوئی۔ ہندی اور اردو کو جس طرح مخصوص مذاہب سے جوڑا گیا وہ بعد کی بات ہے۔ مغربی علاقوں میں اسکول کی زبان اردو تھی۔ قیام پاکستان کے بہت پہلے کوئٹہ کے گلی کوچوں اور بازاروں میں اردو ہی بولی اور لکھی جاتی تھی۔ والد صاحب، وید، اپنشد، پران سنسکرت میں پڑھتے تھے۔ ہم نے بھی سنسکرت اور ہندی سیکھی۔ رامائن، مہا بھارت اور یوگ وششٹھ کی کتھائیں بھی گھر میں پڑھی جاتی تھیں۔ مگر یہ ہمارا محاورہ نہیں تھا۔ شاعری یا دوسرے فنون کی طرف رغبت یا پسند و ناپسند کا معاملہ اختیار میں نہیں ہوتا — اس کا بہت کچھ تعلق افتادِ طبع سے ہے۔ ایک پتے کی بات بتاتا چلوں — دراصل زبان ہی وہ سانچا ہے جس میں انسان ڈھلتا ہے۔ ہم زبان کو نہیں بلکہ زبان ہمیں اپناتی ہے۔ زبان ہمارے خون کے مالی کیولز میں رہتی ہے۔ گویا یہ ہمارے ڈی این اے کا وہ حصہ ہے جسے ہم چاہیں بھی تو بدل نہیں سکتے۔ ہمارے شوق، ہمارے Equations، ہمارے عشق، ہماری محبتیں، نفرتیں سب ہمارے ہوش

اردو — میرے نزدیک ہندو مسلم اتحاد کی نشانی ہے

سنبھالنے سے پہلے ہی زبان کے ساتھ ہمارے اندر پیدا ہو جاتی ہیں۔ مادری زبان تو سرائیکی تھی — مگر جو زبان عوامی سماجی رشتوں سے جنم لیتی ہے اس کی حیثیت بھی مادری زبان جیسی ہی ہوتی ہے۔

اردو — میرے نزدیک ہندو مسلم اتحاد کی نشانی ہے۔ ہندوستان کی بائیس ۲۲ علاقائی زبانوں میں کوئی بھی زبان ایسی نہیں ہے جو قومی زبان ہندی سے اس قدر قریب ہو۔ بنگال، مراٹھی، گجراتی — کوئی نہیں۔ ہندی سانس لیتی ہے تو اردو میں اس کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اردو سانس لیتی ہے تو ہندی میں اس کی دھمک سنائی دیتی ہے۔ دونوں کی ریڑھ کی ہڈی ایک ہے۔ مجھے اس بات پر اصرار ہے کہ ایک دوسرے کے بغیر ان دونوں میں سے کسی زبان کا وجود ممکن ہی نہیں۔ اسی فیصد اردو، دیسی یعنی ہندی ہے۔ اور کھڑی بولی کا محاورہ اردو ہے۔ پاکستان میں بھی میں ڈنکے کی چوٹ پر یہ بات کہتا ہوں کہ اردو کی سب سے بڑی طاقت ہندی ہے اور ہندی والوں سے بھی واضح طور پر کہتا ہوں کہ اگر ہندوستان میں رابطے کی زبان کے طور پر، ہندی کی ترقی مقصود ہے تو وہ اردو کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس بات کو بار بار کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ کوئی بات صرف اس لیے نہیں کہنی چاہیے کہ فلاں لابی کو پسند یا ناپسند ہوگی؟ میری لابی ہندوستان ہے۔ میں زبانوں کو کسی تعصب کی نگاہ سے نہیں بلکہ دھرتی کی کروٹوں اور عوام کے دل کی دھڑکنوں سے دیکھتا ہوں۔ ادب کا مطالعہ بھی تہذیبی نقطۂ نظر سے کرتا ہوں۔ جب ادب میں لوگ سیاسی دائیں بازو اور بائیں بازو کا چکر چلاتے ہیں تو مجھے ان کی نادانی پر افسوس ہوتا ہے۔ ادیبوں اور اہلِ سیاست کی آئیڈیولوجی

جداگانہ ہوتی ہے۔ یہاں اقتدار اور خود غرضی کے بجائے انسانیت اور قربانی کا جذبہ ہوتا ہے۔ اول و آخر میں ایک سوشلسٹ اور سیکولر انسان ہوں۔ فقط آئیڈیالوجی یا سیاسی لابی کے ذریعہ گریس مارکس

انہیں میری دیوانگی پسند آئی اور میری اپنی اہلیت پر میرا تقرر ہو گیا

پانے والے ادیب کھوٹے سکے کی طرح ہوتے ہیں۔ چناں چہ مجھے کہنا پڑتا ہے کہ میں نہ دام پنتھی ہوں نہ دکھشن پنتھی، میں 'ساہتیہ پنتھی' ہوں جس میں سب پنتھوں کا جوہر آ جاتا ہے۔

—ایک ہندو ہونے کے سبب کیا اردو ادب میں ESTABLISH ہونے کے لیے آپ کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا——؟

دیر تک خاموش رہنے کے بعد ہنستے ہیں اور پھر اسی طرح بولے——''اس میں میری جدوجہد کا بہت حصہ ہے۔ جیسے جیسے میں آگے بڑھتا گیا اس کا احساس بھی بڑھتا گیا۔ دہلی کالج میں داخلے کے وقت میں نہ ہندو تھا اور نہ مسلمان۔ حالاں کہ فسادات اور اجڑ کر آنے کے زخم ابھی ہرے تھے۔ اس وقت سیاست کا رنگ مذہبی تھا۔ پھر بھی اردو کے تعلق سے یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ آئندہ نفرت کی سیاست پورے برصغیر میں پھیل جائے گی۔ یہ ذہنیت بعد کی ہے۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اردو ایم-اے میں، میں اکیلا طالب علم تھا۔ پہلا جھٹکا اس وقت لگا جب پرنسپل نے کہہ تو یہ رکھا تھا کہ جو طالب علم اپنے مضمون میں اول آئے گا اسے کالج میں استاد مقرر کر دیا جائے گا۔ مگر اول آنے کے باوجود میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ مجھ سے کہا گیا کہ خالصہ کالج میں جگہ ہے—— وہاں درخواست بھجوا دو۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ میں نے درخواست دے دی۔ بابا گلاس کمپنی والے سردار جی گورننگ بورڈ کے صدر تھے۔ انھیں میری دیوانگی پسند آئی اور میری اپنی اہلیت پر میرا تقرر ہو گیا۔ ادھر محکمۂ تعلیم سے پی ایچ-ڈی کے لیے سکالرشپ بھی مل گیا۔ دونوں میں اس وقت پچاس روپیہ کا فرق تھا۔ میں نے گھاٹے کا سودا قبول کر لیا۔ اب سوچتا ہوں کہ اس کے بعد بھی زندگی بھر گھاٹے کا سودا ہی کرتا رہا ہوں:

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

ممکن ہے کہ میں کچھ روپیہ زیادہ کما لیتا۔ مگر علمی کام کے لیے اکیڈمک بنیادیں مستحکم نہ کر پاتا جو تین چار سال لائبریری میں گزارنے کے بعد ہوا۔ اس وقت جب اردو تیزی کے ساتھ زوال کی طرف

ساہتیہ اکیڈمی تو ادیبوں کا کنبہ ہے۔ اس میں ہر آئیڈیالوجی کے ادیب شامل ہیں

بڑھ رہی تھی، ڈیڑھ برس سینٹ اسٹفن کالج میں پڑھانے کے بعد میں ۱۹۵۸ء میں دہلی یونیورسٹی میں لیکچرر ہوگیا۔ یہاں میں نے روسی اور امریکی طالب علموں کو جی جان سے پڑھایا اور ایک ہی سال میں مجھے تین 'آفر' ملے ـــــ ماسکو سے ترجمے کے کام کے لیے، برٹش کونسل سے کامن ولتھ

اپنی جڑوں کی کشش ہی ۱۹۷۰ء میں مجھے واپس ہندوستان لائی

اسکالرشپ۔ چوں کہ درس و تدریس میں دلچسپی پیدا ہوگئی تھی سو میں نے وسکانسن یونیورسٹی کی دعوت کو قبول کرلیا۔

میں وہاں صرف ایک Symester کے لیے مدعو کیا گیا تھا مگر دو برس روک لیا گیا۔ اس دوران میں نے لسانیات کا خوب مطالعہ کیا۔ انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں کا مطالعہ کیا جس کا موقع اس سے قبل نہیں ملا تھا۔ جو باتیں پہلے سمجھ میں نہیں آتی تھیں، اب کچھ کچھ صاف ہونے لگیں۔ ادبی تھیوری اور یورپی شاعری کا مطالعہ بھی یہیں کیا۔ دو سال کے لیے دہلی آیا اور پھر واپس بلا لیا گیا۔ اس طرح ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۰ء تک تقریباً باہر رہا۔ ایک بات اور بتا دوں کہ اپنی زمین سے دور رہنے کے سبب مجھے ایک Prospective ہاتھ آیا۔ اپنی تہذیب، ادبی روایت اور فلسفۂ ادب کو سمجھنے کا موقعہ ملا۔ ذہن صاف ہوگیا اور اپنی افتاد عامہ اور ملکی ذہن و مزاج کی قدر بڑھ گئی۔ لوگ اس بات کا شاید یقین نہ کریں مگر یہ حقیقت ہے کہ اپنی جڑوں کی کشش ہی ۱۹۷۰ء میں مجھے واپس ہندوستان لائی۔ یہاں میری پوزیشن ریڈر کی تھی جب کہ وسکانسن میں میں پروفیسر تھا۔ اور گرین کارڈ کی پیش کش تھی۔ ۱۹۷۰ء میں جب میں نے اپنی معمولی نوکری پر واپس آنے کا فیصلہ کیا تو میرے بعض احباب حیران رہ گئے۔ یاد رہے کہ زیاں کا یہ ایک اور سودا تھا۔ ڈاکٹر کھرانہ وسکانسن میں میرے پڑوسی تھے۔ انھیں تازہ تازہ نوبل انعام ملا تھا۔ ایک پارٹی جس میں ڈاکٹر کھرانہ بھی موجود تھے۔ میری ہندوستان واپسی پر گفتگو ہوئی تو میں دوستوں سے یہی کہہ سکا کہ ـــــ "اگر کھرانہ کے برابر کا سائنس داں ہوتا تو ضرور یہیں رک جاتا۔ میری Laboratory تو ہندوستان میں ہے۔ میں زبان و ادب اور تہذیب کا معمولی آدمی ہوں، ہندوستان سے باہر میری حیثیت گلاس ہاؤس میں لگے پودے کی طرح ہے ـــــ"

ـــ خود کو Establish کرنے میں جن تکلیفوں اور رنج و غم کا سامنا ہوا اس کی مزید وضاحت کریں؟

بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو بھلا دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ اس جدوجہد میں بہت سے ایسے مقامات آئے جن کو اگر بھول نہ جاتا تو شاید پاگل ہو جاتا۔ میرے لیے کوئی اور چارہ ہی نہیں

اس جدوجہد میں بہت سے ایسے مقامات آئے جن کو اگر بھول نہ جاتا تو شاید پاگل ہو جاتا

تھا۔ دکھ اٹھانے میں ایک تو وقت کا زیاں ہوتا ہے دوسرے اس دکھ کو لے کر اگر انتقام کا جذبہ پیدا ہو جائے تو پھر سمجھ لیجیے کہ اتنا ہی وقت نفرت میں بسر کیا جائے۔ شوجی کو نیل کنٹھ کس لیے کہا جاتا ہے—؟

میرا ڈاکٹریٹ کے کام کے دکھ کا زہر پینے سے امرت ہو جاتا ہے دیوانگی کے باعث توقع سے کہیں بڑھ کر تھا۔ اس میں رفو کا بہت کام نکلا قلی قطب شاہ اور ولی دکنی سے لے کر فراق اور فیض تک چار سو برس کی شاعری کا تہذیبی مطالعہ آسان نہ تھا۔ باریک ٹائپ پر بارہ سو صفحات کا مقالہ۔ آگے کی منزلیں آسانی سے طے نہیں ہوتیں اگر میرے ممتحن میری مدد نہ کرتے اور ان کی رپورٹ اتنی اچھی نہ ہوتی۔ اتنا ضخیم Thesis جو شائع ہو کر پندرہ سو صفحات کا ہوتا، اسے کوئی بھی پبلشر شائع کرنے کو تیار نہ تھا۔ انٹرویو کا وقت قریب آیا تو میرے مرشد خواجہ احمد فاروقی کا حکم ہوا کہ بغیر کسی نئی کتاب کے انٹرویو میں ہرگز نہ آنا۔ چناں چہ مرتا کیا کرتا۔ میں نے Thesis کے ایک باب

مزاج کے اعتبار سے میں غریب آدمی ہوں۔ دل کا غریب نہیں

''ہندوستانی قصوں پر مبنی اردو مثنویاں'' کو منتخب کیا اور ڈیڑھ سو صفحات کی ایک کتاب شائع کرا دی۔ پھر وسکانسن چلا گیا۔ وہاں خبریں ملتی رہیں—— تمھاری کتاب پر گفتگو اور مباحثے ہو رہے ہیں۔ چند بڑے نقادوں نے ریڈیو پر تبصرے بھی کیے۔ پھر خبر ملی کہ اردو اکادمی لکھنؤ، جو اس وقت بہت اہم اکادمی تھی، نے ایک نوجوان کی معمولی سی کتاب کو تہذیبی اور تحقیقی مطالعہ کی بہترین تخلیق سمجھ کر 'غالب پرائز' سے نوازا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اس وقت ہندوستان کے نائب صدر جمہوریہ تھے، ڈاکٹر سید عابد حسین جامعہ میں تھے، اور سرور صاحب علی گڑھ میں۔ سب مجھ سے محبت کرتے تھے۔ سب کے ٹیلی گرام اور تہنیت نامے مجھے وسکانسن میں ملے۔''

— نارنگ صاحب آپ نے اب تک ادب میں جو کچھ حاصل کیا ہے اس میں کس کا کتنا حصہ ہے—؟

اس میں سب سے بڑا حصہ میرے ماں، باپ کا ہے۔ لیکن جانے ان جانے میں بہت کچھ ایسا ہو جاتا ہے جن سے ہماری تعمیر ہوتی ہے۔ مولوی مرید حسین بہت نیک اور شریف انسان تھے۔ سردی کے موسم میں براؤنڈی کا لمبا کوٹ پہنے اور پگڑی باندھے، میری یادوں میں آج بھی چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ کبھی خواب میں آ کر میری پیٹھ تھپتھپاتے ہیں—— پڑھاتے پڑھاتے جب تھک جاتے ہیں تو آٹھویں جماعت کو میرے حوالے کر کے غائب ہو جاتے ہیں۔ اور میرے اندر کے بچے سے کہتے ہیں ''تم بہت اچھا پڑھاتے ہو—'' رتن ناتھ سرشار کی فسانۂ آزاد کی تیسری جلد اور پریم چالیسی جس کا کوئی نسخہ لائبریری میں بھی دستیاب نہیں تھا، مجھے لا کر دیتے ہیں، داستانِ امیر

حمزہ سمجھاتے ہیں۔ میر و غالب کے شعر یاد کراتے ہیں، میگھ دوت اور تلسی کو سناتے ہیں......؟

—— چھت کی طرف گھورتے ہوئے نارنگ صاحب کی بوجھل آنکھیں اور معصوم لب پھر خاموش ہو جاتے ہیں۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے پیپر سمیٹتے اور پھیلاتے ہیں اور ایک لمبی خاموشی کے بعد پھر بولنا شروع کر دیتے ہیں —— پتا جی سے تو میں نے کیا کچھ نہیں سیکھا۔ پچھلے جنم میں شاید موتی دان کیے ہوں گے، تبھی تو ایسے ماں باپ ملے۔ میرے والد جیب کے غریب ضرور تھے مگر دل کے بہت امیر تھے۔ اس زمانے میں تنخواہ بھی کیا ہوتی تھی —— سو ڈیڑھ سو روپیہ۔ اس میں دس بچوں کا کنبہ۔ پھر بھی کوئی سوالی دروازے سے خالی ہاتھ نہیں جاتا۔ سادہ پہنتے اور سادہ کھاتے تھے۔ بہت زیادہ فضول خرچی کی تو ہمارے لیے انگوروں کی ٹوکری یا فلیکس کے جوتے اور بہت ہوا تو پارکر کا چھوٹا قلم

پچھلے جنم میں شاید موتی دان کیے ہوں گے، تبھی تو ایسے ماں باپ ملے

لے آئے۔ باغیچے کے مالی لوگ یورپ کے رہنے والے اور شاید دلت تھے۔ حقہ پیتے اور بھوجپوری بولتے تھے۔ پتا جی کی ان سے بھی دوستی تھی۔ اونچ، نیچ کا کوئی خیال ان میں نہیں تھا۔ ہمارے گھر آ کر وہ چارپائی پر بیٹھتے اور رامائن سنتے تھے۔ میں نے پتا جو کو سوامی رام تیرتھ کے شعر سناتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ یہ سلسلہ بٹوارے کے بعد بھی جاری رہا۔ راجندر نگر میں ہمارا ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ یہ مالی لوگ پوسا انسٹی ٹیوٹ میں آ بسے تھے۔ ان کی شامیں ہمارے یہاں ہی گزرتی تھیں والد صاحب کی موت تک یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ وہ بھوجپوری بولتے جا رہے ہیں اور پتا جی ان کے لیے پوسٹ کارڈ پر پوسٹ کارڈ لکھے جا رہے ہیں۔ یہی معاملہ ہماری ماں کا بھی تھا —— جس نے دس بچے جنے ہوں، غریبی میں پالے ہوں، رات دن جو رسوئی اور چوکے میں لگی رہتی ہو —— کپڑے دھونا، جھاڑو برتن کرنا، چکی پیسنا، صابن کی ڈلیاں بنانا —— جو عورت یہ سب کام خود کرتی ہو اس میں جان ہی کتنی بچی ہوگی۔ پھر بھی محلے بھر کے دکھ درد میں شریک رہتی تھیں۔ نیکی، انسانیت، درد مندی، قربانی اور خدمت کا جذبہ، یہ سب میں نے کلاس روم میں نہیں اپنے گھر سے سیکھا ہے۔ ماں، باپ کا احسان تو سب پر ہوتا ہے مگر میں نے اپنے بچپن کی محبتوں سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔"

تصنیف و تالیف سے متعلق عادتوں، سازگار اور ناسازگار حالات اور پسند و ناپسند کے بارے میں جب ان سے دریافت کیا تو انھوں نے بتایا ——

"آپ یہ سن کر ہنسیں گے کہ میرے پاس تقریباً چالیس برس پرانا ایک گتا ہے، جس میں کھلے ہوئے کاغذ رکھتا ہوں۔ اوپر چمٹی لگی ہے۔ اسی گتے پر کاغذ لگا کر لکھتا ہوں۔ قلم بھی میری

کمزوری نہیں ہے۔ جو بھی ہاتھ آجائے لکھنے لگتا ہوں۔ البتہ ایک آدھ شیفرڈ اور پارکر بہ طور شوق دراز میں پڑے رہتے ہیں۔ انھیں میں جیب میں بھی نہیں لگاتا۔ گھڑی بھی میں معمولی سی پہنتا ہوں۔ اسے ایک محبت کرنے والی نے سویٹ زر لینڈ میں خرید کر دیا تھا۔ یہ بھی میری طرح اب پرانی ہو چکی

بہت سارا کام پارکوں میں پیڑوں کے نیچے بیٹھ کر کیا

ہے، لیکن کام کر رہی ہے۔ جب ہمت تھی تو کام کرنے کے لیے نہ کسی موڈ کی ضرورت ہوتی تھی اور نہ ہی کسی نشے کی۔ کام کا اپنا الگ نشہ ہوتا ہے۔ بہ ظاہر تو میں بہت مرتب آدمی ہوں مگر اندر سے بہت ہی غیر مرتب۔ کئی کام تو ایسے ہیں جو بیسیوں برس سے ادھورے پڑے ہیں۔ لیکن کبھی کسی موضوع نے اتنا جکڑ لیا کہ اسے پورا کر کے ہی دم لیا۔ تقریر میں بھی مجھے اتنی ہی سہولت ہوتی ہے جتنی کہ تحریر میں۔ ہزاروں کے مجمع میں گھنٹہ دو گھنٹہ بول لینا میرے لیے مشکل نہیں۔ بڑے ادیبوں اور شاعروں کے سامنے جن کا میں پاسنگ بھی نہیں ہوں، انھوں نے میری باتوں کو سنجیدگی کے ساتھ سنا ہے۔ ۱۹۷۴ء میں جب جامعہ میں پروفیسر ہوا اور مستقل تنقیدی سرگرمیوں میں مصروف ہو گیا تو اس زمانے کے میرے بہت سے مضامین ایک نشست میں ڈکٹیٹ کرائے ہوئے ہیں۔ پندرہ بیس صفحات دو تین گھنٹے میں بول کر لکھوا دینے میں مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ دماغ حاضر رہتا ہے۔ اگرچہ میں دھیرے دھیرے بولتا ہوں مگر خیالات میں روانی باقی رہتی ہے۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ "اسلوبیات میر" اور "قاری اساس تنقید" یہ دونوں کتابیں میں نے املا کرائی ہیں۔ البتہ پہلا ڈرافٹ ڈکٹیٹ کر دینے کے بعد اسے کئی بار Revise کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی تو پوری تحریر ہی بدل جاتی ہے۔ Perfectionism میری کمزوری ہے۔ کوئی تحریر جب تک ہر اعتبار سے درست نہیں ہو جاتی، اسے شائع نہیں کرتا۔ مجھے کسی چیز کو شائع کرانے کی عجلت نہیں ہوتی۔

اب بھی ہاتھ سے ہی لکھتا ہوں۔ آج کل بعض کتابیں دس دس پندرہ پندرہ برس 'پال' میں لگی رہی ہیں ایک بہت اہم کتاب لکھ رہا ہوں جس کے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ یہ کتاب

ایک بہت اہم کتاب لکھ رہا ہوں جس کے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہے

ایسی ہے کہ اسے زبانی نہیں لکھوا سکتا۔ اسے خود ہی ہاتھ سے لکھ رہا ہوں۔ انگریزی میں بھی جو کچھ لکھتا ہوں ہاتھ سے ہی لکھتا ہوں۔ ہاتھ سے لکھنا ابھی چھوٹا نہیں ہے۔ اس کا تعلق دراصل موضوع سے ہے۔ فلسفے کا کام بہت ٹھہر ٹھہر اور سوچ سوچ کر لکھنے کا ہوتا ہے۔ اسے قلم برداشتہ نہیں لکھا جا سکتا۔ سامنے والے (لکھنے والے) شخص کی تکلیف اور وقت کا بھی خیال رہتا ہے۔ تجزیوں کو سیاق و

سباق، حوالے اور Documentation کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب میں نے ڈاکٹریٹ کا کام شروع کیا تھا تو مکان چھوٹا ہونے کے سبب گھر میں جگہ نہیں تھی۔ معمولی میز بھی نہیں تھی۔ بہت سارا کام پارکوں میں پیڑوں کے نیچے بیٹھ کر کیا۔ پانی کی بوتل، دری اور روٹی کا ڈبہ لے کر راجندر نگر کے پاس پوسا انسٹی ٹیوٹ چلا جاتا۔ سائیکل پر جاتا تھا۔ پیڑوں کے نیچے بیٹھ کر سارا دن پڑھتا لکھتا رہتا——وسکانسن سے واپسی پر ہی گھر میں مجھے میز کرسی نصیب ہوئی——میرے پاس بعض

بہ ظاہر تو میں بہت مرتب آدمی ہوں مگر اندر سے بہت ہی غیر مرتب

ایسی تصویریں ہیں جن میں میرا بیٹا ارون میرے گھٹنے کے پاس بیٹھا ہے اور میں گھٹنے پر گتا رکھ کر لکھنے میں مصروف ہوں——اور پیٹھ کے پیچھے گیہوں کی دو بوری رکھی ہیں۔ اب میز کرسی کی عادت ہوگئی ہے۔ جب پڑھتا ہوں تو میز کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ عموماً لکھنا پڑھنا ساتھ ہوتا ہے، سو میز کرسی سے ہی کام چلتا ہے۔"

اب ہماری گفتگو لکھنے پڑھنے کی عادت، کتابوں کے مستقبل اور ٹی۔وی کی دہشت پر ہو رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ نارنگ صاحب میرے ہر سوال کو بہ غور سن رہے ہیں اور ایک ایک لفظ بہت سوچ سمجھ کر استعمال کر رہے ہیں۔ خود کو بڑا ادیب ثابت کرنے کی بے صبری ان میں نہیں ہے۔

"کتابوں کی مستقبل اور ٹی-وی کے خوف کا جہاں تک سوال ہے تو جب کوئی ٹیکنالوجی کچھ نیا لے کر آتی ہے تو اس کا خوف پیدا ہونا فطری ہے۔ زبانی روایت کے سامنے Printing Technology ایک نئی دہشت لے کر آئی تھی۔ بالکل اسی طرح اب کتابوں کے سامنے ٹی۔وی ایک نیا خوف لے کر آیا ہے اور اب انٹرنیٹ، کمپیوٹر اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دہشت ہے جو پہلے کے ہر چیلنج سے زیادہ خوف ناک ہے۔ لیکن مجھے اس کا پورا یقین ہے کہ انسان کی جس ضرورت کو کتابیں پورا کرتی ہیں کوئی دوسری چیز اس کا بدل نہیں ہو سکتی۔ کتاب لاکھ بدل جائے، کتاب ہی رہے گی۔ اس کو لیٹ کر، سرہانے رکھ کر اور چھاتی پر کھلا رکھ کر پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ بغل گیر ہو کر سویا بھی جا سکتا ہے۔ مت بھولیے کہ آج کی Tension سے بھری زندگی میں اس مصرع کی اہمیت باقی ہے 'فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے'۔

——ادیبوں کے سیاست سے متعلق ہونے اور ادبی سیاست کے بارے میں آپ کا کیا خیال

انسان کی جس ضرورت کو کتابیں پورا کرتی ہیں کوئی دوسری چیز اس کا بدل نہیں ہو سکتی

ہے ——؟

یوں تو پوری انسانی زندگی سیاست کی زد میں ہے۔ ہر چیز پر سیاست کا اثر ہے۔ میں یہ تو نہیں، کہتا کہ ادب صد فی صد خود مختار اور خود کفیل ہے۔ خالص خود کفالت کا myth ٹوٹ چکا ہے۔ کیوں کہ زبان و ادب کی ہر چیز تہذیب سے وابستہ ہے اور تہذیبی تصورات، نظریات سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ راہ راست نہ سہی پھر بھی ادبی نظریات کلی طور پر آزاد نہیں ہیں۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ادب نظریات کا غلام ہوتا ہے۔ اس کے اپنے تقاضے اور تصورات ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتو ادب اور اخبار میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ سیاست لمحاتی اور وقت کے دائرے میں قید ہوتی ہے۔ لیکن ادب لامحدود اور زبان و مکان کی قید سے آزاد ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس معاملے میں فرانسیسی نیو مارکسسٹ فلسفی آلتھیو سے کی بات کی میں تصدیق کرتا ہوں کہ —— سماج کے ایک

تقریر میں بھی مجھے اتنی ہی سہولت ہوتی ہے۔ جتنی کہ تحریر میں

کنارے پر سائنس اور ٹیکنالوجی ہے، تو دوسرے کنارے پر آئیڈیالوجی ہے اور دونوں کے درمیان ادب اور آرٹ ہے۔ ادب اپنے دونوں کناروں سے اثر قبول کرتا ہے۔ مگر ان سے آگے بڑھنے اور جداگانہ سوچنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے۔ اس تضاد کے رشتے کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔"

—— موجودہ عہدہ، اس کی مصروفیات، گذشتہ دنوں عاید ہونے والے الزامات، دشمنوں کے سیاسی حربے اور ساہتیہ اکادمی کے متعلق کہی گئی باتوں کا آپ پر کیا اثر ہوا ——؟ کیا اس سے آپ کے ادبی کام کا کوئی نقصان ہوا ہے ——؟

"اس کو اس طرح دیکھنا شاید ٹھیک نہیں ہے۔ ایثار اچھی چیز ہے لیکن ایک، حد تک۔ اپنی مرضی کے بغیر بھی تو دوسروں کے ساتھ نباہ کرنا پڑتا ہے۔ کچھ فیصلے حالات کے زیرِ اثر بھی کرنے پڑتے ہیں۔ پھر بھی یہ فیصلے ہمارے ہی ہوتے ہیں۔ میں اس بات کو درست نہیں سمجھتا کہ انتظامی کام کے ساتھ کوئی دوسرا کام نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آپ کسی ایک کام کو اپنے اوپر اوڑھ لیں اور سارا وقت اسی میں برباد کر دیں تو یہ آپ کے انتخاب کا معاملہ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اب میرا پڑھنا لکھنا چھوٹ گیا ہو۔ عہدہ، پوزیشن کے ساتھ نئے نئے پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔ نئے تجربے ہوتے ہیں اور نئے رشتے بنتے ہیں۔ اکیڈمی کے پہلے صدر پنڈت نہرو تھے۔ پھر ڈاکٹر رادھا کرشنن، ذاکر حسین اور پھر سنیتی کمار چٹرجی —— یہ لوگ میرے رہنما ہیں۔ میں ان کی خاکِ پا بھی نہیں۔ محض ان کے بنائے ہوئے راستے پر چل رہا ہوں۔ ساہتیہ اکیڈمی میں نوکر شاہی نہیں چلتی۔ یہاں ادیبوں کی ضرورت ہے۔ آپ کو کوئی ذمہ داری دی جائے اور آپ بھاگ جائیں —— یہ تو وہی بات ہوئی کہ

خانۂ خالی را دیوی گیرد! ــــ یا پھر اس کو یوں کہہ لیجیے کہ جو ادبی ادارہ خالی پڑا ہو اس میں سیاسی مافیا آ جاتا ہے۔

مہا شویتا جی کی میں بہت عزت کرتا ہوں۔ سب کو معلوم ہے کہ وہ آئی نہیں لائی گئیں تھیں۔ ان کی حمایت کرنے والے لوگ اپنے مفادات کے لیے ان کا استعمال کر رہے تھے۔ ساہتیہ اکیڈمی تو

اکیڈمی کے پہلے صدر پنڈت نہرو تھے۔ پھر ڈاکٹر رادھا کرشنن، ذاکر حسین اور پھر سنیتی کمار چٹرجی ـــ یہ لوگ میرے رہنما ہیں

ادیبوں کا کنبہ ہے۔ اس میں ہر آئیڈیالوجی کے ادیب شامل ہیں۔ ان کو تقسیم کرنے کی کوئی کوشش آج تک کامیاب نہیں ہوئی۔ اس سے زیادہ کہنا میں مناسب نہیں سمجھتا۔

ــــ اس عہدے کا عروج، مراعات اور یافت، آپ کو کبھی کچھ سوچنے کے لیے بھی مجبور کرتی ہیں ــــ آپ کو تنبیہ بھی کرتی ہیں؟

مزاج کے اعتبار سے میں غریب آدمی ہوں دل کا غریب نہیں۔ نام و نمود کے ساتھ انسان میں اگر خدمت کا جذبہ نہیں ہے تو یہ کھوٹے سکے کے مترادف ہے۔ تنہائی میں اپنے روبرو ہو کر اپنا احتساب کرتے وقت مجھے ایاز کا قصہ یاد آ جاتا ہے ــــ وہ ایک غریب غلام تھا۔ بادشاہ محمود نے خوش ہو کر اسے وزیر بنا دیا۔ مشہور ہے کہ جب بھی اسے موقع ملتا اپنی جھونپڑی میں چلا جاتا ــــــ پرانے کپڑے پہنتا اور آئینے کے روبرو ہوتا ''ایاز قدرِ خود بشناس'' جو لوگ تکبر کرتے ہیں مجھے ان پر ہنسی آتی ہے۔ گاندھی جو لنگوٹی کے بادشاہ تھے لیکن انھیں دنیا یاد کرتی ہے۔ وقت کی ٹھوکر سے بادشاہوں کے تاج مٹی میں مل جاتے ہیں لیکن فقیروں کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

ــــ آپ کی اپنی تنقید کے بارے میں کیا رائے ہے؟

''ابتدا میں مجھے یہ خیال ہی نہیں تھا کہ میں نقاد بنوں گا۔ آج بھی میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا۔ اس میدان میں بڑے لوگوں کا نام جب ذہن میں آتا ہے تو سر خم ہو جاتا ہے۔ میں نے ابتداً ادبی کام تحقیقی مقالے سے شروع کیا تھا۔ پھر دس پندرہ برس لسانیات کی وادی کے پتھر ڈھوتا رہا۔ پھر کچھ ضرورتاً، کچھ احباب کی فرمائش پر اور کچھ اندر کی خواہش سے اس میدان میں آیا۔ اس کے باوجود محض مضامین لکھنا ہی مقصدِ حیات نہیں بنایا۔ پہلے کام کا ایک نقشہ تیار کیا اور پھر کام شروع کیا۔ وسکانسن میں Readings in literary prose تیار کی جو آج بھی دنیا بھر کی یونیورسٹیوں کے

اس میدان میں بڑے لوگوں کا نام جب ذہن میں آتا ہے تو سر خم ہو جاتا ہے

نصاب میں شامل ہے۔ ہندوستان واپس آیا تو اردو رسم الخط اور املا پر کام شروع کیا۔ جامعہ کے زمانے میں چار ایسے کام کیے جن سے میری عزت و شہرت میں اضافہ ہوا۔ ''اردو افسانہ'' ''انیس شناسی'' ''اقبال کا فن'' اور ''اسلوبیاتِ میر'' یہ کتابیں جم کر تیار کیں۔ جب دہلی یونیورسٹی آیا تو سب دوسرے کام چھوڑ کر Theory پر کام شروع کیا۔ ''ساختیات'' پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' پر خوب داد ملی۔ امیر خسرو کی ہندوی پہیلیوں کے نسخے کو میں برلن میں پہلے ہی تلاش کر چکا تھا۔ اس میں تقریباً ڈیڑھ سو پہیلیاں ایسی تھیں جو پہلی بار سامنے آئیں۔ نویں دہائی میں مابعد جدیدیت پر ایک کتاب تیار کی۔ خدا کا شکر ہے کہ ساہتیہ اکادمی میں آنے کے بعد دو کتابیں کونسل سے شائع ہوئی ہیں۔ ایک ''اردو غزل اور ہندوستانی تہذیب'' اور دوسری ''جنگ آزادی اور اردو شاعری'' ابھی بہت سے کام باقی ہیں۔ دعا کیجیے کہ کچھ پورے ہو جائیں —— ایسا کوئی سکھ، یا دکھ درد یا پشیمانی جس کی یاد اکثر آپ کے ذہن و دل پر دستک دیتی ہے —— ؟

زندگی کا سب سے بڑا سکھ جس کی صرف ایک دھندلی سی تصویر ہی بنتی ہے —— ماں کی چھاتی سے لگ کر دودھ کی بوند کا مزہ لینا یا پھر ایک تصویر کچھ صاف سی بنتی ہے —— باپ کی انگلی پکڑ کر پہاڑی پتھروں پر چلنا۔ اور غم کی اس گھڑی کو میں کبھی نہیں بھول سکتا جب محبت اور لڑکپن کی بے وقوفی کے ہاتھوں میرا دل ٹوٹا۔ غلطیاں تو بہت ہوئیں ہوں گی، گناہ بھی سرزد ہوئے مگر جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا اور کسی کو عمداً دکھ نہیں پہنچایا جس کا پچھتاوا ہو۔

—— ذاتی، قومی اور بین الاقوامی سطح کا کوئی ایسا واقعہ جس نے آپ کو بے حد متاثر کیا ہو —— ؟

قومی سطح کا بہ ظاہر معمول مگر بہت بڑا واقعہ —— ۱۹۴۲ء کے آندولن میں سرحدی گاندھی اور بعض دوسرے لیڈروں کی تقریریں سننے کے لیے گھنٹوں دھوپ میں بیٹھنا اور رات کے اندھیرے میں نوعمر لڑکوں کے ساتھ چوک کی دیواروں پر سامراج کے خلاف نعرے لکھنا —— بین الاقوامی سطح کا دل کو چھو لینے والا تجربہ اس وقت ہوا جب پہلی بار میں نے برٹش میوزیم لندن کے گول گنبد کے نیچے ان کرسیوں اور میزوں کو دیکھا جہاں بیٹھ کر مارکس، اینجلس اور جوائس جیسی بڑی شخصیات نے لکھا اور سوچا ہوگا یا جب میں نے ے فیرگارڈن ریجنٹ اسٹریٹ یا آکس فورڈ اسٹریٹ اور نیچے پاتال میں اتری ہوئی انڈر گراؤنڈ ٹیوب دیکھی جس کی جگمگاہٹ کی بنیادیں اٹھارہویں صدی کے ہندوستان کے استحصال پر رکھی گئی تھی۔

—— کیا تقسیم کے درد کو اپنے سینے میں اب تک دبائے ہوئے ہیں۔ اسے کب اور کیسے یاد کرتے ہیں —— ؟

اردو سانس لیتی ہے تو ہندی میں اس کی دھمک سنائی دیتی ہے

ہم میں سے شاید کسی نے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ یہ سب ہوگا اور اتنا بھیانک ہوگا۔ ریڈ کلف ایوارڈ کے فوراً بعد کوئٹہ بلوچستان میں فساد پھیل گیا۔ تین چوتھائی شہر ہندوؤں سے بھرا ہوا تھا۔ بہ طور Paying guest میں اکیلا ہی ایک خاندان کے ساتھ رہ رہا تھا۔ رات ہوتے ہی ہر طرف سے نعروں کا شور سنائی دینے لگا۔ گولا باری شروع ہوگئی۔ مار دھاڑ، چیخ پکار۔ مالکِ مکان کے کہنے پر بچے بوڑھے، جوان عورتیں سب چھت پر جمع ہوگئے تھے۔ کسی کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا اور ہوتا بھی تو کیا کر لیتے۔ سب لوگ تو لرز رہے تھے۔ ستم یہ کہ مکان مالک نے مجھے ایک بکس بھی دے دیا اور کہا کہ میرے بچے چھوٹے ہیں تم اسے حفاظت سے رکھنا۔ اس میں پورے خاندان کے گہنے، چوڑیاں، کنٹھے، کنگن اور بھاری نقدی تھی۔ مکان کے پیچھے آٹے کی مل کا ایک حصہ خالی پڑا تھا جس

صبح تک سب لوگ تتر بتر ہوگئے تھے۔ منظر ایسا تھا کہ پل بھر کا بھروسا نہیں تھا

میں جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں —— (اب پروفیسر نارنگ کی آنکھیں مستقل زمین کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ ان کے چہرے کے تاثر صاف بتا رہے ہیں کہ وہ اس خوف و دہشت کو اب بھی محسوس کر رہے ہیں) —— ان جھاڑیوں میں کود کر میں نے اپنی جان بچائی۔ صبح تک سب لوگ تتر بتر ہوگئے تھے۔ منظر ایسا تھا کہ پل بھر کا بھروسا نہیں تھا —— ایک لمبی کہانی ہے۔ بہ ہر حال ان کا بکس، میں نے ان کے وارثوں تک پہنچا دیا۔

نارنگ صاحب پھر خاموش ہو جاتے ہیں۔ آفس میں ایک خوف ناک سناٹا پھیل جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد نیند سے بیدار ہوئے شخص کی طرح پھر بولتے ہیں —— ''آج بھی ایسے نعرے اور ایسی دہشت رونگٹے کھڑے کر دیتی ہے۔ ہندو ہوں یا مسلمان بھیڑ کا پاگل پن کبھی یہ نہیں سوچتا کہ یہ اس پیدا کرنے والے کی کتنی بڑی توہین ہے —— انسان کا خون بہانا، خلقِ خدا کو عذاب میں ڈالنا، خدا اور انسانیت دونوں کی توہین ہے، کوئی مذہب اس کی تعلیم نہیں دیتا لیکن مذاہب کے ٹھیکے دار کھلم کھلا یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ اس لیے تو جو ادیب فرقہ واریت کا چور دل میں رکھتے ہیں ان کو میں ادیب نہیں سمجھتا۔

••••••••••••••

ایوانِ غالب

نظم و نثر کی قلمرو کا انتظام ایز دو توانا کی
عنایت سے خوب ہو چکا - اگر اس نے چاہا تو
قیامت تک میرا نام و نشان باقی رہے گا-

غالب

عود ہندی طبع اول میرٹھ 1858ء

محمد حنیف رامے

غالب اور میں

غالبؔ کی شخصیت اور اس کی شاعری ، دونوں نے مجھے ساتھ ساتھ متاثر کیا۔ میرے اندر چھپے ہوئے مصوّر نے کچی عمر ہی میں غالبؔ کی شکل وصورت اور لباس ، خصوصاً اونچی ٹوپی کے پیچھے چھپے ایک ایسے فرد کو پہچان لیا تھا جس کے پاؤں تو زمین پر تھے لیکن سر بادلوں میں تھا۔

خود میں ایسے خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس کے کئی افراد نشر و اشاعت کے میدان کے نمایاں کردار تھے۔ پنجاب بک ڈپو کے بعد مکتبۂ اردو ، نیا ادارہ اور پھر مکتبۂ جدید وہ ادارے تھے جہاں سے "ادبِ لطیف"، "سویرا"، "اردو ادب" اور بعد میں "نصرت" جیسے جریدے شایع ہوتے تھے اور جن کے یہاں برِصغیر کے چیدہ چیدہ دانشور ، ادیب اور شاعر آتے جاتے رہتے تھے۔ انھی کی محفلوں میں غالبؔ کی خوددار و تہ دار شخصیت اور خود بین و جہاں بین شاعری سے میرا پہلا پہلا تعارف ہوا۔

کچھ تو ویسے ہی کتابیں میرا اوڑھنا بچھونا تھیں اور کچھ غالبؔ کے عہد کے ادبی معرکوں کا ذکر اذکار مذکورہ اشاعتی اداروں میں آنے جانے والے مصنفوں کے منہ سے سنا تھا۔ میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا جب میں نے ڈپٹی نذیر احمد ، راشد الخیری ، پریم چند ، کرشن چندر اور احمد ندیم قاسمی کے ناولوں اور افسانوں کے ساتھ ساتھ رتن ناتھ سرشارؔ کے "فسانۂ آزاد" کی چاروں جلدیں پڑھ ڈالی تھیں اور ہزاروں اشعار مجھے زبانی یاد تھے۔ پھر "خیابانِ اردو" کے نام سے جو کتاب ہمارے نصاب کا حصہ تھی اس میں شامل تمام نظمیں اور غزلیں بھی ازبر تھیں۔ انھی دنوں اردو کے امتحانی پرچے میں غالبؔ اور ذوقؔ کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوے میں نے یہ چند اشعار بھی درج کیے تھے :

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے ، پہ تماشا نہ ہوا

☆

ہوا ہے شہ کا مصاحب ، پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

☆

ہم سخن فہم ہیں ، غالبؔ کے طرف دار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے بڑھ کر کوئی کہہ دے سہرا

☆

ہم کہاں کے دانا تھے ، کس ہنر میں یکتا تھے؟
بے سبب ہوا غالبؔ ، دشمن آسماں اپنا

امتحانی پرچے واپس ہوے تو حکم ہوا کہ میں اپنا جواب کلاس میں پڑھ کر سناؤں۔ استادِ محترم نے مسرت آمیز تعجب کا اظہار کیا کہ غالبؔ کے بارے میں اتنی معلومات مجھے اس عمر میں حاصل ہیں۔ ایک بات پر انھوں نے خصوصی زور دیا کہ میں نے تمام اشعار وزن میں لکھے اور وزن میں پڑھے تھے۔

شروع شروع میں غالبؔ کی وہ غزلیں زیادہ متوجہ کرتی تھیں جو آسان لفظوں اور مروجہ زمینوں میں تھیں۔ مثلاً:

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

☆

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

☆

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

دیکھ کر تجھ کو چمن بسکہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس
غالب

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
غالب

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قد دلکش سے جو گلزار میں آوے
غالب

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے
غالب

غالب

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے
غالب

نشّہ رنگ سے ہے واشُدِ گل
مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں
غالب

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
غالب

در خور قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا
غالب

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
غالب
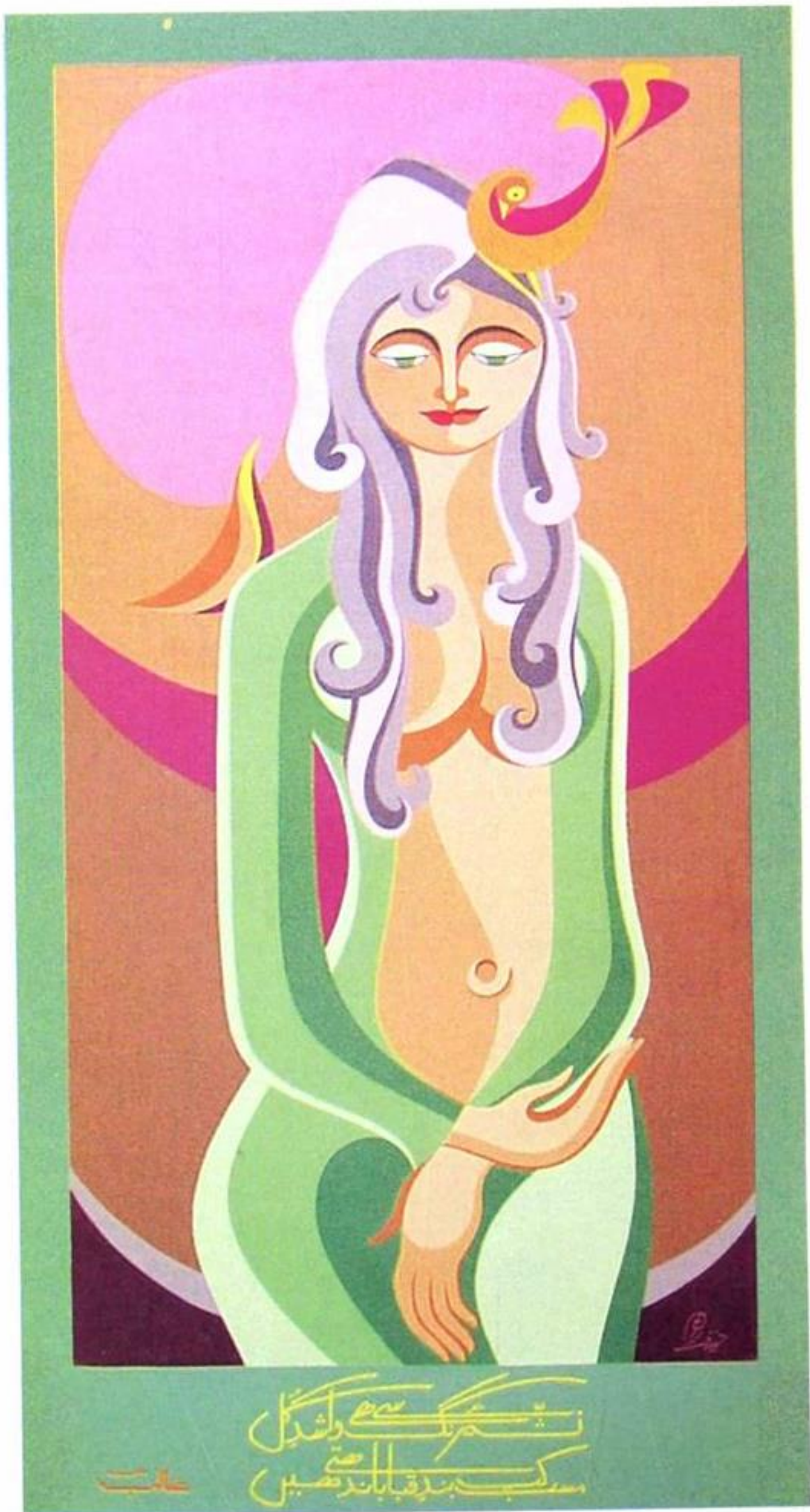
ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

☆

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت ، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار ، کوئی ہمیں ستائے کیوں

☆

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

☆

عشق مجھ کو نہیں ، وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

☆

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا ، برا نہ ہوا

☆

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

یہ الگ بات کہ اس وقت صرف سامنے کے معنی سمجھ میں آتے تھے لیکن جوں جوں مطالعہ وسیع ہوتا گیا اور ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوا، نہ صرف غالب کی فارسی آمیز غزلیں کسی حد تک پلّے پڑنے لگیں بلکہ اُس کی بظاہر سادہ اور سلیس غزلوں کے پُر پیچ اور پہلو دار معنی بھی سمجھ میں آنے لگے۔ پھر جیسے جیسے اس کے شعروں میں دلچسپی بڑھی، اس کی شخصیت کے بارے میں جاننے کا شوق بھی تیز ہوتا گیا۔

غالب کے بارے میں میرے چھوٹے سے ذہن میں یہ نقشہ مرتب ہوا کہ ایک غیرت مند شخص زندگی کی مشکلات میں سے گزر رہا ہے اور زندگی اسے درد والم کے ساتھ ساتھ جو لطف و راحت دے رہی ہے وہ اس واردات کو شعروں کی صورت دیتا جا رہا ہے۔ اس زمانے میں مجھے فیض کی ''نقشِ فریادی'' کے ساتھ ساتھ ساحر لدھیانوی کی ''تلخیاں'' بھی تقریباً زبانی یاد تھی، میں نے ساحر کا یہ شعر غالب پر چپکا دیا:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

بعد میں غالبؔ کے دو روپ اس وقت میرے سامنے آئے جب میں گورنمنٹ کالج لاہور سے اقتصادیات میں ایم اے کر رہا تھا لیکن میرا دل اس مضمون میں نہیں لگ رہا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب اردو کے نامور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو پر لذّتِ آوارگی طاری تھی۔ وہ صبح صبح اپنے گھر سے ناصر باغ، جو اس وقت گول باغ کہلاتا تھا، آ جاتے اور میں، کہ لاہور میں رہتے ہوئے بھی مظفر علی سیّد کی ہم نشینی کی خاطر نیو ہوسٹل میں داخل ہو چکا تھا، نیو ہوسٹل سے نکل کر کالج جانے کے بجائے ناصر باغ کی کسی جھاڑی کے اندر بیٹھے سعادت حسن منٹو کی باتیں سننے جا پہنچتا تھا۔ انھی دنوں میں نے منٹو صاحب کو ان کے افسانوں میں اور ان کے افسانوں کو منٹو صاحب میں ڈھلتے دیکھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ غالبؔ کی زندگی اور اس کی شاعری کا بھی آپس میں کچھ اسی طرح کا رشتہ ہے۔ اس کی زندگی اور شاعری بھی باہم اس طرح گھل مل گئے تھے کہ محسوس ہوتا تھا اس کی شاعری اس کی زندگی اور اس کی زندگی اس کی شاعری ہے۔

غالبؔ کا دوسرا روپ مجھ پر مصورِ مشرق رحمٰن چغتائی کے حوالے سے کھلا۔ اگرچہ میں لڑکپن ہی سے ''مرقعِ چغتائی'' اور ''نقشِ چغتائی'' میں بنائی ہوئی ان کی تصویروں سے متاثر تھا لیکن یہ قریب قریب اسی طرح کی مرعوبیت تھی جو اقبالؔ کے سلسلے میں ان کے بیشتر معاصروں اور مفسروں کو لاحق تھی۔

سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے ترانۂ درد
سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا

اور میں نے تو یہ بھی سن رکھا تھا کہ چغتائی صاحب نے یہ تصویریں غالبؔ کے لئے سے نہ بنائی تھیں بلکہ پطرسؔ اور تاثیرؔ نے غالبؔ کے اشعار ان پر چسپاں کر دیے تھے۔ جب منٹو صاحب سے غالبؔ کا بار بار ذکر سنا اور اندازہ ہوا کہ وہ کس عاشقانہ حد تک اس کے گرویدہ ہیں تو غالبؔ کو پڑھنے اور چغتائی کو دیکھنے کی ازسرِ نو ترغیب ملی۔ تب محسوس ہوا غالبؔ لفظوں کا مصوّر ہے اور یوں غالبؔ کی ایمجری (imagery) اپنی جداگانہ حیثیت سے میری فضائے یاد میں محفوظ ہونے لگی۔ یہ ایمجری (تصوراتی تصویر کشی) کئی سال تک

اندر ہی اندر پلتی رہی یہاں تک کہ میرے سب سے بڑے بھائی، ''سویرا'' کے بانی مدیر اور ناشر، نذیر احمد چودھری مرحوم نے دعوت دی کہ میں ان کے ''نیا ادارہ'' کے لیے غالبؔ کا دیوان مصور کروں۔ یہ دیوان ۱۹۶۵ء میں شایع ہوا تھا اور اس کے لیے سرورق کے علاوہ میں نے اکیس ڈرائنگز (drawings) بنائی تھیں۔ پھر یہ ڈرائنگز اندر ہی اندر پینٹنگز (paintings) میں ڈھلنے لگیں اور قریباً چالیس سال بعد ان میں سے کچھ کو منتخب کر کے اور ان میں کچھ اور کو شامل کر کے میں نے غالبؔ کے مندرجہ ذیل اشعار کے حوالے سے "24"X48 سائز کی کینوس پر بارہ آئل پینٹنگز اس طرح بنائیں کہ ہر تصویر کے ساتھ متعلقہ شعر کی خطاطی بھی اپنے ہاتھ سے کی۔ وہ اشعار جنھیں مصور کیا گیا یہ ہیں:

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگزار تھا

☆

نشۂ رنگ سے ہے وا شُدِ گل
مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

☆

دیکھ کر تجھ کو چمن بس کہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گُل گوشۂ دستار کے پاس

☆

در خورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

☆

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوے

☆

سایے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تُو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

☆

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خُو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے

☆

عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر
دامن کو اُس کے آج حریفانہ کھینچیے

☆

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہوتے تک

☆

نینداس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

☆

سب کہاں، کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

☆

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

غالبؔ نے بظاہر خاصی دردناک زندگی گزاری لیکن انسان جب زندگی کو اس کی گہرائی اور اونچائی میں پہچاننے لگتا ہے تو اس پہچان سے اس کے اندر ایک راحت اور لطف کی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ فنکار خود اپنا سب سے بڑا ناقد ہوتا ہے۔ غالبؔ کو محض شاعرانہ تعلّی کے طور پر اپنی بلند قامتی کا احساس نہ تھا، وہ فن کے بلند ترین معیاروں سے اپنے آپ کو پرکھ رہا تھا۔ اس نے جس بے رحم کانٹ چھانٹ کے بعد اردو شاعری کا مختصر ترین دیوان شائع کیا اسی سے پتا چل جاتا ہے کہ وہ اپنے کلام کا کتنا کڑا اور کھرا نقاد تھا۔ جہاں اس نقاد نے اسے اطلاع دی تھی کہ وہ اپنے دور کا سب سے بڑا شاعر

ہے وہاں اس اطلاع نے اسے یہ راہ بھی دکھائی تھی کہ وہ اُس رسم کو توڑتا رہے جس کے تحت کوئی خوددار شخص سر اٹھا کے نہ چل پاتا تھا۔ فیضؔ نے بہت بعد میں کہا تھا، ''چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے'' مگر غالبؔ نے اس رسم کو بہت پہلے توڑ ڈالا تھا۔ رشید احمد صدیقی نے اپنے مخصوص شگفتہ پیرایے میں غالبؔ کے اس رویّے کے بارے میں کہا تھا:

> غالبؔ نے کسی حال میں، سوا اپنے، کسی اور کی آڑ نہ پکڑی اور اس آڑ پکڑنے میں وہ کہیں بھاگتے چھپتے نہ پھرے۔ ہر طرح کی مشکلات کا تمام عمر سامنا رہا لیکن انھوں نے فریاد کی نہ بغاوت۔ ہر مسماری کے نیچے سے پھٹے حال لیکن مسکراتے ہوے نکلے۔ تورانی خون گرما جاتا تو اپنے ناقدوں پر جی کھول کر برس بھی پڑتے۔ اردو شاعری میں غالبؔ پہلے شخص ہیں جنھوں نے طنز میں خدا کو مخاطب کیا ہے۔

غالبؔ نے شاعر کی شخصیت اور شاعری کی طاقت کا ایسا امتزاج پیدا کیا تھا جو ہر دور کے سچے اور بڑے فنکار کے لیے کسوٹی بنا رہے گا۔ لیکن یہ امتزاج کوئی ایک دن میں یا بہت آسانی سے پیدا نہیں ہو گیا تھا۔ ناقدری کا احساس اور اپنے کام پر فخر اس کے یہاں دو متضاد رویوں کے طور پر ایک دوسرے کے متوازی چلتے رہے۔ چنانچہ ایک موقعے پر اس نے کہا تھا:

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

اس شعر میں ناقدری کا احساس بہت واضح ہے جو اسے یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ میں کوئی تنگ بند شاعر نہیں، میرا ایک ماضی ہے اور اگر میں شاعری کے میدان میں اترا ہوں تو اس لیے نہیں کہ میرے پاس کرنے کو کچھ اور نہ تھا۔ یہ تو ایک طرح سے معاشرے پر میرا احسان ہے کہ میں نے اپنی زندگی اس قابلِ قدر کام کے لیے وقف کر رکھی ہے جس کی تم قدر نہیں کر رہے۔

اسی طرح ایک اور جگہ غالبؔ نے کہا ہے:

کھلا کہ فایدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

کیا خوب صورت مصرع ہے! خود اپنی زندگی میں جب کبھی ناقدری کا احساس ہوا تو میں نے خلوت اور جلوت میں یہ مصرع دہرایا ہے۔ لیکن غالبؔ صرف ناقدری ہی کے احساس کا

شکار نہ تھا، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے ہم عصر اس کی شاعری کی قدر کریں نہ کریں، اس کی شاعری قابلِ قدر تھی اور قابلِ قدر رہے گی۔ اس نے ناقدری اور قدردانی کے درمیانی تضاد کو یہ کہہ کر امتزاج کی صورت دے دی تھی کہ:

نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اس موقعے پر کچھ تکرار اور اصرار ضروری محسوس ہوتا ہے۔

شاعر، فنکار، فلسفی اور سائنسدان اکثر متضاد باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ اپنی ماؤں کے پیٹ سے سب کچھ سیکھ کر نہیں آتے بلکہ ہر روز کچھ نہ کچھ سیکھتے رہتے ہیں اور جس بات کو جس وقت اپنے دل و دماغ کی کسوٹی پر کھرا پاتے ہیں اسے اپنی تخلیق یا تحقیق میں بیان کر دیتے ہیں۔ اسے تضاد بیانی نہیں، صرف احساس اور سوچ کا ارتقا کہہ سکتے ہیں۔ دراصل وقت اور زندگی آگے بڑھتے رہتے ہیں اور شاعر اور فنکار تو اکثر دو قدم وقت اور زندگی سے بھی آگے کی بات سوچتا اور محسوس کرتا ہے۔ وہ جس سطح پر آج ہوتا ہے اگلے دن وہاں نہیں ہوتا۔ وہ بہتے ہوئے دریا کی طرح ہوتا ہے جس کے کنارے پائیداری کا اور جس کے پانی تبدیلی کا احساس دلاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے یہاں زندگی سے مراد تسلسل اور تبدل کا امتزاج ہوتا ہے۔ غالبؔ کوئی منضبط فلسفہ تو پیش نہیں کرتا لیکن جو فلسفہ اس کی شاعری کے مجموعی تاثر کی شکل میں ابھرتا ہے وہ یہی ہے کہ خوشی ہو یا غمی، تنگی ہو یا آسانی، ہر حال میں سر اٹھا کر چلو۔ انفرادی سطح ہی پر نہیں، اجتماعی سطح پر بھی غالبؔ جیسے زیرک اور حساس شخص کو اپنے ملک اور معاشرے کے زوال کے علاوہ انگریز کے غلبے کے باعث یقیناً سر اٹھا کر چلنے میں دقت پیش آتی تھی۔ لیکن جس غالبؔ نے یہ کہا تھا:

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

وہی غالبؔ یہ بھی کہتا ہے:

بیگانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو غالبؔ
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

یوں احساسِ ناقدری اور احساسِ اطمینان اس کے یہاں ساتھ ساتھ چلتے نظر آتے

ہیں۔ بُرے حالات میں غمزدہ ہونا تو آسان ہے لیکن زندگی کے دردوالم کو سہتے سہتے زندگی کے حُسن کا خوبصورت بیان اس کے کلام میں جابجا یوں ملے گا جیسے اندھیرے آسمان پر درجنوں چاند ایک ساتھ جگمگا رہے ہوں۔ پھر اسے تو اپنے بُرے حالات پر بھی فخر ہے:

درخورِ قہروغضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

یہاں غالبؔ اپنی اس یکتائی پر نازاں ہے کہ زندگی نے اسے جس قہروغضب سے دوچار کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ میں نے یہ شعر مصور کرتے ہوئے قہروغضب کی روایت کو غالب سے اٹھا کر عیسیٰؑ تک پھیلا دیا ہے بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر عیسیٰؑ کے سر پر۔ سجے کانٹوں کے تاج کو ''درخورِ قہروغضب'' کے ایک ایک بال تک پہنچا دیا ہے۔ ایک اور شعر دیکھیے جو مجھے زندگی بھر بے حد پسند رہا:

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگذار تھا

وہ شخص جسے اس کی کسمپرسی نے موت سے ہمکنار کر دیا اپنے پسماندگان سے مطالبہ کر رہا ہے کہ اسے دفنانے سے پہلے وہ اس کی میت کو شہر کی ان ہوادار گلیوں میں لیے لیے پھریں جن میں وہ دورانِ زندگی آوارہ گردی کیا کرتا تھا۔ میں نے اس شعر سے متعلقہ تصویر میں مرنے والے کی روح کو سورج جیسا چہرہ لیے ہوا کی گلیوں میں سرگرداں دکھایا ہے اور اس سرگردانی میں اسے جو لطف حاصل ہو رہا ہے اُسے سر کے بالوں کو شعاعوں میں بدل جانے سے اجاگر کیا ہے۔ اور پھر ہوا کی موجیں ہیں جنھوں نے گرم جوش آبادیوں، بے آب رہگذاروں، سرسبز میدانوں، نیلگوں آسمانوں اور مرنے والے (یا جینے والے) کے دامنوں اور تیوروں کو آپس میں یوں پرو دیا ہے کہ موت اور زندگی یکجان ہو گئے ہیں۔

ہر بڑا شاعر زندگی کے درد کے ساتھ ساتھ زندگی کی تہوں اور پردوں میں چھپی ہوئی مسرت کا بھی شناور ہوتا ہے۔ جہاں شیکسپیئر، "Hamlet","King Lear" اور "Othello" جیسے المیے لکھ رہا ہے وہیں وہ "As You Like It" ، "Mid Summer Night Dream" اور "The Merchant of Venice" جیسے طربیے بھی لکھتا ہے۔ غالبؔ کے یہاں بھی یہی کیفیت ہے۔ ''شہِ وقت'' سے لے کر ''آم'' تک کے قصیدے بھی

لکھے جا رہے ہیں اور تنگیِ حالات کا شکوہ بھی کیا جا رہا ہے۔ لیکن پھر اس شکوے میں اس کی حسِ مزاح اور شوخیِ طبع بھی شامل ہو جاتی ہے:

کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سُوئے ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

غالبؔ کے تضادات اس کی شخصیت کے تعمیری ارتقا سے عبارت ہیں۔ یہ اس کے شعور کا طبق در طبق سفر ہے۔ شعور کا لفظ میں نے یہاں شاعر کے حوالے سے استعمال کیا ہے۔ شاعر اور شعور، دونوں کا مادہ ایک ہی ہے، ش ع ر۔ عام طور پر جب شعور کا ذکر ہوتا ہے تو اسے فلسفے، منطق اور دانشوری سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس شاعری کے بارے میں تصور ہے کہ اس کا تعلق جذبات، احساسات اور قلبی واردات سے ہے۔ حالانکہ شعور اور شاعری دونوں شاعر کے وجود میں ایک ہو جاتے ہیں اور یوں شاعر وہی قرار پائے گا جو عام لوگوں سے زیادہ شعور رکھنے والا ہو۔ عام آدمی کے شعور میں احساس اور اس کے احساس میں شعور شامل نہیں ہوتا جب کہ شاعر کا شعور احساس سے معمور ہوتا ہے۔ اسی طرح شاعر کا شعور کسی فلسفی، منطقی یا دانشور کے شعور سے جداگانہ بلکہ زیادہ بھرپور ہوتا ہے کیونکہ اس میں دماغ کے علاوہ دل بھی شامل ہوتا ہے۔ قلبی اور ذہنی واردات کا امتزاج شاعر کے شعور کو ایک نئی جہت اور بلندتر مقام عطا کر دیتا ہے۔ غالبؔ اسی بلندتر مقام سے زندگی کو دیکھ بھی رہا ہے اور بیان بھی کر رہا ہے۔

غالب اردو کا پہلا بڑا شاعر ہے جس کے صاحبِ شعور ہونے میں کلام نہیں۔ میں اکثر غور کرتا ہوں کیا غالبؔ کی اردو شاعری کے بغیر اقبالؔ کی اردو شاعری وجود میں آ سکتی تھی؟ اور مجھے ہمیشہ اپنے اندر سے یہی جواب ملتا ہے کہ غالبؔ ہی نے اردو زبان کو اس مقام تک پہنچایا جہاں اقبالؔ کے لیے ممکن ہوا کہ اسے ذریعۂ اظہار بنائے۔ ''بانگِ درا'' کے دیباچے میں سر عبدالقادر نے اقبالؔ کو مخاطب کر کے یاد دلایا تھا کہ اس نے فارسی میں ''مثنوی اسرار و رموز'' اور ''پیامِ مشرق'' جیسے مجموعے تو لکھے ہیں لیکن ''گیسوئے اردو ابھی منّت پذیرِ شانہ ہے''۔ دراصل اول اول اقبالؔ نے اردو کو صرف نرم و نازک جذبات کے اظہار کے لیے استعمال کیا تھا، یہ تو کہیں دیر میں جا کر اس نے گہرے اور بلند خیالات کے اظہار کے لیے اردو کو آزمایا۔ اقبالؔ کو پڑھتے ہوئے بار بار محسوس ہوتا ہے کہ نفسِ مضمون کے

واضح فرق کے باوجود وہ اُس کاوش سے فایدہ اٹھا رہا ہے جو اردو کو وسعت اور گہرائی دینے کے لیے غالبؔ نے اپنے زمانے میں کی تھی۔ فارسی کے عظیم شاعروں نے جس سطح پر گہرے احساسات اور بلند خیالات کو شاعری کا قالب دیا تھا غالبؔ نے اسی سطح پر اپنی فارسی آمیز اردو میں کلام کیا اور یوں یہ امکان پیدا کیا کہ اقبالؔ بھی اردو کو ذریعۂ اظہار بنائے۔ ذرا ان دو مصرعوں ہی کو دیکھ لیجیے، ''ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب!'' (غالبؔ) اور ''یا رب! دلِ مُسلم کو وہ زندہ تمنا دے'' (اقبالؔ)۔ غالبؔ کی تمنا کا ''دوسرا قدم'' ہی اقبال کی تمنا کو ''زندہ تمنا'' تک پھیلا رہا ہے۔ پھر غالبؔ کے یہاں خدا سے جس بے تکلفی کا اظہار قدم قدم پر نظر آتا ہے — ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد، یا رب! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے — یہ بے تکلفی کہیں اور ملتی ہے تو صرف اور صرف اقبالؔ کے یہاں — ''روزِ حساب پیش ہو جب مرا دفترِ عمل، آپ بھی شرم سار ہو، مجھ کو بھی شرم سار کر''۔ غور کریں تو ''بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم، اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا'' (غالبؔ) اور ''میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح، تُو فقط اللہ ھُو، اللہ ھُو'' (اقبالؔ) میں بہت زیادہ فاصلہ نہیں۔ یہ فاصلہ اس وقت اور بھی کم ہو جاتا ہے جب ہم بہادر شاہ ظفرؔ کی شان میں غالبؔ کے ایک قصیدے میں یہ شعر پڑھتے ہیں:

تیرا اندازِ سخن، شانۂ زُلفِ الہام
تیری رفتارِ قلم، جُنبشِ بالِ جبریل

اور دیکھتے ہیں کہ اقبالؔ اپنے بہترین اردو کلام کو ''بالِ جبریل'' کا عنوان دے رہا ہے۔

غالب اور اقبالؔ جس قسم کا شعور رکھتے تھے اس میں خیالات اور جذبات گھلے ملے ہیں۔ وہ شعور جو جذبات اور احساسات سے جدا ہوتا ہے اس کا نام اقبالؔ نے خرد رکھا تھا اور خرد کو شیطان کا عمل قرار دیا تھا۔ لیکن یہی شعور جب غالبؔ اور اقبالؔ کا شعر بنتا ہے اور اس میں جذبات، احساسات، محبت اور عشق شامل ہو جاتے ہیں تو پھر یہ انسان دوستی میں ڈھل جاتا ہے۔ مجرد خرد انسان دشمن ہوتی ہے، خودغرض ہوتی ہے اور عمل میں آ کر چالاکی اور مکاری مین بدل جاتی ہے۔ لیکن شاعرانہ شعور اپنے اندر معاشرے کے لیے ایک درد، ایک چاہت، ایک احساسِ یگانگت رکھتا ہے۔ آج کے دور میں اس شعور کی اگر مکمل نفی نہیں ہوئی تو اس میں بے تحاشا کمی ضرور واقع ہو چکی ہے۔ دنیا میں شعور تو بہت ہے، عقل تو بہت ہے، خرد تو

بہت ہے لیکن اس خرد نے انساں کو خود پرست اور خوں خوار بنا دیا ہے۔ یہ خرد دوسروں کی جیب کاٹنے کے ساتھ ساتھ ان کا گلا گھونٹنے کا گر بھی بتاتی ہے۔ لیکن وہ شعور جو عقل کے علاوہ احساسات اور محسوسات پر مشتمل ہوتا ہے وہ یہ سوالات اٹھاتا ہے کہ ہم اپنے ہم جنسوں کے کس کام آ سکتے ہیں، ان سے کتنی محبت کر سکتے ہیں، ان کے درد میں کیونکر شریک ہو سکتے ہیں؟ غالبؔ اسی طرز کے شعور سے بہرہ ور تھا۔ چنانچہ وہ آج بھی نہ صرف اہلِ فکر اور اہلِ درد کے یہاں انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے بلکہ پرانی نسل کے لوگوں کے ساتھ ساتھ نوجوان نسل میں بھی مقبول ہے۔ جوں جوں وہ پرانا ہو رہا ہے توں توں وہ نیا ہوتا جا رہا ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل اس کے یہاں ایک دوام میں جذب ہو گئے ہیں۔ ''اب'' اور ''آیندہ'' کے لیے وہ ہر زندہ انسان کا ہمعصر ہے۔

میں نے اس بات پر بھی بہت غور کیا ہے کہ غالبؔ اپنی شاعری میں مشکل پسند کیوں ہے۔ مجھے رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ غالبؔ اپنے اردگرد کی معاشرتی زندگی کو فرسودگی اور افسردگی کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترتا دیکھ رہا ہے۔ حکمران مغلیہ خاندان چلتے چلتے بہادر شاہ ظفر جیسے شریف النفس لیکن کمزور بادشاہ تک آ پہنچا ہے جس کے بارے میں غالب نے پہلے تو کہا تھا: 'شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک' مگر پھر اس مصرع میں جو تھوڑی بہت امید نظر آتی تھی بالآخر ان اشعار تک پہنچتے پہنچتے دم توڑ گئی تھی:

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے

☆

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

وہ اپنے معاشرے کو سیاسی سطح پر تباہ ہوتے تو دیکھ ہی رہا تھا، اس نے اردو شاعری کے موضوعات کو بھی گراوٹ کا شکار ہوتے پایا تھا۔ اندر ہی اندر اسے علم تھا کہ معاشرت، معیشت اور ثقافت میں جو زوال اور انحطاط پایا جاتا ہے وہ دراصل شعور میں، بلندی اور احساس میں گہرائی کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ غالبؔ، جو فارسی شاعری کی تمام تر روایت سے بخوبی آگاہ تھا اور ایک وقت تک بیدلؔ کا عاشق رہا تھا، اپنا

سخت ترین ناقد ہوتے ہوئے کہیں یہ احساس بھی رکھتا تھا کہ وہ حافظ، خیام، عرفی اور نظیری کا ہم پلہ شاعر ہے۔ چنانچہ وہ اس بات کو اپنا فرض سمجھتا تھا کہ جس شعور اور احساس کی سطح پر فارسی کے یہ شاعر زندگی کو دیکھ اور پرکھ رہے تھے رائج الوقت اردو میں اس کی گنجایش پیدا کی جائے۔ اردو زبان پر غالب کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے غیر مقبولیت اور ناقدری کا خطرہ مول لے کر اردو کے تنگ دامن کو وسعت، بلندی اور گہرائی عطا کی اور اپنے بعد آنے والے اقبال کے لیے راہ ہموار کی۔

پھر مجھے یہ بات ہمیشہ بہت قابلِ غور محسوس ہوئی کہ وہ غالب، جو اپنے اردو کلام میں فارسی ترکیبیں استعمال کرتا ہے اور اس کلام کو سمجھنے کے لیے ذہن پر باقاعدہ زور ڈالنا پڑتا ہے، وہ اپنے خطوط میں کتنی آسان اور سادہ زبان سے کام لیتا ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ غالب طبعاً مشکل پسند نہ تھا بلکہ وہ اردو شاعری کی محدود دنیا کو شعوری طور پر، بالارادہ، وسیع کرنے کی خاطر اس میں بلند خیالی اور شدتِ احساس کو شامل کر رہا تھا۔

اقبال سے پہلے کچھ لوگوں نے اپنی شاعری میں غالب کا اندازِ بیان اختیار کرنے کی کوشش کی جن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر مصطفےٰ خان شیفتہ اور وحشت کلکتوی ہیں۔ لیکن حقیقتاً غالب کا اسلوب غالب ہی کے ساتھ ختم ہو گیا اور اگر بعد میں کسی نے غالب کو اپنے کلام میں اپنے انداز سے زندہ کیا تو وہ اقبال تھا۔ اقبال اور غالب کے درمیان کے زمانے میں ہمیں غالب کی عالی دماغی، معنی آفرینی اور خیالات کی گہرائی کم ہی نظر آتی ہے جو کم ہوتے ہوتے داغ کی نازک خیالی اور جذباتیت تک آ گئی تھی اور پھر یہی اس عہد کی شاعری کا سکہ بند اسلوب بن گیا تھا۔ البتہ حالی نے شعوری کوشش کی کہ شاعری کو نثر کی طرح آسان بنا دیا جائے اور اس کے نفسِ مضمون کو بھی بدلا جائے۔ لیکن حالی نے غالب سے جو کچھ سیکھا وہ خطوطِ غالب سے سیکھا۔ حالی کی شاعری میں درد تو ہے لیکن غالب کے پایے کی بلندیٔ خیال اور شدتِ احساس نہیں ملتی جو بعد میں صرف اور صرف اقبال کے یہاں پورے زور و شور سے نمایاں ہوئی۔

اکثر سمجھا جاتا ہے کہ جو مرصع و مقفّیٰ زبان اردو نثر کے طور پر لکھی جاتی تھی اسے سرسید نے اپنے جریدے "تہذیب الاخلاق" کے ذریعے سے آسان بنایا۔ لیکن شاید یہ کہنا قرینِ حقیقت ہو کہ اردو نثر کو سادگی اور سلاست عطا کرنے کی داغ بیل اگر کسی نے ڈالی تو وہ

غالب تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ مشکل پسند غالب، جو اپنے کلام میں فارسی تلمیحات اور تراکیب کا بے دریغ استعمال کرتا ہے، جب نثر لکھنے بیٹھتا ہے تو اپنے خطوط میں خالصتاً گفتگو کا لہجہ اختیار کرتا ہے۔ گفتگو کے اسی لہجے نے آگے چل کر اردو نثر کو روایتی عربی اور فارسی نثر کی نقالی کے بجائے زمینی اور مقامی رنگ دیا۔ مقامِ شکر ہے کہ غالب کے بعد آنے والے اردو نثر نگار ''خطوطِ غالب'' سے متاثر ہوئے ورنہ پرانے انداز کی اردو نثر سے تو مولانا ابوالکلام آزاد ہی پیدا ہو سکتے تھے جن کی نثر سے شکوہ کا احساس تو ہوتا ہے اور ہم اس پُر تکلف زبان سے مرعوب بھی ہوتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی تفہیم بھی دشوار ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اگر غالب کی اردو شاعری نہ ہوتی تو اقبال کی اردو شاعری بھی نہ ہوتی اور اگر خطوطِ غالب نہ ہوتے تو اردو نثر میں جو روانی اور جولانی آئی یہ ابوالکلام آزاد کی نثر کی نذر ہو جاتی اور شاید آج بھی لوگ مرصع و مقفیٰ نثر لکھنے کی رسم نباہ رہے ہوتے۔

غالب اردو شاعری میں ایک بالکل نئی آواز ہے۔ وہ ایک نئی روایت کو جنم دیتا ہے اور اسی لیے اپنے وقت کے لوگوں کو پوری طرح ہضم نہیں ہوتا۔ یہ دور ایسا ہے جس میں مثنویاں بھی لکھی جا رہی تھیں جو نسبتاً آسان لہجے میں تھیں لیکن ان کا نفسِ مضمون بھی آسان تھا۔ میر ہو یا میر درد، ان کے کلام میں یقیناً ایک بے ساختہ سادگی تھی اور ان کا کلام احساس کی گہرائی سے بھی مالا مال تھا لیکن بلند خیالی سے اس کا زیادہ تعلق نہ تھا۔ اسی طرح اگر ناسخ مشکل پسند تھا تو اس کی مشکل پسندی زبان کے اعتبار سے تو تھی، خیالات کے اعتبار سے نہ تھی اور اس عہد کے لوگ اس سے کوئی زیادہ پریشان بھی نہیں تھے۔ اس کے برعکس غالب کی مشکل پسندی لوگوں کو تنگ کرتی تھی، اس کا مذاق اڑایا جاتا تھا، اس کی پیروڈی کی جاتی تھی۔ جہاں تک عربی اور فارسی تراکیب کا تعلق ہے ان کے باعث اُس دور کے پڑھے لکھے لوگوں کو آج کے پڑھے لکھے لوگوں کی بہ نسبت بہت کم دِقت پیش آتی تھی۔ اصل مسئلہ زبان کی مشکل کا کم اور خیالات کی بلندی کا زیادہ تھا۔ غالب نے نئی، اونچی اور گہری باتیں کہنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس نے شاعری کو روایتی عشقیہ اور صوفیانہ مضامین سے آگے لے جانے کا جتن کیا جس سے اردو زبان میں یہ صلاحیت پیدا ہونی شروع ہوئی کہ وہ ان خیالات و جذبات کو بھی ادا کر سکے جن میں وسعت، گہرائی اور بلندی تھی۔ اس کوشش کے نتیجے میں اردو شاعری کا تناظر وسیع ہوا۔

غالبؔ نے روایتی اردو شاعری کے کینوس کو پھیلا دیا۔ وہ اردو شاعری کی روایت سے زیادہ حافظ، خیام، عرفیؔ، نظیریؔ اور بیدلؔ کی فارسی شاعری کی روایت سے منسلک تھا۔ وہ میر تقی میرؔ کو تسلیم تو کرتا تھا لیکن براہِ راست اس سے متاثر نہ تھا۔ وہ فارسی کے ان شاعروں سے متاثر تھا جو آج بھی دنیا کے عظیم شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ وہ شاعر ہیں جن کا تناظر عالمگیر تھا اور وہ کسی انحطاط پذیر معاشرے یا سلطنت کے اندر پیدا نہیں ہوئے تھے۔ وہ تاریخ کے اس دور میں پیدا ہوئے تھے جب اسلام ایک قوت تھا۔ غالبؔ متاثر تو ان شاعروں سے تھا لیکن وہ جی رہا تھا ایک انحطاط پذیر معاشرے میں۔ یہ تضاد غالبؔ کو قدم قدم پر پریشان کرتا تھا اور اسی سے اس کے یہاں ہمیں درد کی ایک جداگانہ کیفیت ملتی ہے۔ غالب کے پورے کلام میں اردو دیوان کا حصہ تو بہت مختصر ہے لیکن اس دیوان نے مختصر ہونے کے باوجود اردو شاعری میں نئی سمتوں کا اضافہ کیا۔ اور پھر وہ وقت آیا جب ہماری ثقافتی تاریخ میں اقبالؔ شامل ہوا جو غالبؔ ہی کی طرح دنیا کے عظیم شاعروں کا ہمسر ہے اور جس کا تناظر عالمگیر ہے۔ جہاں اس نے عربی اور فارسی علم وادب تک رسائی حاصل کر رکھی تھی وہاں وہ مغرب کے معتبر فلسفیوں اور دانشوروں سے بھی آگاہ تھا لیکن وہ غالبؔ ہی کی طرح ایک فرسودہ اور زوال پذیر معاشرے میں پیدا ہوا تھا۔ یہ اقبالؔ ہی کا حق تھا کہ وہ غالبؔ سے کچھ سیکھتا اور جہاں تک وہ اردو شاعری کو پہنچا گیا تھا اسے اس سے آگے لے کر چلتا۔

غالبؔ کے یہاں جو جمالیات ہے وہ اپنی جڑوں کے اعتبار سے یقیناً مقامی کلچر کی پیداوار ہے لیکن وہ اس میں مسلسل اضافہ کرتا رہا تھا:

چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سُو
موجِ گُل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب

طوفانِ طرب کے حوالے سے روایتی طور پر موجِ صبا اور موجِ شراب کا تصور تو کیا جا سکتا تھا لیکن موجِ گُل اور موجِ شفق خالصتاً غالبؔ کی دین ہے۔ اسی طرح غالبؔ کے یہاں جو نفسِ مضمون ہے وہ روایتی اردو شاعری سے، خصوصاً جب تک اقبالؔ نہیں پیدا ہوا، یکسر مختلف ہے۔ روایتی اردو شاعری کا مرکز ومحور آدمی ہے، غالب اور اقبالؔ کی شاعری کا مرکز و محور انسان ہے۔ غالبؔ کہتا ہے:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

اور اقبالؔ نے کہا تھا:

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے، اب مرا انتظار کر

بے شک غالبؔ کے اردو کلام میں جابجا مبہم اور مشکل اشعار ملتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ سادہ اور آسان شعروں کی بھی کمی نہیں۔ البتہ اس کے سادہ اشعار میں بھی خیالات کی بلندی ایک بہت واضح عنصر کے طور پر موجود ہے۔ اس کے سادہ اور بے ساختہ اشعار کو سہل ممتنع کا درجہ دیا جاتا ہے۔ سادہ بات میں گہرائی نہ ہو تو وہ عمومیت کا شکار ہو جاتی ہے اور ایک سپاٹ بیان بن کر رہ جاتی ہے۔ مگر غالبؔ کی چھوٹی بحروں اور سادہ زبان والی غزلیں دیکھی جائیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے معانی میں کتنی وسعت اور گہرائی ہے جو صرف کسی ایسے شاعر ہی کا کمال ہو سکتی ہے جس نے وقت کے آفاق میں پھیل کر اور نفس کی گہرائیوں میں اتر کر زندگی کے درد کو تمام تر سمتوں اور وسعتوں میں محسوس کیا ہو۔ بلندیٔ فکر اور شدتِ احساس کے گھال میل سے غالبؔ جب ایک سادہ اور آسان سا شعر ہمارے سامنے لاتا ہے تو ہم دنگ ہو کر رہ جاتے ہیں کہ سادگی و آسانی کے پردوں میں کتنے تہ در تہ معانی چھپے ہیں۔

غالبؔ کے سادہ اشعار کی مثال یہ ہے جیسے کوئی ناول نگار بڑے بڑے ضخیم شاہکار تصنیف کرتے کرتے ایک ایسی چھوٹی سی کہانی یا افسانہ لکھ دے جو عہد بہ عہد لوگوں کو متاثر کرتا رہے۔ دراصل وہ فنکار، ادیب یا شاعر جس نے زندگی کو اس کی بلندیوں اور پستیوں میں دیکھا اور چکھا ہو جب کوئی بے ساختہ بات بھی کرتا ہے تو اِس میں اُس سارے سفر کی خوشبو اُتر آتی ہے جو اس کے دل و دماغ نے طے کیا ہوتا ہے۔ غالبؔ کے سادہ اشعار میں ایک ایسی پُرکاری و پُرگوئی نظر آتی ہے جو اس کی شاعری کو سادگی تو عطا کرتی ہے لیکن اسے عامیانہ نہیں ہونے دیتی اور وہ کم سے کم الفاظ میں بڑی سے بڑی بات کہہ جاتا ہے۔

غالبؔ کے یہاں صرف عشقیہ شاعری نہیں، اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ عشق تو بنیادی طور پر ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کو انسان سے اور بالآخر کائنات اور خدا سے ملاتا ہے۔ اقبالؔ تک پہنچتے پہنچتے عشق کے معانی فرد کے درد سے چلتے چلتے قوموں کے عروج و

زوال تک پھیل گئے۔ لیکن عشق کے معانی کو غالبؔ ہی نے پھیلانا شروع کیا تھا:

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی ، دردِ بے دوا پایا

یہاں عشق نہ صرف دُھن اور لگن کی بات ہے، commitment کی بات ہے بلکہ انسانی مقدر کا معاملہ ہے۔ عشق کے یہ سارے انداز غالبؔ کے یہاں موجود ہیں البتہ اس کے یہاں جو دردِ عشق ہے اسے دردِ زندگی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ تمنا اور حصول کے درمیان کی وہ خلیج جو پاٹے نہیں پاٹی جاتی اِس درد کا مخرج و منبع ہے اور یہی وہ خلیج ہے جو آج کے انسان کو بھی درپیش ہے۔ انسان کی لامحدود چاہتوں، خواہشوں اور خوابوں کے مقابلے میں زندگی اسے جو کچھ عطا کرتی ہے وہ بہت محدود ہے۔ آج کا انسان اس تضاد کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اسے ازخود کوئی زبان نہیں دے پاتا۔ مگر جب وہ غالبؔ کا کلام اٹھا کر دیکھتا ہے تو اس کے درد کو زبان مل جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی فکر و احساس رکھنے والے لوگوں کو غالبؔ اپنے دل و دماغ سے بہت قریب محسوس ہوتا ہے۔ وہ درد جو آج کی زندگی آج کے انسان کو دے رہی ہے غالبؔ نے بہت پہلے اسے ایسی زبان دے دی تھی کہ

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

یہ درد جو انسان کا ورثہ ہے اور جو انسان کی زندگی میں ہمیشہ موجود رہے گا غالبؔ کے یہاں جتنے بھرپور طریقے سے بیان ہوا ہے وہ بہت کم شاعروں کو نصیب ہوا ہے۔ غالبؔ نے یہ ازلی اور ابدی دردِ زندگی نہ صرف اپنے گوشت پوست بلکہ اپنے دل و دماغ اور اپنی روح کی سطح پر سہا تھا۔ اس نے دردِ زندگی کو عورت اور مرد کے رشتے ہی تک محدود نہ پایا تھا بلکہ اس سے آگے جا کر اسے ساری انسانیت کے نمائندے کے طور پر اپنے وجود میں محسوس کیا تھا۔ پھر یہ درد اس نے محض مرد بن کر نہیں، پورا انسان بن کر محسوس کیا تھا۔ اس نے دنیا کو ایک زندہ حقیقت اور خدا کو ایک زندہ طاقت کے طور پر دیکھا تھا۔ خدا، دنیا اور انسان کے رشتوں کے اندر جہاں جہاں درد چھپا ہوا ہے اور جہاں جہاں ناامیدی اور دکھ نے جڑیں گاڑ رکھی ہیں اس کی نشان دہی جس طرح غالبؔ نے کی ہے اردو شاعری میں اس سے پہلے کسی نے نہیں کی۔ غالبؔ کے یہاں فلسفہ بھی ہے، تصوف بھی ہے، عشق بھی ہے لیکن یہ

سب کچھ مقدرِ انسان اور دردِ زندگی کے حوالے سے ہے۔ اس نے فلسفے اور تصوف کو انسان شناس (humanize) کیا ہے اور تجرید سے نکال کر انسان کی زندگی سے منسلک کر دیا ہے۔

غالبؔ لفظوں کا مصوّر ہے۔ اس کی امیجری کے پیچھے اردو کی پوری روایت اپنی جگہ اور فارسی کی پوری روایت اپنی جگہ بول رہی ہے۔ میں نے اسے مصور (illustrate) کرتے ہوئے کوشش کی کہ اسی کی امیجری کو اپنے رنگوں اور لکیروں میں بیان کر سکوں۔ مثلاً یہ شعر اور اس کے حوالے سے بننے والی تصویر دیکھیے:

دیکھ کر تجھ کو چمن بس کہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گُل گوشۂ دستار کے پاس

اس شعر کی امیجری روایتی تو ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں ایک نیا پن بھی ہے۔ یہاں گُل ایک جامد شے نہیں بلکہ ایک زندہ کردار ہے اور یوں از خود محبوب کی دستار تک پہنچ گیا ہے۔ یہ روایت اور جدت کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔ امیجری اتنی واضح ہے کہ آپ گُل کو از خود حرکت کرتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے اس کا تصور یوں باندھا کہ ایک پودا ہے جس کے پھول ایک سرو قامت خاتون کے سراپے کو سجانے کے لیے از خود اس کی جانب لپک رہے ہیں۔ غالب نے تو ایک پھول محبوب کی دستار تک پہنچتے ہوئے دیکھا تھا لیکن میں نے اس میں اپنی طرف سے بھی کچھ اضافہ کر دیا ہے۔ اب ایک پھول صرف گوشۂ دستار تک ہی نہیں پہنچا، اس کے ماتھے پر بھی سج گیا ہے بلکہ کچھ پھول اس کے کانوں میں بھی پروئے گئے ہیں اور اس کے سینے پر بھی پہنچ گئے ہیں یہاں تک کہ ایک پھول اس کی ناف کے آس پاس بھی جا سجا ہے۔ غالب نے جو اشارہ کیا تھا میں نے (عقل مند نہ ہوتے ہوئے بھی اس سے کچھ نہ کچھ سیکھ کر) اسے وسیع تر معنی پہنا دیے ہیں۔ غالبؔ نے ایک پرانے تصور کو نئے معنی پہنائے تھے کہ محبوب باغ میں آتا ہے تو پھول نہ صرف کِھل اٹھتے ہیں بلکہ اُسے سجانے چل پڑتے ہیں۔ اس نے انسان اور فطرت کے درمیان ایک پُل تلاش کیا اور بتایا تھا کہ فطرت اپنے طور پر انسان سے ہم آہنگ ہے۔ آج کل ہمارے یہاں ایک نیا احساس پیدا ہوا ہے کہ فطرت اور ماحول کو تباہ کر کے انسان نے دراصل اپنے آپ کو تباہ کیا ہے۔ فطرت انسان کی ماں ہے کہ وہ اسی کے اندر سے پیدا ہوا ہے، اسے تسخیر کرنے کے نام پر تباہ کر کے ایک طرح سے انسان نے اپنی جڑیں کاٹی ہیں۔ غالبؔ کا اشارہ ہے کہ فطرت تو آپ کی

دوست ہے، آپ کی مدد کر رہی ہے، آپ کو حسن بخشنے کے لیے بے چین ہے۔ یہ نہیں کہ آپ اس کا پھول توڑ کے جُوڑے میں لگائیں گے تو پھر سجیں گے۔ اگر آپ زندگی کی وحدت پر ایمان رکھیں تو پھول اپنی ٹہنیوں پر رہتے ہوئے بھی آپ کے حسن میں اضافہ کر دیں گے۔ پھر یہ شعر دیکھیے:

نشۂ رنگ سے ہے وا شدِ گُل
مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

اب یہ جو رنگ کے اندر ایک نشہ دیکھنا ہے یہ ایک نیا تصوّر ہے۔ رنگ کے اندر بہت سے لوگوں نے بہت کچھ دیکھا ہوگا۔ مثلاً خوبصورتی دیکھی ہوگی۔ لیکن غالبؔ نے ایک انوکھا خیال پیش کیا ہے کہ رنگ کا اپنا ایک نشہ بھی ہوتا ہے۔ آج جدید طبیعیات (physics) نئی نئی دریافتیں سامنے لا رہی ہے جن کے مطابق ہر رنگ کی ایک قوت ہے اور ہر رنگ کا ایک مزاج ہے۔ ہر رنگ جداگانہ اثر رکھتا ہے۔ سرخ رنگ کا ایک اثر ہے، سبز رنگ کا دوسرا اثر ہے۔ بہار کے رنگوں کا اپنا مزاج ہے۔ خزاں کے رنگوں کا اپنا مزاج ہے۔ غالبؔ اس جمالیات کی توسیع (extension) کر رہا ہے جو اسے ورثے میں ملی تھی۔ اُسے اظہار پر جو قدرت حاصل ہے وہ اس کے ذریعے تجریدی (abstract) خیالات کو بھی بڑے ٹھوس (concrete) لفظوں میں بیان کر جاتا ہے۔ یہی قدرتِ اظہار مصوّروں کو ترغیب دیتی ہے کہ غالبؔ کی تراشی ہوئی لفظی تصویروں کو رنگوں اور لکیروں کی زبان بخش دیں۔ میں نے یہ شعر مصور کرتے ہوئے محبوب کی مستی کو کھُلے بندِ قبا سے چلتے ہوئے سر پر بیٹھے پرندے، شانے پر سجے چاند اور زلفوں کی والہانہ ترتیب سے مزید اجاگر کیا ہے۔

غالبؔ کو چغتائی نے بھی مصور کیا ہے اور میرے ہم عصر صادقین نے بھی۔ میں نے بھی اپنی سی کوشش کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ بہت سے دیگر شعرا کی بہ نسبت غالبؔ کے بارے میں مصوّروں کو یہ کیوں سوجھی کہ اسے مصوّر کرنا چاہیے؟ اس لیے کہ غالبؔ خود ایک مصوّر ہے۔ وہ لفظوں سے تصویر بناتا ہے جو اتنی واضح ہوتی ہے کہ اس سے مصوّروں کو ایک نقطۂ آغاز مل جاتا ہے جہاں سے وہ بات کو آگے لے جا سکتے ہیں۔

میں نے غالبؔ کے حوالے سے چغتائی اور صادقین کا ذکر کیا ہے۔ یہ ان کے کام کا ناقدانہ جائزہ لینے کا مقام نہیں۔ لیکن آپ پوچھ سکتے ہیں کہ میرا خود اپنے کام کے بارے

میں کیا خیال ہے اور میں نے غالبؔ کے ساتھ کس حد تک انصاف کیا ہے؟

میں غالبؔ کے ساتھ جس حد تک انصاف کر سکا شاید فی الحال اتنا ہی کیا جا سکتا تھا۔ غالبؔ کی شاعری کسی خاص دَور تک محدود نہیں اور آنے والا ہر مصوّر اس کی نئی تشریح کرے گا۔ چغتائی، صادقین اور میں نے اپنی اپنی مصورانہ تشریح پیش کر دی ہے اور بہت سا کام آنے والے مصوّروں کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ بڑی شاعری کی اپنی زندگی ہوتی ہے اور وہ ایک ایسے پھول کی طرح ہوتی ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ پرت اندر پرت کھلتا چلا جاتا ہے اور یوں نظروں سے چھپے نت نئے معانی کی تہیں اجاگر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ جس طرح ہر دور الہامی کتابوں کی اپنی تعبیر کرتا ہے اسی طرح ہر دور بڑی شاعری کی بھی ایک نئی تفسیر کرتا ہے۔ چنانچہ غالبؔ اور اقبالؔ کی سطح کے بڑے شاعروں کو ہر دور اپنے طور پر پہچانتا ہے۔ اس لیے ان کے ساتھ ایک وقت میں ایک حد تک ہی انصاف کیا جا سکتا ہے۔ تنقید ہو یا تصویر کشی، غالبؔ پر حرفِ آخر ابھی وجود میں نہیں آیا۔ آنے والے دور میں اس کے کلام کی نہ جانے کیا کیا وضاحتیں ہوں گی۔ ہمارے دور میں جن لوگوں نے بھی غالبؔ کو سمجھنے اور مصوّر کرنے کی کوشش کی ہے وہ اپنے دور کی حد تک ہے۔ اس دور میں شاید اس سے بہتر کوشش نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن آنے والے دور میں پتا نہیں کیا کیا موشگافیاں ہوں گی۔

غالبؔ اور اقبالؔ کے حوالے سے بات کرتے ہوئے سوال ابھرتا ہے کہ ہمارے یہاں غالبؔ کو وہ پذیرائی کیوں نہ ملی جو اقبالؔ کو حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبالؔ کے اپنے دور میں اس کے خلاف فتوے بھی دیے گئے، اس کا مذاق بھی اڑایا گیا لیکن آج اسے ہمارے یہاں جو عزت اور شہرت حاصل ہے اس میں سیاست کا بھی دخل ہے۔ اقبالؔ نے نہ صرف پاکستان کا تصور واضح کیا بلکہ محمد علی جناح کو مسلمانوں کی قیادت کے منصب تک پہنچنے میں مدد دی۔ عاشق حسین بٹالوی نے اپنی معتبر کتاب ''اقبال کے آخری دو سال'' میں لکھا ہے کہ جب اقبالؔ بسترِ مرگ پر تھا تو جواہر لال نہرو اس کی عیادت کے لیے آئے اور باتوں باتوں میں کہا کہ علامہ صاحب! حق تو یہ تھا کہ مسلمانوں کی قیادت آپ کرتے مگر آپ تو جناح صاحب کے پیچھے چل پڑے؟ اقبالؔ جو لیٹا ہوا تھا اٹھ کر بیٹھ گیا اور نہرو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، نہیں، جناح صاحب ہی ہمارے اصل لیڈر ہیں۔ وہ مسلمانوں کی کشتی کے ناخدا ہیں اور میں ان کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں۔ چنانچہ اپنی عمر کے آخری دو سالوں

میں اقبالؔ پنجاب میں مسلم لیگ کا صدر بھی رہا اور قریب قریب یہی وہ زمانہ ہے جب اس نے جناح صاحب کو وہ مشہور خطوط لکھے جن کی بدولت ''ہندو مسلم اتحاد کا یہ سفیر'' ہندوستان کے بٹوارے کے لیے تیار ہوا۔ اس طرح پاکستان کی تحریک میں اقبالؔ کا ایک اٹل اور ناگزیر کردار ہے۔ پھر اس نے دنیائے اسلام میں انقلابِ کی بات کی، اسلامی نشاۃ الثانیہ (Islamic Rennaisance) کی بات کی۔

اقبالؔ کی شاعری نے ہندوستانی مسلمانوں کی بیداری میں اہم ترین کردار تو ادا کیا ہی تھا، ایران کے اسلامی انقلاب میں بھی اس کے افکار کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ایران کا جو پڑھا ہوا آدمی ہمارے یہاں آتا ہے وہ ہمارے اپنے دانشوروں کے مقابلے میں اقبالؔ کے لیے کہیں زیادہ احترام کا اظہار کرتا ہے۔ وہ نہ صرف اس کا زیادہ معترف ہوتا ہے بلکہ ہماری بہ نسبت اس سے شناسا بھی زیادہ ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ اس نے صرف اقبالؔ کا نام سن رکھا ہوتا ہے، اس نے اقبالؔ کو بغور پڑھا بھی ہوتا ہے۔ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اقبالؔ نے ایران کے اسلامی انقلاب میں اسی طرح کا کردار ادا کیا ہے جو انقلابِ فرانس میں روسو اور والتیر نے انجام دیا تھا۔ اگر اس انقلاب کا خمیر امام خمینی اور علی شریعتی کے خیالات سے اٹھا تھا تو اس میں اقبالؔ کا خونِ جگر بھی شامل تھا۔ گویا غالبؔ کے مقابلے میں اقبالؔ کی زیادہ پذیرائی کی وجہ فنی کم اور سیاسی زیادہ ہے۔ لیکن غالبؔ کے یہاں انسانیت کا جو واسطہ ہے، دردِ زندگی کا جو حوالہ ہے اور انسان کی زندگی کے نرم گرم کے ساتھ اس کا جو تعلق ہے وہ اپنی جگہ ایسا دائمی مقام رکھتا ہے کہ جب بھی وقت آئے گا غالبؔ کسی سے پیچھے نہیں رہے گا۔

یہاں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اہلِ علم وفن کے بارے میں ہمارا عام رویہ کیا ہے؟ ایک اقبالؔ کو چھوڑ کر ہم نے کس کی قدر کی ہے؟ غالبؔ کو تو ہم نے ہندوستان کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا ہے۔ ہمارے یہاں سائنس کے میدان میں ایک عبدالسلام پیدا ہو بھی گیا تو اس کی کیا قدر ہوئی؟ اس کی پاکستانیت سب کو بھول جاتی ہے اور صرف یہ تعصب باقی رہ جاتا ہے کہ وہ احمدی تھا۔ پاکستان کی قومی زندگی میں ایک شخص کو نوبل پرائز ملتا ہے اور وہ بھی سائنس کے میدان میں کہ جس میں ترقی کی ہمیں شدید خواہش بھی ہے اور ضرورت بھی مگر ہماری یونیورسٹیوں میں اسلام کے خودساختہ علمبردار اساتذہ اور طالب علم کہتے رہے کہ عبدالسلام پاکستان کی درسگاہوں

یں داخل تو ہو کر دکھائے، ہم اس کی ٹانگیں توڑ دیں گے۔ اس کے برعکس بھارت میں بھارتی سائنسدان عبدالکلام کو ملک کا صدر بنا دیا گیا ہے۔ ہم تو بے درد قسم کے مجاور ہیں جو پہلے اپنے اکابرین کو قتل کرتے اور پھر ان کا اچھا سا مزار بنا کر پوجتے ہیں۔ یہی کچھ ہم نے اپنے عہد کے شاعر فیض احمد فیضؔ کے ساتھ کیا۔ پہلے اسے برسوں تک سازش کے ایک مقدمے میں پابندِ سلاسل رکھا، جلاوطنی پر مجبور کیا اور اب ہر سال فیض میلہ منا رہے ہیں۔

عہدِ رواں کے صاحبِ طرز اور قد آور افسانہ نگار انتظار حسین نے کہا تھا خیال پیدا ہوتا ہے تو پھر مرتا نہیں۔ غالبؔ بھی ایک خیال ہے جو پیدا ہو چکا ہے۔ دیکھنا یہ ہے اب اس کا وارث کون ہوتا ہے، اسے کون آگے لے کر جاتا ہے؟ ہو سکتا ہے کل جب ایران اپنے موجودہ بحرانی اور ہیجانی دور سے نکلے تو اسے اقبالؔ کی طرح غالبؔ بھی نظر آنا شروع ہو جائے اور اس کا فارسی کلام اسی طرح محترم ہو جائے جیسے دیگر بڑے فارسی شعرا کا ہے۔ لیکن آج بھی ہم خود غالبؔ کے فارسی کلام سے اتنے واقف نہیں جتنے اہلِ ایران ہیں۔ ایران میں فارسی ادب کے اساتذہ اس کا اچھا خاصا ذکر کرتے ہیں۔ یہ بہت ہی بدقسمتی کی بات ہے کہ ہمارے یہاں فارسی کی تعلیم کمزور ہو گئی ہے اور یوں غالبؔ ہی نہیں اقبالؔ کا بیشتر کلام بھی ہمارے آج کے قارئین تک نہیں پہنچ پایا۔ دراصل ہم فی الحال کسی بات پر توجہ دینے کے موڈ ہی میں نہیں۔ جب بھی ہماری توجہ نفسانفسی سے نکل کر تہذیب و تمدن کی طرف آئے گی تو ہم چاہتے ہوئے بھی غالبؔ کو نظر انداز نہ کر پائیں گے اور اسے اپنا سمجھ کر اپنا لیں گے۔ ہمارے مقابلے میں ہندوستان غالبؔ کو زیادہ اپنا سمجھتا ہے۔ چونکہ غالبؔ کی قبر وہاں ہے شاید اسی لیے ہم سمجھتے ہیں کہ غالبؔ ہمارا نہیں۔ اسی طرح ہم سمجھتے ہیں کہ آگرے کا تاج محل ہمارا نہیں، جامع مسجد ہماری نہیں حالانکہ روایات تو اسی کی ہوتی ہیں جو اُن سے سیراب ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں تو موہنجوڈیرو سے سیراب ہونا بھی کفر میں شامل ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم پیدا ہی اس دن ہوئے تھے جب محمد بن قاسم نے دیبل پر حملہ کیا تھا، اس سے پہلے نہ ہماری کوئی تاریخ تھی، نہ دھرتی، نہ ثقافت، نہ زبان۔ جب یہ رویہ مٹے گا تو پھر غالبؔ جیسے لوگوں کو ایک اور نظر سے دیکھا جائے گا۔

غالبؔ زندگی کا شاعر ہے۔ وہ اس کے درد کو سمجھتا ہے اور اس کی طاقت کو بھی۔ اگر صرف درد کو سمجھ رہا ہوتا تو سر اٹھا کر نہ چلتا، بس دل کی دل میں لے کر مر جاتا۔ لیکن غالبؔ

نے ہمیشہ اپنے خیال کو بھی بلند رکھا اور اپنے سر کو بھی۔ اس کے یہاں درد وغم کے ساتھ ساتھ امید اور رجائیت کی جو کیفیت ملتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتا ہے کہ زندگی کے سامنے موت بہت حقیر ہے۔ زندگی کے بہاؤ میں وہی پتے، جو درختوں سے گرتے اور مٹی میں مل جاتے ہیں، بالآخر زمین کے اندر سے پھوٹنے والے نئے پتوں، نئے پھولوں اور نئے درختوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ غالب نے کہا تھا:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے میں نے یہ شعر بھی مصوّر کیا ہے اور خاک میں پنہاں ہو جانے والی صورتوں کو خاک کے اندر سے محبوب کی صورت میں اگتا ہوا اور اس کی اُنگلیوں کے اندر سے لالہ و گُل کی شکل میں نمایاں ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔ غالب زندگی کی جس وحدت اور تسلسل کا قایل ہے اُس کا یہ شعر اور میری یہ تصویر، دونوں اسی وحدت اور تسلسل کا بیان ہیں۔

(بشکریہ ''سویرا'')

کرن کرن اجالا

نثار ترابی (راولپنڈی)

عزیزم احمد رضا راجا نے "سورج" کے دو شمارے عطا کیے، حرف و فکر کے وسیلے سے اور صوری حوالے سے بھی پرچوں کا مجموعی معیار، مواد، ترتیب و پیش کش بھی کچھ ادبی جرائد کے نام سے سامنے آنے والی "بھرمار" کے مقابلے میں لاریب ابتدائی صف میں جگہ پانے والے چند موقر ادبی شماروں میں شامل ہونے کا حق دار ٹھہرتا ہے اور اس پر پرچے کے مدیر محترم اور جملہ اعزازی مدیران و اراکین، سب قابلِ مبارک باد ہیں۔

چند غیر مطبوعہ نثری و شعری تحریریں بہ غرضِ اشاعت ارسالِ خدمت ہیں۔ جیسے مناسب خیال فرمائیں۔

ناصر شہزاد (اوکاڑہ)

ڈیر تسلیم احمد تصور۔ السلام علیکم۔ شاد باد و بامراد

آپ کا سورج (سورج بنسی) پرچہ سورج۔ اب کے بھی انتہائی آب و تاب سے نمودار ہوا ہے۔ ہندوؤں میں دو بنس۔ "سورج بنس" اور چندر بنس" انتہائی ممتاز اور طرب نواز، کیفیتوں کے حامل رہے ہیں۔ انتہائی بہادر اور اپنے آپ پر قادر لوگ، ان بنسوں کے پریوگ میں یوگ رہے۔ آپ کا پرچہ بھی مجھے سورج بنس سے متعلق لگتا ہے۔ بے پناہ جاہ و جلال اور کمال، اس پرچہ کے ابدی جمال میں شامل ہے۔ ڈاکٹر انجم رحمانی نے "لاہور" پر بلند یادور اور ثمر آور مضمون لکھا ہے۔ اپنی تحقیق اور تصدیق کی اعلیٰ، شاہراہوں اور بارگاہوں سے گزرتے ہوئے لاہور سے گزرنے والے اُن سارے ادوار کو اپنے مضمون میں تابدار کر دیا ہے۔ جو کبھی لاہور کی زندگی اور تابندگی کا حصہ اور قصہ رہے۔ انتہائی خوشگوار و مشکبار ہے یہ مضمون —— محمد سعید شیخ کا افسانہ "پنجرہ"، خوبصورت افسانہ ہے اور ہمیں اس آوادی کا اتحادی بنا رہا ہے۔ جس کی آبادی کے لیے ہم عہد

آفرینش سے فریادی ہیں ـــــ رشید امجد کا افسانہ ''بے شناخت''، اپنی ساخت، کا بے پناہ افسانہ ہے۔ افسانہ کے آخری جملہ میں یہ کہنا کہ وہ کیسا بیٹا ہے جو اپنی ماں کو بھی نہیں ''پہچان سکتا'' بڑے گیان اور نروانی شخص کا پتہ مہیا کرتا ہے، یہاں آگہی کی وہ ساری بادشاہی در آئی ہے۔ جو اعلیٰ فنکاروں کو کہیں اونچے درباروں سے ملتی ہے، اُن کے لیے مجید امجد کا یہ شعر:

سواد نور سے دیکھیں تو تب سراغ ملے
کہ کس مقام کی ظلمت ہے، کس جہاں کے لیے

عادل ندیم کا افسانہ ''بعد چہارم'' علامتی اور استعاراتی ہے۔ اس کی بنت میں افسانہ نگار نے نہایت چابکدستی اور فن پرستی کو روا رکھا ہے۔ اور ہمارے سامنے وہ سب کچھ پیش کر دیا ہے۔ جس کے ڈانڈے کم و بیش ہمارے ملک میں ہمہ وقت ہمارے خویش ہیں۔ بشریٰ رحمٰن کا افسانہ ''کوری کنیا'' کافی دھنیا افسانہ ہے۔ سچائی اور موجودہ وقت کی انتہائی۔ ہیبت سرائی کی نقاب کشائی کرتا ہوا۔ ایسا ہوتا تو عہد آفرینش سے ہی آیا ہے۔ مگر بلند بینش پیرائے میں وہ تمام سرمائے اکٹھے کر دیئے گئے ہیں، جو غریبی کو کچھ تادیبی ضرورتوں اور صورتوں کے حوالے کر رہے ہیں۔ اختر حیات کی نذر میں اپنا یہ شعر کر رہا ہوں:

خموشی سے کراہیں ـــ شانت جنگل
دھوئیں میں تلملائے تیز گاڑی

عطیہ سیّد کا افسانہ ''موج خُوں'' ذہنی خلفشار اور انتشار کی ایک تکرار ہے۔ جسے انھوں نے عمدگی سے تحریر کیا۔ جبلت کی بدخوہی اور نرموہی کیفیتوں کی شانتا اس افسانہ میں اُس سہانتا کو کاٹ رہی ہے۔ جو بڑے افسانوں کی داستانوں کا حصہ ہوتی ہے، ازلی جرم اور اُس کے ارتکاب کے، صد باب، استہاب اس افسانے کا قصہ اور حصہ ہیں۔ پروفیسر جلیل نقوی، سعید عاصم اور ادیب سہیل کے مضامین اپنی اپنی جگہ پُرفسوں ہیں۔ ریاض خیر آبادی ـــ اپنی بیگم کی زبانی، امین راحت چغتائی کا نیمک جادہ اور چندر یک ارادہ مضمون ہے۔ جس پر الفاظ کا مبادہ بہت سادہ اور پاک پبادہ ہے۔

اشفاق احمد کا مضمون ''قصہ داستان گو کا'' پڑھا اور پتہ چلا کہ اتنے بڑے ادیب کو بھی اپنے آپ کو اسٹیبلشڈ کرنے کے لیے کتنے کتنے بڑے کشٹ جھیلنے پڑے، مضمون خوب بھی ہے اور مسعود بھی، غزلیہ حصہ میں، جلیل عالی، انور شعور اور عزیز کامل نے اچھے اچھے شعر نکالے ہیں اپنی غزلیات میں، اسلم کولسری کی پہلی دو غزلیں، شعری بیان اور دھیان کی پہچان عطا کر رہی ہیں تیسری اور آخری غزل اُسی نہج میں نشان زد ہو رہی ہے۔ جس کے طغیان میں ابھی تک ہمارے ۸۰ فیصد غزل گو بہہ رہے ہیں۔ نظموں میں سعود عثمانی کی نظم بڑی رواں دواں اور نکہت فشاں

بانو قدسیہ، لاہور

28.4.05

محترم تسلیم احمد تصور صاحب سلامت رہیں خوش رہیں

السلام علیکم

جس محبت سے آپ نے اشفاق صاحب کی یاد
کو "سورج" میں سنبھالا ہے، اس کا نہ تو شکریہ
ادا کیا جا سکتا ہے نہ تعریف ــــ لوگوں کی
کراں بے پناہ عقیدت نے میرا بوجھ بڑی
نعمت سے ہلکا کر دیا ہے۔ جہاں اتنی
محبت ہو وہاں دکھ تو ہوتا ہے بے بسی بھی
ہوتی ہے لیکن خود ترسی باقی نہیں رہتی
اللہ آپ کو اس کارِ خیر کی جزا دے

خیر اندیش

بانو قدسیہ

بیدار سرمدی - لاہور

برادر عزیز تصور جی

پرانے دور میں راجے نہ جانے خوش ہو کر کیا کچھ عطا کرتے ہوں گے۔ آج کے راجا، ظفر علی راجا ''سورج'' عطا کرتے ہیں۔ اوپر والے سورج کی طرح یہ زمین والا سورج بھی کرنوں کی دولت سے مالا مال ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ اپنے سورج کی طرح اس سورج کا بھرم بھی قائم رکھے۔

ہے۔

ایس معین الحق - کوپے۔ سوئٹزرلینڈ

کچھ عرصہ قبل میں جب اسلام آباد میں تھا۔ اتفاقاً ایک روز بازار سے میں نے ''اردو ڈائجسٹ'' خریدا۔ اس میں آپ کے ''سورج'' پر تبصرہ پڑھ کر۔ میں نے اسے آپ سے فوراً منگوالیا تھا (شاید آپ کو یاد ہو)۔ اور یقین جانیے اپریل، مئی، جون کا شمارہ دیکھ کر تو واقعی میری آنکھوں میں چکا چوند آگئی۔ حیرت ہوئی کہ اس قدر دل نگار شے سے میں اب تک محروم کیسے رہا۔ دراصل یہ لاہور میں نہ ہونے کی ہی وجہ ہے۔ کس قدر ستم کی بات ہے۔ میرا اپنا تعلق بھی لاہور ہی سے ہے۔ مگر قدرت نے جانے کیوں مجھے میرے اپنے شہر سے اس قدر دور کر رکھا ہے، بہر کیف۔ اس خوبصورت شمارے کو پڑھ کر میں کس کس کی تعریف کروں میں نے ڈاکٹر انجم رحمانی کا تحریر کردہ لاہور کے متعلق بے حد معلومات افزا مضمون، بار بار پڑھا، ڈاکٹر صاحب نے واقعی کمال جستجو اور بڑی تحقیق سے اس مضمون کو رقم کیا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے۔ لاہور کے متعلق ابھی اور بہت کچھ لکھنا باقی تھا۔ شاید۔ کہ انھیں اگر فرصت ملے، تو وہ لاہور کے متعلق مزید لکھیں۔

اس سلسلے میں مجھے یاد پڑتا ہے۔ کہ طفیل مرحوم کے ماہنامہ ''نقوش'' کے کسی شمارے میں جناب حکیم احمد شجاع صاحب کا رقم کردہ مضمون بعنوان ''بھاٹی دروازہ ــــ لاہور کا چیلسی'' نہایت ہی دل چسپ اور معلومات آفرین شائع ہوا تھا۔ یہ غالباً ۱۹۶۰ء-۱۹۷۰ء کے کسی شمارے میں شائع ہوا تھا۔ مجھے یقین ہے۔ آپ طفیل مرحوم کے ''نقوش'' کے یہ فائلیں بآسانی حاصل کر سکتے ہیں۔ تو یہ مضمون دستیاب ہوسکتا ہے۔ معاف فرمائیں۔ میری اپنی عمر ۸۰ سے تجاوز کر چکی ہے۔ اور اس عمر میں یادداشت کی چولیں کھسک جایا کرتی ہیں۔ ورنہ میں آپ کو اس کی مکمل نشاندہی کر دیتا۔ یہ بیش قدر مضمون آپ ''سورج'' کے کسی آئندہ شمارے میں شامل کرسکیں تو کیا ہی بات ہے۔

محمد شفیع بلوچ - جھنگ

محترمی تسلیم احمد تصور صاحب! سلام مسنون امید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے۔

سورج کا شمارہ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۴ء دیکھنے اور تھوڑا سا پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اتنا شاندار رسالہ نکالنے پر مبارک باد قبول فرمائیں۔ صوری و معنوی اعتبار سے انتہائی مؤقر جریدہ ہے جو یقیناً آپ کے علمی وقار کی علامت ہے۔ سردست ایک غیر مطبوعہ مضمون ''فلاطینوس'' ارسال ہے۔ گر قبول افتد...... . تمام اراکین ادارہ کو خلوص بھرا سلام

محمد ظہیر - لاہور

محترمی تسلیم احمد تصور صاحب

کل رات آپ سے گفتگو کے بعد جناب عادل ندیم سے بات ہوئی۔ وہ مجھ پر کرم کرتے رہتے ہیں۔ اور آپ کا ذکر اکثر رہتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ جو کچھ آپ کر رہے ہیں وہ بڑا مشکل کام ہے اور بڑا حوصلہ طلب ہے۔ ہم لوگ تو دو چار لفظ لکھ دیتے ہیں اور آپ ان کا تانا بانا بنتے رہتے ہیں۔ پھر بھی معیار کو قائم رکھنا کارے دارد۔ میں نے پچھلا شمارہ شاہد واسطی سے لے کر پڑھا تھا۔ وہ بھی اپنی تمام تر مجبوری کے باوجود ادبی سرگرمیوں سے آگاہ رکھتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ ان کو صحت کاملہ دے۔ آپ کے لیے دعا گو ہوں کہ جو بارِ گراں آپ نے اٹھایا ہوا ہے اس سے بخوبی عہدہ برآ ہوں۔ دو کتابیں اور غزل بھیج رہا ہوں ان سے وہی سلوک روا رکھیں جو سکندر نے پورس کے ساتھ کیا تھا۔ فون پر رابطہ رہے گا۔

مسعود اشعر - لاہور

جناب تسلیم احمد تصور صاحب السلام علیکم

بھائی میں افسانہ تو پیش نہیں کر سکتا ان دنوں کوئی افسانہ لکھا ہی نہیں۔ یہ ایک مضمون جو پنجابی کانگریس کے اجلاس میں پڑھا تھا اگر پسند آجائے تو چھاپ دیں۔

آپ نے واقعی ''سورج'' کو خوب روشن اور بہت ہی تابناک بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر کیول دھیر - لدھیانہ

پیارے تسلیم تصور صاحب - تسلیمات!

جریدہ دلچسپ ہے۔ جاندار ہے اور اس میں سورج کی بھرپور روشن گرمی ہے۔ پرماتما آپ کو کامرانی، کامیابی اور حوصلہ عطا فرمائیں کہ آپ سے دیوانوں کی اردو زبان و ادب کو بہت ضرورت ہے۔

محبتوں کے ساتھ

ادیب سہیل - کراچی

برادرم عزیز تسلیم احمد تصور

حسبِ وعدہ حضرت مضطر کے سلسلے کا مضمون اور ایک نظم عمارت حاضر ہے رسید سے مطلع کیجیے گا۔
آپ نے "سورج" کو حقیقی معنوں میں سورج بنا دیا ہے۔ اتنے تازہ مواد اس میں شامل ہیں
کہ کس کو پہلے پڑھوں کس کو نہیں سب ایک پر ایک موضوع کے اعتبار سے۔
اللہ کرے ذوقِ ترتیب و رشحاتِ قلم اور زیادہ۔

محمد فیروز شاہ - میانوالی

برادرم تسلیم احمد تصور جی!
محبتیں - اللہ کرے آپ شاداب و شادمان ہوں۔

"سورج" غالب میموریل ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام آپ کے خوابوں کی آئینہ داری سے ابتدا کرتا ہوا آیا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ عصر جدید کے ہمسفر ہو کر غالبیات کی تر و تازگی کا احیا ہی اتنا بڑا کام ہے کہ فقط اسے ہی سرانجام دئے لینا کارنامہ ہوگا۔ غالب پر دیگر تمام شعبوں میں جاندار ارادوں کے ساتھ ساتھ سہ ماہی مجلّہ خصوصی کی اشاعت کا پروگرام —— پھر "سورج" کی باقاعدگی اور معیار اور وقار کو برقرار رکھنے کا عزم —— یہ سب کیسے ہو سکے گا۔ تب مجھے افتخار عارف یاد آ جاتا ہے:

آسمانوں پر نظر کر انجم و مہتاب دیکھ
صبح کی بنیاد رکھنی ہے تو پہلے خواب دیکھ

خواب کی اپنی ایک آب و تاب ہوتی ہے۔ تصور کا اپنا ایک حسن ہے۔ خواب دیکھنے والی آنکھ اور خیال کا جمال تابندہ رکھنے والا ذہن زندہ رہے تو صبح ضرور طلوع ہوتی ہے اور عالمگیر و عالم آرا روشنی کی وراثت لے کر "سورج" زمانے بھر کے لیے رہنمائی کی بشارت لے کر آتا ہے —— اس تیقن میں میری تمنا اور دعا دونوں کا رنگ شامل ہے۔ گوشۂ اشفاق احمد تقاضائے وقت کی تکمیل ہے۔ میں سوچتا ہوں حفیظ تائب کے حوالے سے بھی ادبی جرائد میں اجالے تقسیم کرنے کا عمل جاری ہونا چاہیے تھا —— انھوں نے نعت کو ادبیاتِ عصر میں اپنی شناخت کا مرکزہ بنا لیا اور قرطاس و قلم کی دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ زندگی محبتوں کی پائندگی سے وابستہ ہو کر جاوداں تابندگی بن جاتی ہے۔ لاریب عصرِ موجود کی نعتیہ شاعری میں ان کا نام دوام حاصل کر چکا ہے۔ گوشے تو کیا حفیظ تائب پر تو کتابیں لکھی جانی چاہییں کہ ہمارے ادبی منظر نامے میں کسی ایک صنفِ ادب کے ساتھ اس طرح وابستہ ہو کر زندگی کرنا کہ عمر بھر ایک لج پال اور والہانہ وابستگی اور عقیدتوں کی مسلک مروارید میں منسلک ہو رہنا —— اب بہت کم کم نظر آتا ہے —— اب تو مفادات کی چک بھریاں ہیں۔ ہوا کے رخ کو پہچان کر اپنی پہچان بدل لینا کامیابی کی کلید سمجھی جاتی ہے۔ ایسے میں وفا کے چراغ روشن کرنا —— اور وفا بھی اس کے ساتھ جس کی غلامی لوح و قلم کی شہنامی اور جہانوں اور زمانوں اور آسمانوں تک میں سربلندی اور

سرفرازی کی نوید عطا کرتی ہے ـــــ یہ عطیۂ خداوندی ہے جو مقربین خاص پر ہی ہوتا ہے ـــــ اب ہمیں حفیظ تائب کے روشن کردہ چراغوں کی لَو سے آنے والی نسلوں کی آنکھوں میں وہ ضو بھرنی ہے کہ جو بینائی کو لوک دانائی اور تخلیقی توانائی سے بھر دیا کرتی ہے۔ سو میں سمجھتا ہوں ہر ادبی جریدہ کا یہ فریضہ ہے کہ حفیظ تائب کی یاد میں ایک شہر لوح قرطاس پر آباد کرے کہ وفا کا قرینہ یہی ہے اور اہلِ ادب سدا اہلِ وفا ہی میں سے ہوا کرتے ہیں ـــــ!

ڈاکٹر انجم رحمانی کا تحقیقی مقالہ ''لاہور کے تاریخی و علمی پہلو'' تاریخ اور تہذیب کی خوشبو سے مملو ہے۔ ایسے جاندار مضامین جرائد کو کتاب جیسی پائندہ اہمیت کی دستاویز بنا دیا کرتے ہیں۔ لاہور کی تاریخی اور ثقافتی اور علمی و ادبی حیثیت پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ میرے لیے تو لاہور اس لیے بھی بے حد اہم ہے کہ جو علی ہجویریؒ کی نگری ہے آنے والے زمانے میں اس شہر خوبی کی تاریخ پر کام کرنے والے محققین کے لیے یہ مقالہ چراغِ راہ کا کام دے گا۔ میں اسے ہر شہر اور ہر ادارے کی لائبریری کے لیے Recommend کرتا ہوں ـــــ!

تخلیقی سطح پر ''سورج'' کی عطائیں قابلِ ذکر ہیں، ناصر زیدی نے ''سورج سے توانائی کی طلب'' میں تخلیقی ادب کا کرب و طرب اس سلیقے سے نمایاں کیا ہے کہ پڑھنے والے کی آنکھوں میں روشنیوں کا ایک جہان اتر آتا ہے اور روشنی تو بجائے خود توانائی بخش قوت ہے۔ اسی طرح زاہد منیر عامر کی نظم ''محبت پھول ہے لیکن ـــــ'' محبتوں کی شاداب وادیوں میں گنگناتے پھرتے ان آوارہ بادلوں کی جولانیوں کی کہانیاں بیان کرتی ہے۔ جن کی آوارگی میں منزلوں کی روشنیوں کے سراغ زندہ رہتے ہیں۔ اس میں کسے شک ہے کہ محبت فاتح عالم طاقت ہے ـــــ میں سمجھتا ہوں اس جذبے کو زوال نہیں ـــ محبت وہ پھول سہی جسے اک دن بکھرنا ہے مگر بکھر کر بھی اس گلِ سدا بہار کی خوشبو دلوں اور آنکھوں اور خوابوں میں زندہ رہتی ہے۔ لوک داستانوں میں رس بھرتی ہے۔ گیتوں اور افسانوں کے رنگ زندہ کرتی ہے ـــــ اس کے بکھراؤ میں بھی ایک وقار ہے۔ نکھار ہے یہ تو وہ جذبہ جاوداں ہے جو موت کو بھی مات دے دیا کرتا ہے۔ میں اپنے اشعار سنانے سے عموماً گریز کرتا ہوں مگر اب بات آ ہی گئی ہے تو لکھے دیتا ہوں۔

محبت ایک اجالا ہے محبت ایک خوشبو ہے
نظر میں نور، دل میں پھول بن کر زندہ رہتی ہے!

رنگین تصاویر سے مزین کر کے آپ نے جریدے کے صوری حسن میں اضافہ کر دیا یہ روایت ایک تسلسل کے ساتھ تمام لکھاریوں کو رفاقت دیتی رہے تو ''سورج'' کا جمال اوجِ کمال تک پہنچنے میں کیا دیر لگائے گا؟

●●●●●●●●●●●●●●●●

ممتاز افسانہ نگار و ناول نگار

کی مایہ ناز تصانیف
جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں

1. **تلافی** — افسانے
2. **تسخیر** — افسانے
3. **کفارہ** — افسانے
4. **تمنا بے تاب** — سفرنامہ ارض حجاز
5. **اقبال جرم** — ناول
6. **چھوٹی سی بات** — افسانے
7. **ایک اور دریا** — ناول
8. **رنگ جہاں اور** — ناول
9. **پتھر بولتے ہیں** — افسانے
10. **زمین کا دکھ** — افسانے
11. **ڈی سی نامہ** — روئداد ذات

یہ کتابیں سنگ میل پبلشرز ۔ لوئر مال سے دستیاب ہیں۔